قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلّہ

مخزن

جلد۲، شمارہ ۲، ۲۰۰۲ء

ناشر: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

فون نمبر: ۹۲۰۱۰۰۷_فیکس: ۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qal@brain.net.pk

ویب سائٹ: www.qal.fws1.com

کمپوزنگ: محمد اکرام الحق

طابع: گوہر سنز، یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

صفحات: ۱۶۰

قیمت: -/100 روپے

جملہ حقوق محفوظ

ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو دو نسخے روانہ کیے جائیں۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور سے کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔

مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

انتظار حسین

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)

محمد ہارون عثمانی (معاون امور دفتری و ادبی)

ترتیب

اداریہ: ۵

اردو ادب اور اکیسویں صدی:

۱۔ کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے عہد میں اردو کا مستقبل — ڈاکٹر سلیم اختر — ۷

۲۔ اردو زبان کے مسائل اور اکیسویں صدی — شہزاد احمد — ۱۰

۳۔ ادب، ادبی تحقیق اور اکیسویں صدی — ڈاکٹر محمد یوسف خشک — ۱۴

ادبیات:

۱۔ اردو کا سجاؤ اور ذائقہ — ڈاکٹر داؤد رہبر — ۲۰

۲۔ زندگی، ادب اور صنفی حساسیت — افضل توصیف — ۲۶

۳۔ بھرتری ہری کی شاعری کے اردو تراجم — ڈاکٹر اختر شمار — ۳۶

شخصیات و سوانح:

۱۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمی الازہری — محمد حمزہ فاروقی — ۵۱

۲۔ عشق کتاب — اسلم کمال — ۵۴

اقبالیات:

علامہ اقبال کا تصور ریاست — ڈاکٹر وحید قریشی — ۷۷

کتابے و گوشہء چمنے:

۱۔ ارمغان کشمیر — ڈاکٹر ظہور الدین احمد — ۸۴

۲۔ تاریخ فرشتہ میں معاشرتی جھلکیاں — ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی — ۹۵

۳۔ ادارۂ یادگار غالب کراچی کی چند نئی مطبوعات — محمد سعید — ۱۱۱

مختصر تبصرے:

۱۔ کتابی سلسلہ دنیا زاد۔ فلسطین نمبر	ڈاکٹر انور سدید	۱۲۸
۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر (کوائف/کتابیات/اشاریہ)	محمد ہارون عثمانی	۱۳۰
۳۔ ادب کہانی ۱۹۹۷ء	جاوید اختر بھٹی	۱۳۲
۴۔ مجلہ صوفی مسلم صحافت کے آئینے میں	سہیل منصور	۱۳۴
۵۔ اکادمی ادبیات کی اردو کتابیں اور رسائل	ڈاکٹر وحید قریشی	۱۳۵

کھوئے ہوؤں کی جستجو:

۱۔ میں ریڈیو کے لیے کس طرح لکھتا ہوں	کنہیالال کپور	۱۳۷
۲۔ جنتری نئے سال کی	ابن انشا	۱۴۱

قائداعظم لائبریری:

۱۔ قائداعظم لائبریری کی عمارت	محمد عباس چغتائی	۱۴۴
۲۔ قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی تقاریب	شہناز مزمل	۱۵۶
۳۔ قائداعظم لائبریری میں موصول ہونے والے اردو رسائل	خلیل احمد چیمہ	۱۵۸

اداریہ

''مخزن'' قائداعظم لائبریری کا ششماہی پرچہ ہے۔ ۲۰۰۱ء جو قائداعظم کا سال تھا اس میں ہم نے قائداعظم کے بارے میں ادیبوں کی تحریروں کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔ ۲۰۰۲ء سال اقبال تھا جس کی مناسبت سے پچھلے پرچے میں اقبال پر ایک مضمون شائع کیا گیا۔ موجودہ شمارہ اس سال کا دوسرا اور آخری پرچہ ہے۔ ملک میں جمہوریت کی بحالی کا بہت چرچا رہا ہے اسی حوالے سے جلد دوم کے دوسرے پرچے میں ہم نے اقبال کے حوالے سے جمہوریت کے تصورات کے بارے میں چند باتیں درج کی ہیں۔ اگلا سال حقوق نسواں، مادر ملت اور اردو کے حوالے سے ہوگا جس میں ایک ایک مضمون ان مسائل کے بارے میں بھی پیش کیا جائے گا۔ اس پرچے میں ہم نے فنون لطیفہ کو بھی شامل کرلیا ہے۔ ''عشق کتاب'' سے اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ انشاءاللہ اگلے سال اس حوالے سے بعض مصوروں اور دیگر فنون لطیفہ کے سلسلے میں گفتگو کی جائے گی۔

اس پرچے کا ایک خاص سیکشن ۲۱ویں صدی کے حوالے سے ہے۔ اگلے برس ہم خواتین ادیبوں کے بارے میں بعض چیزیں پیش کریں گے تاکہ حقوق نسواں کے حوالے سے ادبی نقطہ نظر سے بعض باتیں پیش کی جاسکیں۔

مدیر

کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے عہد میں اردو کا مستقبل

ڈاکٹر سلیم اختر

صاحبو! کمال کی بات ہے کہ صرف مملکت خداداد پاکستان ہی میں ہمیشہ سے اردو زبان کا مستقبل اندیشوں کے بھنور میں گھرا رہا ہے، عہد غلامی میں کبھی بھی یہ احساس نہ ہوا کہ ہماری زبان کو خطرات درپیش ہیں اور اس کا مستقبل مخدوش ہے۔ حالانکہ صورت حال برعکس ہونی چاہیے تھی۔ مولوی عبدالحق کے خیال میں آزادی اردو سے مشروط تھی جبکہ قائداعظم نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔ پھر اپنے وطن میں اردو کے بے وطن ہونے کا احساس کیوں؟ زبان یگانگت، اخوت، محبت اور ابلاغ کا باعث بنتی ہے مگر ہمارے ہاں صوبائیت نے حالات کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ اس امر کو فراموش کر کے کہ زبان عوام کے لیے ہوتی ہے، عوام زبان کے لیے ہوتے ہیں۔ ایک کا وجود دوسرے کے لیے ناگزیر، لہٰذا اپنی بقا کے لیے دونوں ہی لازم و ملزوم!

میں بڑے ملکوں کی زبانوں کی بات نہیں کرتا کیا آپ نے کوریا، ویت نام، فن لینڈ، ڈنمارک، تنزانیہ، گویٹے مالا جیسے چھوٹے ممالک کے بارے میں کبھی یہ سنا کہ ان یا ان جیسے متعدد چھوٹے، پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک نے اپنے ہی ملک میں اپنی ہی زبان کو اس کا جائز حق دینے کے برعکس اسے غریب الدیار قرار دے دیا ہو؟

اہل علم اردو کی ابتدا، نشوونما اور ترقی کی داستان سے بخوبی آگاہ ہیں اس لیے اس کے اعادہ سے بچتے ہوئے صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ برصغیر کے مخصوص تمدنی حالات میں اردو کے بوٹے کی عربی، فارسی، ترکی اور دیگر زبانوں نے آبیاری کی، صدیوں پر محیط تخلیق کاروں کی مساعی نے اسے یوں رتبۂ اعتبار بخشا کہ زبانوں کی برادری میں سرفراز ہوئی۔ اردو واحد ایسی زبان ہے جو ہر زبان کے تلفظ کو بعینہٖ ادا کرنے والے حروف کی حامل ہے۔ یونیسکو کے اعداد و شمار کی رو سے دنیا کی یہ تیسری بڑی زبان بدیشی دلہن کی باندی بنادی گئی ہے۔ عہد غلامی میں اردو مسلم تشخص کا باعث تھی، مغل تہذیب کی اس عطا پر ہم فخر کرتے تھے۔ تصور پاکستان کے خالق علامہ اقبال نے ۱۹۳۶ء میں منعقد ہونے والی اردو کانفرنس میں خرابی صحت کے باعث شرکت سے معذوری کی بابت ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مولوی عبدالحق کو لکھا:

''اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے''۔

لسانی عصبیت تو آج بھی ہے اور دینی عصبیت سے کسی طرح سے بھی کم نہیں لیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ اصل اہداف کو چھوڑ کر لسانی عصبیت کا ہدف اب اردو ہے۔

بحیثیت مفکر علامہ اقبال کے مثالی تصورات میں سے ایک یہ بھی تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

لیکن اپنا عالم یہ ہے کہ ہم تو راوی سے لے کر تا بخاک کراچی بھی ایک نہیں ہو سکے۔

خواتین وحضرات! خاصہ رونا دھونا ہو چکا۔ اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف یعنی کمپیوٹر اور آئی ٹی کے عہد میں اردو کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟

غالباً مضمون کی تمہید غیر متعلق سی محسوس ہوئی ہوگی لیکن یہ اس لیے ضروری تھی کہ اردو کا مستقبل نہ تو کمپیوٹر سے وابستہ ہے اور نہ ہی انفارمیشن ٹیکنالوجی سے مشروط، اس امر کے باوجود کہ کمپیوٹر نصاب میں شامل ہو چکا ہے اور دفاتر بلکہ گھروں میں اب اس کا استعمال عام ہے۔ جہاں تک کمپیوٹر کے اردو زبان کی ترقی میں فعال کردار کا تعلق ہے تو اس کی افادیت میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ بالخصوص تحریر وطباعت اور نشر واشاعت کے سلسلے میں تو کمپیوٹر اساسی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ چند برس پیشتر کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اردو دنیا سے کاتب حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا، اخبارات اور جرائد کی ترتیب وطباعت کمپیوٹر کے ذریعے سے ہوگی۔ محقق کمپیوٹر کی مدد سے دنیا بھر کی لائبریریوں سے استفادہ کر سکے گا اور کتاب کی جگہ C.D لے لے گی۔ یورپ میں اب کیسٹ بکس اور کیسٹ میگزین ہیں۔ معروف شعرا کے کلام کی کیسٹس ان کی زبان میں دستیاب ہیں، صداکاروں کی آواز میں نثری تصانیف، قدیم تاریخ، اساطیر، علم الانسان جیسے اہم تحقیقی موضوعات پر خصوصی طور سے تیار کردہ C.D ۔۔۔ سو اب دنیا بھر میں طباعت اور نشر واشاعت کے روایتی اور مروج طریقے متروک قرار پا جانے کو ہیں۔ اسے اس مثال سے سمجھیے غالباً دو تین برس پہلے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا شائع کرنے والے ادارے نے یہ اعلان کیا کہ اب انسائیکلوپیڈیا کتابی صورت میں طبع نہ ہوگی بلکہ اس کی C.D فروخت ہوگی۔ اگر پانچ سات سو روپے میں انسائیکلوپیڈیا کی C.D مل جائے تو ۲۰ ہزار میں اتنی جلدوں کی خرید کی کیا ضرورت ہے جن کو سنبھالنے کے لیے جداگانہ الماری کی ضرورت ہو۔ ہم کتاب کی جس ہیئت سے آشنا ہیں ہمیں اس کی جگہ C.D کا عادی بننے کے لیے ابھی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لینا چاہیے۔ اب یہ الگ بات کہ یوں کتاب سے وابستہ جمالیات کا خون ہو جائے گا۔

دیوان غالب کی جگہ C.D. of Ghalib ۔ میرا ذہن اسے قبول نہیں کرتا کہ لاکھ کارآمد ہونے کے باوجود یہ مرقع چغتائی کا نعم البدل نہیں ہو سکتی! انیسویں صدی میں دبیز خاکی کاغذ پر، ناقص کتابت میں، بھدے انداز سے مطبوعہ کتب کمیاب ونایاب ہونے کی بنا پر اب Collecter's Items ہیں آپ انہیں کمپیوٹر میں فیڈ کر دیں تو ان کی قدامت اور ساتھ ہی اہمیت ختم ہو جائے گی۔

کتاب، مواد، معلومات یا کوائف کی تلاش میں جو ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں ان سے ہر محقق آگاہ ہے۔ انٹرنیٹ پر سب کچھ دستیاب ہونے کی سہولت سے وقت کی بچت تو ہوگی مگر لذت جستجو کی قیمت پر!

زبان، لفظ، نشر واشاعت، کتاب اور طباعت ۔۔۔۔ ان سب کا اب ٹیکنالوجی سے مفر ممکن نہیں، ٹیکنالوجی نے کس تیز رفتاری سے انداز زیست تبدیل کیا، اس کی مثال میں ہمارا ہر گھر پیش کیا جا سکتا ہے۔ سوئی گیس آئی تو باورچی خانہ سے چولہا، لکڑیاں، اپلے، کوئلے، راکھ اور پھونکنی غائب ہوگئی یہی نہیں بلکہ ان اشیاء سے وابستہ تخلیقی تلازمات، جیسے سلگتی گیلی لکڑیاں، کڑوا کسیلا دھواں، جلتے بجھتے انگارے، راکھ کے ڈھیر میں دبی چنگاریاں وغیرہ بھی زندہ نہ رہے۔ کچن مجلس آئے تو مصالحہ پیسنے کا سازوسامان متروک قرار پایا یوں کہ اب کونڈی ڈنڈا اور چنگیریں ڈرائنگ رومز میں سجاوٹ کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔ گزشتہ ربع صدی میں تعمیر ہونے والے ہر مکان میں ٹی وی لاؤنج ضرور ہوتا ہے، لائبریری ضروری نہیں!

اگر چہ زبان، کتاب اور طباعت پر کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے اثرات اتنے انقلابی تو نہیں پھر بھی یہ اثرات وقت گزرنے کے ساتھ نمایاں سے نمایاں تر ہو رہے ہیں۔ تاہم ان کے استعمال میں شعور اور احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے یعنی یہ طے کرنا ہوگا کہ ٹیکنالوجی ہماری باندی ہے کہ ہم ٹیکنالوجی کے غلام!

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو لسانی تحقیقات سے وابستہ امور میں کمپیوٹر سے مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً جدید انداز پر لغت کی ترتیب و تدوین، الفاظ شماری، لفظ کے ماخذ تک رسائی، اردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کی گنتی، الفاظ کی صوتی شناخت جیسے اہم لسانی مسائل میں کمپیوٹر بطور خاص کارآمد ثابت ہو سکتا ہے کہ جدید لسانی تحقیق ان ہی سے عبارت ہے۔

ہمارے ہاں سائنٹیفک طریقہ پر مبنی اشاریہ سازی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب کیونکہ کتابوں کی کمپوزنگ کمپیوٹر سے ہو رہی ہے اس لیے اشاریہ سازی آسان ہو چکی ہے۔ اہل علم کو یہ بتانے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ علمی، ادبی، سائنسی اور تحقیقی کتب میں اشاریہ کتنا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ سب کہہ سن کر بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ٹیکنالوجی محض معاون و مددگار کا کردار ادا کر سکتی ہے۔ کمپیوٹر شعر کمپوز کر سکتا ہے شعر کہہ نہیں سکتا۔ کتب خانہ میں کتابوں کا ریکارڈ محفوظ کر سکتا ہے کتاب خواں اور صاحب کتاب نہیں بن سکتا اسی لیے اردو زبان کا مستقبل کمپیوٹر اور آئی ٹی سے وابستہ نہیں، ہم لوگوں سے مشروط ہے!

کھمبیوں کی طرح اگے ہوئے انگلش میڈیم سکولوں، تہذیب ناشناس نو دولتیہ طبقہ، گھروں میں انگریزی بولنے والے اونچی نسل کے امراء اور گرین کارڈ کا خواب دیکھنے والے پاکستانیوں کی موجودگی میں کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے؟

معافی چاہتا ہوں کہ یہ کہہ کر میں پنڈورا کا بکس کھول رہا ہوں لیکن کیا کروں حالات نے مجھے قنوطی بنا دیا ہے!

اقتباس

سرسید احمد خاں اپنے زمانہ میں ایک صدی آگے کی بات کرتے تھے اور آج جب کہ ہم ۲۱ ویں صدی میں قدم رکھ چکے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ مسلم برصغیر نے فکری طور پر ترقی معکوس پر چلنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور سرسید احمد خاں کی فکر، بطور خاص ان کے مذہبی خیالات یعنی بطور خاص وہ خیالات جو تفسیر القرآن میں ظاہر ہوئے، اسی طرح شجر ممنوعہ ہیں جیسا کہ وہ انیسویں صدی میں تھے۔

''سرسید احمد خاں اور جدت پسندی''
از ڈاکٹر محمد علی صدیقی

اردو زبان کے مسائل اور اکیسویں صدی

شہزاد احمد

اگر کبھی یہ صورت حال پیدا ہو جائے کہ کرہ ارض کی ایک ہی زبان کو محفوظ رکھنا ممکن ہو، تو یہ فیصلہ کرنے کے لیے کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے لیے اقوام متحدہ کا کوئی اجلاس ہی لازمی ہے۔ اس سوال کا سیدھا سادہ جواب ہے انگریزی زبان!

اس کی ویسے تو بہت سی وجوہات ہیں مگر سب سے زیادہ بنیادی اسباب دو ہیں، اس وقت دنیا کا مکمل انحصار سائنس اور ٹیکنالوجی پر ہے اور دنیا کی کوئی بھی سائنس کانفرنس بین الاقوامی سطح پر انگریزی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں نہیں ہو سکتی۔ جو اصطلاحات مروج ہیں ان کا بنیادی تعلق بھی زیادہ تر اسی زبان سے ہے۔ اور جو نئی اصطلاحات بنائی جاتی ہیں وہ بھی اسی وقت مروج ہوتی ہیں جب وہ انگریزی زبان کے لیے قابل قبول ہوں۔ گلوبل لائبریری کا جو تصور اس وقت ساری دنیا میں عملی سطح پر موجود ہے، اس کا حوالہ بھی یہی زبان ہے اور دنیا بھر کے کلاسیک اور دیگر اہم کتابوں کا ترجمہ اس زبان میں ہو چکا ہے۔ جدید علوم میں جو بھی اضافہ ہوتا ہے وہ انگریزی زبان ہی میں ہوتا ہے یا اسے فوری طور پر انگریزی میں منتقل کر لیا جاتا ہے[1]۔ یہ صورت حال کسی اور زبان کی نہیں ہے۔

اسی باعث انسانوں کے روزگار کے تمام مسائل اور وسائل انگریزی زبان سے متعلق ہو گئے ہیں۔ بین الاقوامی تجارت اور تعلیم زیادہ تر اسی زبان میں ہوتی ہے اور دنیا کا ہر ملک خواہ وہ فرانس، روس اور چین ہی کیوں نہ ہو اس زبان کو سیکھنے پر مجبور ہے۔ انگریزی کو علمی اور ادبی سطح پر اب وہ حیثیت حاصل ہے جو قرون وسطیٰ میں عربی کو حاصل تھی یا اس سے پہلے یونانی کو حاصل تھی۔

موجودہ لسانی صورت حال کو تبدیل کرنا بھی ممکن نہیں ہے اور شاید اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پوری انسانیت کے پاس کوئی ایک زبان تو ایسی ہونی ہی چاہیے، جو ایک دوسرے سے رابطے کی زبان ہو، اور ایک چھوٹے پیمانے پر ہم یہ بات پاکستان میں اردو کے بارے میں بھی کہتے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۹۸۶ء تک اردو کو دفتری زبان کا درجہ حاصل ہو جائے گا، اس کے لیے کچھ کام بھی ہوا۔ مرکزی سطح پر مقتدرہ قومی زبان قائم کیا گیا۔ مگر ۱۹۸۶ء گزر جانے کے بعد پندرہ برس میں ہم نے اس طرف مڑ کر دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ کسی سطح پر بھی عملی طور پر یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ اب کوئی دوسری تاریخ ہی مقرر کر دی جائے، بلکہ اس کے برعکس انگریزی کو پرائمری کی سطح پر رائج کرنے کی بات ہو رہی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی والے اس وقت سب سے زیادہ فعال ہیں اور امید کی جا رہی ہے کہ اگلے چند برس میں ہماری سب سے زیادہ ایکسپورٹ اس شعبے میں ہوگی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم سال بھر میں جتنی ایکسپورٹ کرتے ہیں، اس سے زیادہ ایکسپورٹ ہندوستان میں صرف سوفٹ ویئر کی ہے، لہٰذا

---

[1] یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی صرف ۵۰ فی صد تراجم انگریزی میں اور دوسرے چینی، جاپانی، روسی، جرمنی اور فرانسیسی میں ہوتے ہیں۔ (مدیر)

عملی طور پر خود پاکستان میں اردو کی حیثیت ثانوی ہو چکی ہے۔

رہا ادب کا سوال تو چند ماہ پہلے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں اردو کے مقبول ناول نگار عبداللہ حسین اردو ادب کے مستقبل کے بارے میں خاصی مایوسی کا اظہار کر چکے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے ناول 'اداس نسلیں' کا ترجمہ خود انگریزی میں کیا ہے، بلکہ وہ کوئی ناول انگریزی زبان میں بھی لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی انگریزی فکشن کا رواج اب روایت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ انگریزی زبان میں ایسے کئی قابل ذکر مصنف موجود ہیں، جنہوں نے آغاز تو کسی اور زبان سے کیا تھا مگر بعد میں وہ انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی میں بہت نام پیدا کیا، فوری طور پر ذہن میں آرتھر کوسلر، آئیزک ایسی خوف اور لولیتا والے نوبوکوف کے نام آ رہے ہیں، چنانچہ انگریزی کے دروازے کسی پر بند نہیں ہیں، لندن میں ساقی فاروقی اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری بھی کرتے ہیں۔ امریکا سے افتخار نسیم کا انگریزی نظموں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے اور ڈاکٹر زیر آغا نے اپنی اردو نظموں کا ترجمہ خود بھی انگریزی میں کیا ہے اور دوسرے لوگوں نے بھی کیا ہے۔ اب انگریزی نظمیں بھی لکھنے کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔

لاہور میں مظفر غفار صاحب نے ایک آرٹ فورم بنا رکھا ہے جسے وہ Tri Lingual کہتے ہیں، وہاں ایک ہی جلسے میں انگریزی، اردو اور پنجابی کی تخلیقات پڑھی جاتی ہیں۔ خود میرا یہ حال ہے کہ پڑھتا انگریزی ہوں، لکھتا اردو ہوں اور بولتا پنجابی ہوں۔ اب تک جو کچھ نثر میں لکھا ہے یا ترجمہ کیا ہے اس کا ماخذ زیادہ تر انگریزی ہے۔ صورت حال یہ بنی جا رہی ہے کہ ہم اپنے Origin کو بھی انگریزی کے وسیلے کے بغیر نہیں جان سکتے۔

دوسری طرف یہ حقیقت بھی اپنے طور پر موجود ہے کہ کوئی بھی زبان محض اپنے ادب پر زندہ نہیں رہ سکتی، ضروری ہے کہ اس کا تعلق علوم کے ساتھ بھی ہو اور روٹی کمانے کے وسائل کے ساتھ بھی اور اردو کا یہی حصہ بہت کمزور ہے، اردو پڑھے لکھے لوگوں میں اب وہ لوگ بے حد محدود تعداد میں رہ گئے ہیں جن کا بنیادی تعلق علوم سے ہو، ڈاکٹر عبدالسلام اگرچہ اردو بہت اچھی جانتے تھے مگر انہوں نے اردو زبان میں سائنس پر کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ شاید یہ ان کے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے لیے نظریاتی طبیعیاتی سائنس دان کا کردار پسند کیا تھا، جس میں اردو کی گنجائش ہی نہیں تھی اور پاکستان بھی اسی لیے چھوڑا تھا کہ اس وقت وہاں سائنسی برادری سرے سے مفقود تھی۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ نہ صرف سائنسی برادری موجود ہو بلکہ ایسی ہو جو اردو زبان میں سائنس کو ترقی دینے کے کام پر لگی ہوئی ہو۔ بہت سے اردو جاننے والے دنیا کے مختلف ممالک میں بڑے بڑے سائنسی اداروں میں اعلیٰ سطح پر کام کر رہے ہیں مگر اس کا کوئی تعلق اردو زبان سے نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی کی سطح پر بھی اردو کو متعارف کروانے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اس سطح پر یہ نہ صرف ممکن تھا بلکہ ضروری تھا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے بعض پیشہ ورانہ اصطلاحات پر کئی کتابیں شائع کی ہیں مگر جدید تر تکنیکی معاملات پر کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ مثال کے طور پر موٹر مکینک مختلف چیزوں کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کرتے ہیں مگر اس سلسلے میں ایم اے کے تھیسس کی سطح پر بھی کام نہیں ہوا۔ ہم نے ایم اے اردو کو محض ادیبوں کے احوال و آثار تک محدود کر دیا ہے اور تھیسس لکھنے کے لیے سانچے بنا دیے ہیں۔ یہی حال عام طور پر پی ایچ ڈی کی سطح پر بھی ہو رہا ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی صورت میں ادب اور جدید علوم کے مابین کوئی مضبوط رشتہ بنانا پڑے گا۔ پھر بعض تکنیکی شعبوں کی تربیت بھی اردو میں کرنی پڑے گی۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو پھر طلبا مجبور ہوں گے کہ وہ انگریزی تک محدود ہو کر رہ جائیں۔ روٹی کمانے کا تعلق بھی اردو سے قائم کرنا ہوگا۔ شماریات کا تو مجھے علم نہیں مگر میرا خیال ہے کہ شاید ایک فیصد لوگ بھی ایسے نہیں جن کے

رزق کا تعلق اردو کے ساتھ قائم کیا جا سکے۔

میں پچھلے سولہ سترہ برس سے اردو میں علمی موضوعات پر لکھ کر روٹی کمانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ بے حد مشکل کام ہے۔ پبلشر اور سرکاری ادارے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ مارکیٹنگ کی صورت حال بھی تسلی بخش نہیں۔ اس لیے یہ کتاب اس قاری تک مشکل ہی سے پہنچتی ہے جو اسے واقعی پڑھنا چاہتا ہے۔ ایسی کتابیں زیادہ تر لائبریریوں تک محدود رہ جاتی ہیں۔ اکثر تو ایسی ہوتی ہیں کہ مجھ میں ہی نہیں آتیں، اصطلاحات کا جھگڑا ابھی شدید ہے مگر یہ بھی کچھ اس وقت حل ہوگا جب اردو میں علمی روایت پھر سے مضبوط کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہے کہ اقبال کے بھی پہلوؤں کو آگے چلانے کی کوشش کی گئی سوائے ان کی علمی روایت کے۔ اقبال نے اپنے خطبات بھی انگریزی ہی میں لکھے کیونکہ وہ اسی علمی زبان میں لکھے جا سکتے تھے۔ پھر ان کے تراجم کے سلسلے میں بھی کوئی قابل ذکر کام نہ ہو سکا، اقبال کے قریبی حلقے میں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو اس روایت کو آگے بڑھاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ فلسفے کی کلاسیکی روایت کے آخری آدمی تھے، ان کے بعد فروعات کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اب تک رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

ادیب اور شاعر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ اردو کی شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں، خصوصاً وہ شعرا جو مشاعرے کے ذریعے سے اپنے خیالات اور محسوسات دوسروں تک پہنچاتے ہیں، مگر اس میں بھی اب زیادہ تر Stage Performance کو ترجیح ملنی شروع ہو گئی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے باہر بھی مشاعرہ ایک ثقافتی سرگرمی کے طور پر مقبول ہے جو نسل تازہ تازہ ملک کو چھوڑ کر گئی ہے، یہ سرگرمی اس کے لیے طمانت قلب کا باعث ہے مگر ان محفلوں میں نوجوان نسل بہت کم نظر آتی ہے۔ مانچسٹر کی ایک ایسی محفل میں جب میں نے کہا کہ حاضرین کی اوسط عمر ۴۰ برس لگتی ہے تو ایک طرف سے آواز آئی ''جی نہیں یہ عمر ساٹھ برس ہے''۔ لندن کی ایک محفل میں بھوپال سے آئے ہوئے ایک پروفیسر صاحب نے تالیوں کی گونج میں یہ اعلان کیا ہے کہ ہندوستان میں اردو مقابلے کی جنگ جیت چکی ہے اور وہاں اس کا مستقبل بہت روشن ہے، کاش یہ صورت حال ویسی ہی موجود ہوتی جیسی کہ پروفیسر صاحب نے بیان کی تھی۔ ہم روزمرہ کی سطح پر زیادہ سے زیادہ انگریزی کو قبول کرتے چلے جا رہے ہیں، پچھلے پچاس برس میں جو تبدیلیاں بھی ہمارے معاشرے میں آئی ہیں، انہوں نے سبھی کچھ بدل کر رکھ دیا ہے اگر ہم پورے نہیں تو آدھے انگریز ضرور بن چکے ہیں۔ بے شمار سہولتیں ایسی ہیں جن کے بغیر ہم ایک لمحہ نہیں گزار سکتے۔ مگر ان سب کا تعلق سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ہے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد بھی یہ احساس کئی لوگوں کو ہو گیا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دیے بغیر ہم دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل نہیں ہو سکتے۔ مگر اس کے لیے عملی طور پر کچھ کیا نہیں گیا۔ صرف دفاعی ضروریات کی وجہ سے ہم نے ایٹم بم تو بنا لیا ہے مگر سوئی بم اب بھی نہیں بنا سکتے۔ اب بھی ہمارے مسائل وہی ہیں جو آغاز میں تھے مگر دنیا کی تیز رفتاری کے باعث ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ پہلے یہ ممکن تھا کہ ہم دس گیارہ سال کی محنت اور قربانی سے ترقی یافتہ ہو جائیں مگر اب اس کے لیے شاید زیادہ مدت اور کام کرنے کی لگن درکار ہوگی۔ ہم نے اپنے تساہل کے باعث اردو زبان کو بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔ اب اگر یہ زبان معدوم ہونے والی زبانوں میں سرفہرست نہ بھی ہو تو کم از کم یہ ان زبانوں میں شامل نہیں جنہیں محفوظ زبانیں کہا جا سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد زبانوں کے متعلق ہمارا رویہ بہت مختلف تھا۔ اس وقت چھوٹی چھوٹی زبانوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چین میں ایک ایسی dilect میں اخبار نکالنے کی کوشش کی گئی تھی جو محض چند ہزار افراد تک محدود تھی۔ افریقہ میں کچھ ایسی زبانیں تھیں جن کا سکرپٹ ہی موجود نہیں تھا۔ ان کو بھی اہمیت ملی تھی۔ اس وقت تیسری دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ

decolonization تھا۔ بیداری کی جو لہر آئی تھی وہ حکمرانوں کے اثر کو زائل کرنے کے درپے تھی، مگر اس کے باوجود افریقہ میں جو قابل ذکر ادب پیدا ہوا وہ انگریزی فرانسیسی اور سپینش زبانوں میں تھا، مقامی زبانیں فوری طور پر اتنا لمبا فاصلہ طے نہیں کر سکتی تھیں۔ اردو خوش قسمت تھی کہ اس کے اندر عربی فارسی اور کئی مقامی زبانوں کی روایت موجود تھی۔ اسی باعث یہ کہا جاتا تھا کہ وہ دنیا کے بہت بڑے حصے میں سمجھی جاتی ہے اور کئی ملکوں میں رابطے کی زبان ہے۔

مگر جدید سائنس نے دنیا کو پھیلایا کم ہے سمیٹا زیادہ ہے۔ اب روز بروز یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ یہ زمین ایک Global Village ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس عالمی گاؤں کے اندر بے شمار زبانیں تو نہیں بولی جا سکتیں۔ لہٰذا اس وقت موجود اکثر زبانیں مخدوش مستقبل رکھتی ہیں اور اردو زبان کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ اگر آپ اردو کو مستقبل کی زبان بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بہت کام کرنا ہوگا اور یہ کام صرف ادب تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے دائرے کو علوم تک پھیلانا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جاگیرداری نظام کی بجائے ہمیں جدید سائنسی معاشرہ اپنی زیادہ تر خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ قبول کرنا ہوگا۔

بشکریہ معاصر ، لاہور

مطبوعات قائداعظم لائبریری

(مقالات)

۱۔	اسلام کا تصور خودی	محمد سعد صدیقی
۲۔	اسلامی مملکت میں قیام امن	محمد سعد صدیقی
۳۔	اسلامی نظام تعلیم	محمد سعد صدیقی
۴۔	جہانے را دگر گوں کرد یک مرد خود آگاہے	سید عبدالرحمٰن بخاری
۵۔	ضابطۂ اخلاق برائے طلبا و اساتذہ	محمد سعد صدیقی
۶۔	عمل حدیث میں جرح و تعدیل	محمد سعد صدیقی
۷۔	نظام حکومت قرآن و سنت کی روشنی میں	محمد سعد صدیقی
۸۔	ہمارے دینی کتب خانے	محمد سعد صدیقی
۹۔	الکاسانی۔ حیات و خدمات	سید عبدالرحمٰن بخاری

ادب، ادبی تحقیق اور اکیسویں صدی

ڈاکٹر محمد یوسف خشک

اکیسویں صدی کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ اس تیز رفتار ٹیکنالوجی کی بدولت دنیا کی ضرورت بھی ہر روز تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی جو اس سے دور رہیں گے، ان کی اہمیت یقیناً اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے مقابلے میں ایک سنیاسی یا حکیم کی طرح ہو کر رہ جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں ادب کا طالب علم ہونے کے ناتے یہ کہا جائے کہ ان کی حالت لائبریری کے تہہ خانے میں پڑی ہوئی ان بے ترتیب کتب کی طرح ہو جائے گی جن کے نایاب ذخائر ہونے کے باوجود مشکل سے کوئی قاری ان تک پہنچ پاتا ہے۔

بہر حال یہ تو ہر ذی فہم انسان کی پہچان ہے کہ حالات جیسے جیسے بدلتے ہیں اس کی فکر بھی نئے راستوں پر چل نکلتی ہے، بصورت دیگر اس کے لیے ترقی کے راستے خود بخود مشکل سے مشکل تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ادیب اور محقق کا تو بنیادی کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات یا بیتے ہوئے لمحات کا بھرپور قلمی عکس آنے والی نسل کے سامنے صاف صاف رکھے تاکہ اگر اس میں سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے تو آئندہ نسل تیزی سے بڑھ کر اس سے فائدہ حاصل کر سکے اور اگر نقصان دہ ہے تو اس سے بغیر نقصان اٹھائے کنارہ کر لے یا پہلے سے کوئی نیا انداز اپنا کے اس نقصان دہ رخ کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکے۔ اس نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے تقاضائے وقت کو ہمیں بھی سمجھنا چاہیے تاکہ ادب و تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی تعداد میں کمی کے بجائے تیزی سے اضافہ ہو سکے۔

ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ انسان کے اندر نئے پن کی تلاش کے فطری جذبے کی بدولت اس میں قصہ یا کہانی سننے کی دلچسپی بھی ایک فطری بات ہو جاتی ہے۔ بچپن میں اس کے یہاں گھومنے پھرنے کے وسائل موجود نہیں ہوتے یا کم ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ کہانی اور قصے کی معرفت ایک نئی دنیا کی سیر کرنے نکلتا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اور وسائل بڑھتے جاتے ہیں توں توں قصے اور کہانیوں کے معیار اور موضوع بھی بدلتے جاتے ہیں اور یہ چسکا مرتے دم تک انسان کے ساتھ رہتا ہے۔

اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اس اکیسویں صدی (کمپیوٹر کی صدی) میں ہمارے ادب کا پودا کس طرح ہرا بھرا اور پھل دار رہ سکتا ہے۔ آس پاس کا ماحول ٹیکنالوجی کے زور سے مزید رنگین ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے جڑے ہوئے مضامین خود بخود نوجوان نسل کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں تو ایسی صورت حال میں ہم خادمین ادب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ادب کی معرفت دنیاوی رنگوں کو بلیک اینڈ وائٹ دکھانے کی بجائے مزید محنت کر کے رنگین دکھائیں تاکہ وقت کی رفتار سمجھانے والے وقت سے پیچھے نظر نہ آئیں۔

میرے مقالے کا مقصد اکیسویں صدی میں ادب و تحقیق کے فروغ اور تحفظ کے بنیادی وسائل سے ہے اس لیے میں بھی اس کا آغاز پہلی بنیاد یعنی پرائمری سے کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ براہ راست تو پرائمری سے یونیورسٹی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن میرے خیال میں اپنی حدود (Jurisdiction) میں یونیورسٹی کے سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہونے کے ناتے اس کا تعلق خود

بخود چھوٹے تعلیمی اداروں سے جڑ جاتا ہے۔ ویسے براہ راست جوڑنا بھی چاہیے کیونکہ پرائمری میں پڑھنے والے بچے ہی تو آگے آکر یونیورسٹی کے طالب علم اور ملک کے دانشور، سائنسدان اور رکھوالے بنتے ہیں۔

پرائمری سطح پر زبان اور اس میں موجود فن پاروں کو جدید انداز سے متعارف کروانے کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ بچپن کی عادتیں بہت دیر سے بلکہ اکثر نہیں چھوٹتیں اس لیے زبان اور اس کی معرفت ادب سے دیرپا محبت بچپن ہی میں دلچسپ پڑھائی کے ذریعے سے بآسانی پیدا کی جاسکتی ہے۔ پرائمری سطح پر الف ب سے لے کر شاعری اور نثری کہانیوں کا کمپیوٹرائز سلیبس بنا کر متعارف کروانا چاہیے۔ آج کل پاکستان کے ہر بڑے شہر کے پرائیویٹ سکولوں میں کمپیوٹر موجود ہیں۔ بچوں کو سکھایا جارہا ہے اور اس کی معرفت پڑھایا بھی جارہا ہے لیکن صرف ان مضامین کو جو انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں اور جب اردو یا کسی مقامی زبان کی باری آتی ہے تو دوبارہ بچے کو کمپیوٹر سے ہٹا کر صرف کتاب اور کاپی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور انہی کی معرفت اسے الف۔ ب پڑھنا اور لکھنا سکھائی جاتی ہے جس کی وجہ سے بچہ اردو یا مقامی زبان سے دلچسپی کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے بجائے مجبوری سے رشتہ جوڑے رکھتا ہے۔

ایسی صورت حال میں کئی امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو زبان وادب کی گھٹی ہی جس بچے کو روکھے پھیکے انداز میں دی جائے، ایسے بچے کو تمام عمر زبان وادب سے خاص دلچسپی پیدا ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس طرح ہم ادیب یا ادب دوست پیدا کرنے کی بجائے ان کے لیے رکاوٹ کا باعث بنے ہوئے ہیں اور دوسرا جدید انداز موجود ہونے کے باوجود پرانے انداز سے پڑھانے کی بدولت ہمارے اس عمل سے جو شخص دس پندرہ سال پہلے ادیب کی صورت میں ملنا چاہیے وہ بعد میں ملے گا۔ اس لیے ضرورت اس چیز کی ہے کہ پرائمری سطح سے آغاز کیا جائے اور کمپیوٹرائز سلیبس تیار کرواتے ہوئے اس میں مندرجہ ذیل چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱۔ زبان وادب میں جو کچھ بھی پڑھایا جائے ملٹی میڈیا سے پڑھایا جائے۔

۲۔ نرسری کلاس ہی سے اردو سلیبس کی ایسی سی ڈی (C.D) تیار کروائی جائیں جن میں ہر حرف کے پیچھے استاد کی آواز بھی ہونی چاہیے
تاکہ اس کو استاد کی مدد سے بھی اور اس کی غیر موجودگی میں بھی بچہ خود بخود پڑھ سکے اور سمجھ نہ آئے تو بار بار سن سکے۔

۳۔ شاعری (نظمیں گیت) جو بھی سلیبس میں شامل ہو خواہ وہ چھوٹی چھوٹی نظمیں ہی ہوں، تحت اللفظ ہونے کے ساتھ ساتھ سی ڈی پر گائی گئی ہوں۔ تاکہ زبان وادب سے بچے کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہے۔

۴۔ نثری کہانیاں یا دیگر مضامین ڈرامائی انداز میں سی ڈی پر ہونے چاہئیں تاکہ سکول سے باہر یعنی گھر پر بھی ٹیوشن ماسٹر کے طور پر بچے کے کام آسکیں۔

ہم لوگوں نے پرائمری جماعتیں تختی اور سلیٹ پر پڑھیں اور چھٹی کلاس میں پنسل استعمال کرنے کا موقع ملا۔ آج کا پرائمری پڑھنے والا بچہ نرسری کلاس سے کاپی پنسل استعمال کرتا ہے۔ موجودہ دور میں جس طرح تختی اور سلیٹ کا استعمال بالکل بند ہو گیا ہے اس طرح آئندہ دور میں پنسل اور کاپی کا استعمال بھی بند ہو جائے گا اور اس کی جگہ کمپیوٹر اور پرنٹر استعمال ہوا کرے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم بھی ایسے آئندہ حالات کے لیے ابھی سے تیاری شروع کر لیں اور ان تجاویز پر عملی کام شروع کر دیں تاکہ وقت کی رفتار کے ہم قدم نظر آسکیں۔

عنقریب یہ ممکن ہے کہ ہر سکول اور کالج کی اپنی ویب سائٹ (website) ہو، بلکہ اکثر پرائیویٹ سکولوں اور کالجوں میں ایسا ہو رہا ہے اور جہاں ایسا ہے وہاں اردو مضمون کے اساتذہ کو بھی چاہیے کہ وہ خود بھی کمپیوٹر پر کمانڈ حاصل کریں اور اس کی معرفت ادبی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً اس اعلان کے ساتھ بچوں میں نظموں کے مقابلے کرائے جائیں کہ جس بچے کی نظم پہلے نمبر پر آئے گی وہ نظم دوسرے مقابلے تک سکول یا کالج کی ویب سائٹ پر رہے گی۔ اس طرح بچے کے اندر شاعری یا نثر سے دلچسپی پیدا ہوگی۔ یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنی تیسری جماعت کا وہ خوبصورت دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب استادِ محترم نے سکول کے سب بچوں کو کہانی لکھنے کے لیے کہا تھا اور ہم تیسری سے پانچویں جماعت کے تمام بچوں نے اپنے بڑوں سے سنی سنائی کہانی سلیٹ پر پتھر کے قلم سے لکھی تھی اور شاباشی ملنے پر میں نے کہانیاں اس لیے مزید غور سے سننا پڑھنا شروع کی تھیں کہ مجھے سنانے کا موقع ملے گا۔ یوں شاعر، نثار، محقق یا نقاد آسانی سے منظرِ عام پر لائے جا سکیں گے۔

یونیورسٹی کے شعبہ اردو پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کی حدود میں پرائمری سے پوسٹ گریجوایٹ سطح تک یہ مقابلے کروائے اور سال کا بہترین مضمون، نظم، افسانہ، گیت قرار دے کر اسے ایک ماہ کے لیے یونیورسٹی ویب سائٹ کے اردو حصے میں رکھا جائے۔ جس سے یقیناً تمام عمر کے طلبہ و طالبات کی ادب سے دلچسپی بڑھ جائے گی اور نئے نئے تجربات ہمارے سامنے آئیں گے۔ انہی طالب علموں ہی سے آگے چل کر اچھے شاعر، محقق، نقاد، نثار یا ادب دوست بنیں گے جو جدید موضوعات ہمارے سامنے لائیں گے اور اس طرح تحقیق کے لیے خود بخود خام مواد تیار ہونا شروع ہو جائے گا۔

ادب کی تاریخ کے اوراق پلٹیں تو واضح دکھائی دیتا ہے کہ ادب میں بڑے بڑے کارنامے جن لوگوں نے انجام دیے ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ادب کے لیے ہمہ وقتی کام نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود ادب میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اس کی دیگر بنیادی وجوہات کے ساتھ ان کو میسر آنے والے ماحول اور رفقا بھی ایک سبب رہے۔ ایسے تجربات کی موجودگی میں اس صورت حال کو سمجھتے ہوئے بھی اگر ہم نے ادب کے لیے اکیسویں صدی کا ضروری ماحول پیدا نہ کیا تو موجودہ زمانے کی ادبی رفتار جو ابھی بہترین نہیں ہے، وہ قائم رکھنا تو دور کی بات ہے، بات بگڑ بھی سکتی ہے۔

سائنس کے طالب علموں کی اکثریت کو موجودہ صورت حال میں، ادب سے کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آ رہی۔ اس کی بنیادی وجہ ادب کے لیے موجودہ ماحول ہے۔ ہمیں اس پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ پاکستان بننے کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں ان کے مقابلے میں پہلے کی نسلوں نے کم مدت میں اردو ادب کو زیادہ توانا کیا ہے جس کی بنیادی وجہ مختلف زبانوں کی جانکاری اور وسیع مشاہدہ تھا اور وہ جانکاری اس وقت بھی ان لوگوں میں زیادہ تھی جن کا ہمہ وقتی کام ادب نہیں تھا، لیکن ان کو ماحول نے یہ مواقع فراہم کیے تھے اور ہمیں بھی صرف ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

تراجم کے سلسلے میں انسانیت کے شعبے کی نسبت سائنس کا طالب علم مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں ایک تو اسے تمام مضامین انگریزی میں پڑھنا پڑتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی انگریزی اچھی ہو جاتی ہے۔ انگریزی ایک ایسی زبان ہے جس میں دیگر زبانوں کے ادب کے تراجم خود بخود شامل ہوتے رہتے ہیں اور دوسری طرف سائنس کے طالب علم کو باہر جانے کے مواقع بھی زیادہ میسر آتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم سائنس کے طالب علم کی مخصوص تعداد کے اندر ہی اچھا ادبی ذوق پیدا کر دیں اور اس میں لکھنے کی عادت ڈال سکیں تو وہ طالب علم اگر تخلیق کار، محقق نقاد کے روپ میں نہ بھی مترجم کے روپ میں ہی سہی، اپنی زبان و ادب میں نئے پھول کھلا سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ بچپن ہی سے ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب یا ادب دوست

رویے کو منظر عام پر لانے کے لیے ہم ماحول ساز گار رکھیں۔ اس عمل سے یقیناً نیا ادب تخلیق ہوگا اور جب نیا ادب تخلیق ہوگا تو خود بخود تخلیق کے لیے نئے موضوعات سامنے آ جائیں گے۔

بہتر ادب اور ادبی تخلیقات کے ذرائع کی نشاندہی کے بعد اب ہم آتے ہیں جامعاتی سطح پر یا اداروں کی سطح پر ہونے والی ادبی تحقیق کی طرف۔

آنے والے پچاس برسوں کے بعد جب پرانی نسل کے لوگ اپنے بچوں کو یہ بتائیں گے کہ ہم سکول کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے میلوں کی مسافتیں طے کر کے جایا کرتے تھے تو ان کو حیرت ہوگی کہ کیا ان کے پاس اتنا فالتو وقت ہوا کرتا تھا جو وہ سفر میں ضائع کرتے تھے۔ کیونکہ اب انہیں سکول کالج یونیورسٹی جانے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ گھر ہی پر وہ اپنے استاد کا لیکچر ٹائم ٹیبل کے مطابق سن سکتے ہیں۔ استاد کو بھی سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور وہ بھی اپنے گھر سے لیکچر دے گا اور جب کوئی شاگرد سوال پوچھنا چاہے گا تو اس کا سیٹ نمبر استاد کے کمپیوٹر پر نظر آئے گا جس کو کلک کرنے کے بعد استاد اور دوسرے طالب علم اس کا سوال اور استاد کا جواب گھر بیٹھے سن سکیں گے۔ اس کام کے آغاز کی ابتدائی مثال ہمارے ملک میں ورچوئل Virtual یونیورسٹی ہے۔

آنے والے دس سالوں میں جیسے ہی انٹرنیٹ کی رفتار میں اضافہ ہوگا یونیورسٹی سطح پر کانفرنس میں شریک ہونے والے تمام لوگ اپنے اپنے گھر یا شعبے سے کمپیوٹر کی معرفت شرکت کر سکیں گے۔ اپنی اپنی باری پر مقالہ بھی پڑھیں گے اور دوسروں کو براہ راست سن بھی سکیں گے۔ اس لیے ان تمام موجودہ اور عنقریب آنے والے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں صحت مند ادبی تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل بنیادی اقدامات کرنے چاہئیں۔

۱۔ تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے شعبہ تحقیق کے باہمی رابطوں کو مؤثر بنانے کے لیے کمپیوٹر کے ذریعے سے رابطے کا پروگرام بنانا چاہیے۔

۲۔ ملکی جامعاتی سطح پر کمپیوٹرائزڈ لائبریری کا قیام عمل میں آنا ضروری ہے جو ہر وقت انٹرنیٹ پر موجود ہو اور محقق لائبریری کی مسافت اور کتاب کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک جگہ پر بیٹھ کر اپنے مطلب کا مواد حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں پہلے تو یہ کرنا ہوگا کہ جتنی بھی کتب جامعات نے شائع کی ہیں اور ایم فل اور پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے جن پر ڈگریاں ایوارڈ ہو چکی ہیں انہیں کمپوزنگ کے بعد کمپیوٹر لائبریری میں داخل کر دینا چاہیے اور اس کی درجہ بندی کانگریس لائبریری کے اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے۔

اس کے بعد پاکستان کے سرکاری اداروں سے بھی درخواست کرنی چاہیے کہ وہ ہماری اس سلسلے میں مدد کریں اور خانگی ادارے جن میں مدد کی سکت نہیں ان سے اجازت لے کر فی الحال ان کی شائع شدہ وہ ادبی کتب جو بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اردو انٹرنیٹ لائبریری میں داخل کر دینی چاہئیں اور آہستہ آہستہ پھر اس میں مستقل اضافہ کرنا ہوگا۔

۳۔ آئندہ کے لیے تمام اداروں اور محققین کو اس بات سے آگاہ کر دینا چاہیے کہ جب بھی کوئی کتاب بازار میں لائیں تو اس کے ساتھ اس کی سی ڈی بھی تیار کروائیں کیونکہ عنقریب کتاب کی جگہ سی ڈی لے لے گی۔ اس سے مصنف یا پبلشر کا کوئی نقصان نہیں ہوگا جب کہ موجودہ دور میں بھی مصنف کو معاوضہ ادا کرنے کے بعد ہی اس کی کتاب کو انٹرنیٹ لائبریری میں داخل کیا جا سکے گا۔ جہاں سے ہر طالب علم، عام لائبریری کی طرح، اس لائبریری کی بھی، فیس ادا کرنے کے بعد، اسے پڑھ سکے گا اور ہمارے اس قدم سے یقیناً قاری کا وقت اور پیسہ بھی بچے گا اور ساتھ ہی ساتھ قارئین کی

تعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔

۴۔ اس کے علاوہ پاکستان کے بہت سے علاقوں میں مخطوطات کے ذخائر موجود ہیں، تمام یونیورسٹیوں کی حدود میں موجود اس طرح کے عربی، فارسی، اردو و دیگر زبانوں کے ذخائر کی نہ صرف نشاندہی ہونی چاہیے بلکہ خالص ادبی نسخوں کو سکین کر کے اپنی یونیورسٹی کی کمپیوٹر لائبریری میں محفوظ کر دینا چاہیے اور صرف ان کا تعارف انٹرنیٹ لائبریری کے اوریجنل سیکشن میں شامل کر دینا چاہیے تا کہ ضرورت مند یونیورسٹی کی فیس ادا کرنے کے بعد اسے مکمل طور پر پڑھ سکے۔ اس سے یونیورسٹی کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور محقق کو بھی مسافت، پیمایش اور دیگر اخراجات سے چھٹکارا مل جائے گا اور تحقیق کی رفتار بھی بڑھ جائے گی۔ یہاں پر مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ کے شعبہ اردو کے زیر سایہ راقم نے ابتدائی مرحلے کا کام شروع کر دیا ہے۔

۵۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ سرکاری سطح پر ہمارے پاکستانی کمپیوٹر ماہرین کو یہ باقاعدہ پراجیکٹس دیے جائیں کہ وہ انگریزی سے اردو، فارسی سے اردو، فرانسیسی سے اردو، عربی سے اردو، جاپانی سے اردو، چائنیز سے اردو زبان میں علیحدہ علیحدہ ترجمے کے سافٹ ویئر تیار کریں جن کی معرفت با آسانی اردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں کا نہ صرف ان زبانوں کے ادب سے رشتہ جڑ جائے گا بلکہ ادب پر جمود طاری ہونے کی فضا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ بلکہ اس طرح کے مشترکہ منصوبوں کی تکمیل سے ہمارے ان اقوام کے ساتھ ثقافتی و تجارتی روابط بڑھیں گے جس سے یقیناً ملکی معیشت کو فائدہ پہنچے گا۔

۶۔ جامعات سے نکلنے والے تمام تحقیقی مجلے ہمیں اپنی ویب سائٹ Website پر بھی شائع کرنے چاہئیں تا کہ کم وقت اور کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ سکیں۔

۷۔ اس طرح کی قومی کانفرنسوں کے لیے آئندہ تمام مقالہ نگاروں کو پہلے سے صفحے کی سائز اور پوائنٹ سائز بھیج دینا چاہیے تا کہ کانفرنس میں شریک ہوتے وقت ان کا مقالہ کمپوزشکل میں کاغذ اور فلاپی پر میزبان کو مل جائے اور میزبان کو چاہیے کہ کانفرنس کے شیڈول کے مطابق تمام مقالے انٹرنیٹ پر بھی دیتے جائیں تا کہ اندرون و بیرون ملک اردو ادب کے شائقین جنہیں کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع نہیں مل سکا بروقت اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

۸۔ اس طرح جب دوسری یونیورسٹی کا پروفیسر، سکالر ہماری یونیورسٹی میں آ کر لیکچر دے تو اس کی بھی وڈیو سی ڈی بنانی چاہیے اور اسے انٹرنیٹ پر دے دینا چاہیے۔ اگر موجودہ صورت حال میں یہ ممکن نہیں ہے تو مہمان مقرر کو پہلے سے فلاپی پر اپنا لیکچر لانے کی درخواست بھیج دینی چاہیے اور لیکچر کے دن اسے انٹرنیٹ پر دکھانا چاہیے۔ تا کہ دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ اگر چاہیں تو اسے ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے دیکھ سکیں اور طالب علموں کو بھی دکھا سکیں۔

۹۔ پاکستانی جامعات کے تمام اردو شعبہ جات اور فروغ اردو کے لیے کام کرنے والے سرکاری شعبہ جات کا ایک سہ ماہی یا ششماہی انٹرنیٹ اخبار شائع ہونا چاہیے۔ جس میں تمام شعبوں کی سرگرمیاں اور تحقیقی کام کی رفتار شامل ہو جس سے یقیناً روابط بڑھیں گے اور نئی راہیں سامنے آ سکیں گی۔

آخر میں پھر کہنا چاہوں گا کہ ہر دور کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کا فن تحقیق اس وقت بھی عروج پر تھا جب کتب کا رواج دور جدید کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ کتب میں صحیح مواد دینے کے لیے مخصوص طریق کار کے

موجب زیادہ تر مواد لوگوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ دور دراز کے لوگوں تک رسائی بذات خود ایک بڑا مسئلہ ہوا کرتی تھی۔ اس لیے موضوع کے ایک زاویے کی تحقیق پر عمر لگ جاتی تھی اور کبھی کبھار تو عمریں ختم ہو جاتی تھیں اور کام ادھورا رہ جاتا تھا۔ لوگوں کی آبادی میں اضافہ ہوا، مصروفیات بڑھیں، وقت کی کمی آڑے آئی، تو انسانی دماغ نے در در بھٹک کر وقت ضائع کرنے سے بچنے کے لیے معلومات کے مشترکہ خزانے یعنی لائبریری کے فن پر باقاعدہ زور پکڑا جس سے تحقیق کے کام میں کچھ آسانی ہوئی۔ مسافتیں پھر بھی جانوروں پر طے ہوتی تھیں۔ جانوروں کی تعداد میں کمی اور نسل انسانی میں مزید اضافہ ہوا تو قدرت نے انسانی دماغ کو انجن ایجاد کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ مسافتیں پہلے سے زیادہ تیزی سے طے ہونے لگیں اور علم کے طالبوں اور تحقیق کا کام کرنے والوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ دور جدید میں وقت کی کمی کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کو معاشی مسائل کا سامنا ہے۔ تو قدرت نے کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی معرفت اس میں نرمی اختیار کر لی ہے۔ زیادہ روپے اور وقت خرچ کر کے دوسرے ممالک میں جانا، شہروں میں جانا یا قریبی کتب خانے میں جانے سے بچنے کے لیے یہ ٹیکنالوجی ایک تحفہ ہے۔ جس کی معرفت ہم ایک چھت کے نیچے بیٹھے ہوئے پوری دنیا کی سیر کرنے کے قابل ہوتے جا رہے ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم بھی اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کو سمجھنے اور اس کی معرفت سمجھانے پر صرف کریں۔ اس سے نہ صرف کم وقت اور کم خرچ سے ادب اور ادبی تحقیق روز بروز آسان ہو جائے گی بلکہ دوسرے مضامین کی طرح اردو ادب اور ادبی تحقیق کا مستقبل بھی مزید روشن ہو جائے گا۔

(بشکریہ اخبار اردو۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

اقتباس

ابا جی مجھے مارتے تھے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا اگر امی پٹائی کریں گی تو ابا جی کیا کریں گے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے میں نے امی کا کہنا نہ مانا۔ انہوں نے کہا بازار سے دہی لا دو، میں نہ لایا۔ انہوں نے سالن کم دیا۔ میں نے زیادہ پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا پیڑھی کے اوپر بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔ میں نے زمین پر دری بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا۔ کپڑے میلے کر لیے۔ میرا لہجہ بھی گستاخانہ تھا۔

مجھے پوری پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی، مگر انہوں نے کیا یہ کہ مجھے سینے سے لگا کر کہا:

کیوں دلور پتر! میں صدقے، بیمار تو نہیں ہے تو؟

اس وقت میرے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے۔

مٹی کا دیا از میرزا ادیب

اردو کا سبھاؤ اور ذائقہ

ڈاکٹر داؤد رہبر

اردو کب اور کیسے شکل پذیر ہوئی اور پھر اس کی ترقی کن منازل سے گزری اور پھر سیاست کے الٹ پھیر سے اس پر کیا گزری اور کیا گزر رہی ہے اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس پر میں قلم کیوں اٹھاؤں، میری دلچسپی اس سوال سے ہے کہ اردو کا مزاج (سبھاؤ) کیسا ہے اور اس کا ذائقہ (Flavour) کیسا ہے؟

ہر بڑی زبان کا اپنا ذائقہ اور سبھاؤ ہوتا ہے۔ اب جرمن قوم کو لیجیے، یہ لوگ اپنے وطن کو فادر لینڈ کہتے ہیں مدر لینڈ نہیں کہتے، اگر ان سے کہا جائے تو تم اپنے وطن کو مدر لینڈ کہو تو یہ ناک بھوں چڑھائیں گے، جرمن زبان کے تلفظات میں مردانگی پائی جاتی ہے۔

اگر ہندوؤں سے کہا جائے بھارت ماتا نہ کہو بھارت پتا کہو تو ہر سننے والے کو ہنسی آئے گی۔ اردو بھارت میں پروان چڑھی، بھارت ماتا کی اس زبان کا سبھاؤ مردانہ نہیں لگتا۔

اگر عربوں سے کہا جائے صحرائے عرب کو مادر وطن کہو تو ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ کیوں کہو، دشت کو مادر کون کہے گا، جیسی مردانگی جرمن زبان میں ہے عربی میں بھی ہے۔

ایران کی قدیم زبان پہلوی میں بھی مردانہ پن تھا، ایرانیوں نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے اسلام کی تعلیمات میں لچک اور نرمی لانے کے لیے لطافتوں اور نزاکتوں کے اہتمام کیے، عربی رسم الخط میں لکھی جانے والی فارسی میں مردانگی نہ رہی، قرآن مجید کی خطاطی ایسی آرایش کے ساتھ ہوئی کہ دوزخ کے ڈراوے میں سختی نہ رہی۔

ویدوں کی سنسکرت بھی سورماؤں کی زبان تھی۔ بھارت ماتا میں آ کر اس کا تحول ہوا۔ اہمسا کی تعلیم سے جنگجوئی کے ولولے فرو ہو گئے، سرسوتی دیوی ویدگیان کی رکھوالی مانی گئی، سنسکرت کے آہنگ میں وہ بات نہ رہی۔

اب دوسرے سوال کو لیجیے، اردو کا ذائقہ (Flavour) کیا ہے؟ گزارش ہے کہ ہر چند اردو میں نثر کا سرمایہ بھی اب بہت بڑا ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو کا ذائقہ اب بھی شعری ہے نثری نہیں۔

میرا چھوٹا بھائی محمد الیاس پاکستان کے بنتے ہی ایئر فورس میں بھرتی ہو گیا تھا، اس نے مجھے بتایا کہ ایک زمانے میں ایئر فورس کے کمانڈر ان چیف صاحب کے جذبۂ قومی میں جوش آیا تو انہوں نے حکم دیا کہ ایئر فورس کی ڈرل کی زبان اب انگریزی کی بجائے اردو ہو گی، چنانچہ ڈرل کے میدان میں لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ کی جگہ چپ راست چپ راست کے آوازے بلند ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے ایئر فورس کی ٹریننگ کا احاطہ محفل مشاعرہ کی صورت اختیار کر گیا، بیت بازی ہونے لگی، اس کا اثر ڈسپلن پر اچھا نہ ہوا، جلد ہی اردو کو ہٹا کر انگریزی واپس لائی گئی۔

مورخین ادب کا مشاہدہ ہے کہ اردو میں نثر نگاری کی تحریک اولا فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوئی، پھر اس نے سرسید کی مضمون نگاری کے اثر سے زور پکڑا، ادھر یورپ میں بھی شاعری اور شعرا کی حیثیت بیسویں صدی میں روبہ تنزل ہوئی اور وہاں نثر کا

تفوق مضبوط ہوتا چلا گیا اور امریکہ میں تو شاعری کی باغبانی نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک روز پروفیسر والفرڈ سمتھ صاحب نے ماورائیت (Transcendence) پر ایک پبلک لیکچر دیا۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کا وقت آیا تو میں نے پروفیسر صاحب سے کہا آپ نے ماورائیت کی طرف دانش گاہوں کی بے توجہی پر جو افسوس کیا ہے بجا ہے، آپ نے واگنر کی سمفنیوں کی مثال دے کر فرمایا ہے کہ ماورائیت کی سپرٹ کو ابھارنے اور برقرار رکھنے میں موسیقی کا حصہ بہت ہے لیکن آپ نے اس کے ساتھ شاعری کو قابل ذکر نہیں سمجھا اور مغربی تہذیب میں اس کے زوال پر افسوس نہیں کیا۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا ''عصر حاضر میں سنجیدہ اظہار مدعا کا متداول ذریعہ نثر ہی ہے اور آئندہ بھی سنجیدگی کا ثبات نثر ہی پر منحصر رہے گا''۔

میرا سوال تو چھیڑ خانی کے لیے تھا، مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ پروفیسر صاحب مقطع آدمی ہیں اور ان کا مزاج نہایت نثری ہے، مجھے اعتراف ہے کہ میرا مزاج نثری نہیں شعری ہے کیونکہ میں اردو کا رسیا ہوں، اردو کے بیشتر شیدائیوں کا مزاج آج بھی شعری ہے۔

اردو کے رسالوں میں آج بھی شاعری اور شعرا کے اذکار کی افراط ہے اور اردو ادب کے بیشتر مورخوں اور نقادوں کی دلبستگی زیادہ تر شعر و شاعری ہی سے ہے۔ مولانا آزاد کی آب حیات اور مولانا شبلی کی شعر العجم کو پڑھ کر جو مزا ہمیں ملتا ہے تاریخ نثر کی کسی کتاب کے مطالعہ سے ممکن ہی نہیں۔

فارسی، اردو اور ترکی کے شاعروں نے سب سے زیادہ طبع آزمائیاں غزل گوئی سے فرمائیں۔ غزل کی مانگ کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ غنا کے کام کی چیز ہے۔ دوسری یہ کہ یہ تفنن اور چھیڑ چھاڑ کی شاعری ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس کا محاورہ رندانہ ہے یعنی شریر بچوں کی طرح شجر ممنوعہ کا پھل چکھنے کے خیال میں رہنا۔ ممنوعہ شجر دو ہیں: گندم اور انگور۔

خمر کی تحریم کے رنگیلے مزاج کے مسلمانوں نے پروانہ کی۔ عباسی خلفا نے ایرانی الاصل وزیروں اور ندیموں کی مصاحبت میں قل ھو اللہ میں قلقل کو شامل کر کے شرارت کے مزے لیے۔

ظہور اسلام سے پہلے عرب میں جو شاعر تھے ان کی بے باکی اور اوباشی سے قرآن مجید نے مومنوں کو متنبہ کیا، اسلامی تہذیب میں شاعری کو رندانہ اشغال میں ایک وسطی حیثیت حاصل ہوگئی۔

رندانہ تہذیب کی ہنگامہ آرائی پانچ سرگرمیوں کے فراہم ہونے سے سامنے آئی۔ میکشی، عشقبازی، موسیقی، شاعری اور آزاد خیالی۔ یہ اس تہذیب کے عناصر خمسہ ہیں۔

عشق پردہ نشینوں سے ممکن نہ تھا۔ کنیزوں، لونڈیوں اور لونڈوں سے لگاوٹیں البتہ خوب ہوئیں۔ عربی شاعری میں اس نوع کے مضمون باندھے گئے۔ کئی خلفا اور سلاطین اس رندانہ شاعری کے مربی تھے اور شعرا ان کے ندیم، عاشقانہ شاعری (غزل) اور قصیدہ گوئی اور حاضر جوابیوں سے ندیموں نے اپنے مربیوں کو بہلایا۔ گفتگو کو ایک فن لطیفہ کا مرتبہ حاصل ہوا۔

شاعر نوازیوں کا جو سلسلہ عباسی خلفا کے دربار سے شروع ہوا، سلجوقیوں، غزنویوں، تغلقوں اور مغلوں کے درباروں میں جاری رہا۔ شاعری اور ندیمی کی ملاوٹ سے آداب محفل اور حفظ مراتب اور طرز تخاطب کی اداکاریاں ایجاد ہوئیں، ان سے فارسی زبان مالا مال ہوئی۔

پھر جب دہلی کے مغل بادشاہوں کے دربار میں اردو کا تکلم فارسی تکلم کے مقابلے پر آیا تو فارسی کی سب نزاکتیں اردو میں

لائی گئیں، کیجیے کی جگہ فرمایئے کا محاورہ زبانوں پر آیا، تکریمی جمع کا مزا لیا گیا۔ حضرت اور حضرت قبلہ کا انداز تخاطب خواص نے اختیار کیا۔ شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر اور شاہان اودھ نے اردو میں شاعری فرمائی۔

عجمی تہذیب کی برتری مسلّم تھی، یہ وسط ایشیا اور ہندوستان کی سلطنتوں پر اثر انداز ہوئی۔ سلطنت مغلیہ کا استحکام صفوی بادشاہوں کی امداد سے ہوا، اس لیے مغلوں کے تسنّن میں تشیع کی ملاوٹ ہوئی۔ نور جہاں کا سکہ ٹکسال سے ڈھل کر نکلا تو تشیع نے اورزور پکڑا۔ آگے چل کر اودھ کے دربار میں تشیع کا علم بلند ہوا۔ فارسی شاعری کی دوستی تسنّن سے کم اور تشیع سے زیادہ ہے۔

تسنّن کی شان ہے غلبہ اور جلال اور تشیع کی شان ہے تسلیم اور جمال اور پھر تشیع کا روحانی رشتہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بھی خاص ہے۔ اس سے تشیع کو گداختگی اور نرمی حاصل ہے۔ تشیع کی داستان شہدا کی داستان ہے پہلوانوں کی نہیں۔

لکھنو میں شعر خوانی کی مجالس دو طرح کی ہوا کرتی تھیں۔ مشاعرے کی محفلیں جن میں غزل خوانی ہوتی تھی اور مجالس عزا جن میں مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ مشاعرے کی بزم تو ہر لحاظ سے مردانہ بزم تھی۔ اس میں عاشقانہ اشعار کے مضامین کا بی بیوں اور بہو بیٹیوں سے کوئی تعلق نہ تھا (البتہ شاعر حضرات خود بالعموم نازک بدن اور نازک مزاج شخصیتیں رکھتے تھے) سامعین کا مجمع مردانہ ہی ہوا کرتا تھا۔

غزل گو کی ہر آہ پر واہ واہ ہوتی تھی، وہ اپنے خیالی معشوق کے خیالی تغافل اور خیالی جور کا رونا روتا تھا اور سامعین اس کا رونا سن کر ہنستے تھے، غزلوں میں معشوقہ کے لیے بھی مذکر ہی کے صیغے مستعمل تھے اس سے مشاعرے کے جلسے میں تمسخر موجزن رہتا تھا۔

مجالس عزا کی فضا احترام کی فضا ہوتی تھی۔ مرثیوں میں اہل بیت کی بی بیوں کا ذکر لازماً شامل رہتا ہے۔ یہاں تذکرے عاشقوں اور معشوقوں کے نہیں مقدس خاندان کے افراد کے تذکرے ہیں جن میں خرد و بزرگ سیدانیاں بھی شامل ہیں۔ یہ عالم ہی اور ہے اور پھر مجلس عزا کی شاعری میں رزم کے مضامین بھی ہیں۔

مغلوں کو اسلامی تہذیب تو عرب اور عجم سے ملی اور راگ مالا وادیٔ گنگا سے۔ اکبر نے راجپوتوں سے بیاہ کرنے میں پہل کی۔ اس کے بعد ہر مغل شہنشاہ نے اس کا تتبع کیا، حتیٰ کہ اورنگ زیب نے بھی، اپنے بیٹے محمد معظم کا بیاہ اس نے راجہ روپ سنگھ راٹھور کی بیٹی سے رچایا۔

مغلوں سے پہلے امیر خسرو نے (کہ یہ ایک نومسلم نانا کے نواسے تھے) راگ سرائی کو اپنا کر گوپیوں کے بول گائے۔ مسلمان کلاونتوں کی گائیکی میں اسی نوع کے بول رائج ہوئے۔ مغل شہزادوں کے کان اس موسیقی سے مانوس ہوئے۔ کنہیا کی شخصیت ان کے تحت الشعور میں مثالی ہو کر جاگزیں ہوئی، مغل دربار میں رہس لیلا کا ذوق جڑ پکڑنے لگا۔ شاہ جہان کے زمانے میں یہ زنانہ پن نمایاں ہونے لگا۔ تاج محل کی عمارت اس نسوانیت کی نمایندہ ہے، ادھر دہلی کی جامع مسجد میں بھی یہی بات ہے۔ اس مسجد پر اقبال کا ایک ریمارک یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اس کا ذکر آیا تو اقبال نے فرمایا ''وہ تو بیگم ہے''۔

مغلوں کے دارالسلطنت آگرہ اور دہلی دونوں جمنا کے کنارے تھے۔ وادیٔ گنگا کی بھگتی بھیگی ہوا کا اثر بڑھتا گیا۔ شاہجہان کے ولی عہد دارا شکوہ کے تصوف نے ویدانت کے تان پورے سے اپنا سُر ملایا۔ تاریخ نے پلٹا کھایا۔ دارا شکوہ مارا گیا۔ اورنگ زیب نے مغل تہذیب کا قبلہ درست کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ گنگا اور جمنا کا بہاؤ روک نہ سکا۔

فارسی کے مقابلے پر اودھ کی بولی سر چڑھ کر بولنے لگی تو مؤذن کی آواز کے مقابلے پر ناقوس کی گونج اٹھی:

جے گنگا مائی کی

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے ساتھ مغل خاندان کی نبرد آزمائی کا خاتمہ ہوا۔ جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء) اور محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) نے ارباب نشاط کی مصاحبت میں رنگ رلیاں منائیں۔ جہاندار شاہ نے اسی طبقے کی ایک عورت کو بادشاہ بیگم بنا کر دربار کو میراثیوں کا اڈہ بنا دیا۔ محمد شاہ رنگیلا کہلایا، اس کے عہد میں رہس لیلا کی گائیکی مقبول ہوئی۔

طوائف کے کوٹھے کو تہذیب کی درسگاہ کا درجہ حاصل ہوا۔ مردوں نے عورتوں کے اردو محاورہ کو سند قرار دیا، جان صاحب نے ریختی کہی۔ پردے کی وجہ سے گھروں میں مردانے اور زنانے کی جو تقسیم تھی اس کے باعث عورتوں کی اردو بولی مردوں کی اردو بولی سے مختلف ہوگئی۔ اشعار میں اس کا استعمال ہوا تو یہ ریختی کہلائی۔ بیٹوں کا بچپن زیادہ تر زنانے میں گزرتا تھا۔ ماؤں بہنوں کی زنانہ بولی ان کے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ بڑے ہوکر وہ اسے اپنی بول چال میں لائیں یا نہ لائیں یہ ان کے حافظے میں تو بہر حال موجود رہتی تھی۔ اس کا ثبوت ہمیں منشی فیض الدین دہلوی کی تصنیف ''بزم آخر'' میں ملتا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے عہد (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے عہد (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) تک دلی کے لال قلعے میں شادی اور غمی کی رسوم کس طرح ادا کی جاتی تھیں۔ اس میں ایک بیان ''باغ کا زنانہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس کی ایک عبارت ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ لکھنے والے مرد کے حافظہ میں زنانہ بولی کے محاورے کیسی خوبی سے مستحضر ہیں:۔

''دیکھو اب باغ میں چاروں طرف گانا بجانا اور آپس میں ہمجولیاں مل کر جھولوں اور ہنڈولوں میں جھول رہی ہیں۔ ایک ایک پر بولیاں ٹھٹھولیاں مار رہی ہیں۔ آج تو اس لال جوڑے پر جوٹ ہے۔ پھوٹ ایوا تم نے تو سنہری جوڑے کو کالی گوٹ لگا کلیجی پھپھڑا کر دیا۔ واہ، اچھی یہ برا معلوم ہوتا ہے۔ خاک تمہاری ارواح! اچھی تمہیں کیا نہیں سوجھتا۔ دشمنوں کے دیدے پٹم ہوگئے۔ ایلو! ٹاٹ کی انگیا، مونجھ کا بخیہ۔ درگور تمہاری صورت! یہ مواصد قے کا دوپٹہ اس پر یہ بھاری مصالحہ۔ آہاہا! کوے کی چونچ میں انار کی کلی۔ اس کلوٹی شکل پر یہ لال جوڑا کیا کھلتا ہے۔ بی تمہاری وہی کہاوت ہے کہ آبو لڑیں، لڑے ہماری بلا: بلا لے جائے تمہیں چلا؛ چلا ہونے لگی۔ ذرا سی بات تم سے پوچھی تھی، تم تو جھاڑ کا کانٹا ہوگئیں۔ دیکھنا سڑ ڈولی پاؤں کہار، آئیں بیوی نو بہار۔ اچھی میں کہتی ہوں تمہارا کیوں ہڈ ڑا گیا ہے؛ آدمی کدھر اڑ گئے جو اکیلی پائینچے پھڑ کاتی پھرتی ہو۔ اوہو ہو! اچھی تمہیں ہماری جان کی قسم، ہمارا حلوا کھائے، ہمیں کوسے ہے کر کے پیٹے جو اس بڑھیل کی دھج کو نہ دیکھے: سر گالا منہ بالا، سینگ کٹا بچھڑوں میں ملیں۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، لال جوڑا مٹکائے کیا ٹھسے سے بیٹھی ہیں۔ ایلو! یہ اور قہر توڑا کہ پوپلے منہ میں مسی کی دھڑی اور سوکھے سوکھے ہاتھوں میں مہندی بھی لگی ہوئی ہے۔

اچھی یہ لال کپڑے تو خیر بادشاہ کا حکم ہے، مگر کم بخت یہ مہندی اور مسی کی دھڑی جمائے بغیر کیا ان کی سرتی نہ تھی۔

دیکھو لونڈیوں پر غصہ ہو رہا ہے۔ اری گل بہار، نو بہار، سبزہ بہار، چمپا، چنبیلی، گل چمن، نرگس، مان کنور، انند کنور، چنچل کنور، مبارک قدم، نیک قدم کدھر اڑ گئیں؟ ایلو! وہ باغ میں کدکڑے لگائی پھرتی ہیں، سکڈے مارتی پھرتی ہیں؛ بھلا ری علامۂ دہر، قطامہ، چڑیل، مالزادی، قحبہ بچی، سر مونڈی، ناک

---

۱ شاباش

کاٹی، ایسی شترِ بے مہار ہو گئیں، ایسا دیدے کا ڈر نکل گیا، سب کو ازار میں ڈال کر پہن لیا، کام کاج پر دیدہ ہی نہیں لگتا، ایک جائے پاؤں ہی نہیں ٹکتا۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح مچلی ہی نہیں بیٹھتیں۔ سارے باغ کے جالے لیتی پھرتی ہیں۔ میں لہو کے گھونٹ بیٹھی گھونٹ رہی ہوں، کیسے تکلے کے سے بل نکالتی ہوں۔ کوئی دن کو یاد کرو، بچوں کو شور مل رہا ہے۔

بوا تم بھی کیا نین مٹنی ہو، ذرا ذرا سی بات پر ٹسوے بہاتی ہو۔ ایسی کیا انوکھی، اچرج، جان آدم، نعمت کی ماں کا کلیجہ، چیل کا موت، عنقا چیز تھی جو تم ایسی بلک گئیں۔ چھوٹی بہن تھی، اگر اس نے لے لیا تو کیا ہوا، آؤ میں تمہیں اور منگا دوں گی۔

اچھی دیکھتی ہو اس فتنی کو، کیا شیطان چڑھا ہے، کیسے دھیلے مچار کے ہیں، اپنا لہو پانی ایک کیے ڈالتی ہے، کسی عنوان نہیں بہلتی۔ ارے کا کا! ارے فلاں قلی! جائیو، بیوی کے لیے یہ چیز لائیو۔ بیگم صاحب میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں، کسی دوکان پر نہیں ہے۔ ایسا کیا بازار میں اوڑا پڑ گیا۔ یہ حرامی تکا، مادر بخطا، کام چور، نوالہ حاضر، یہیں سے بیٹھا بھیگی بلی بتا رہا ہے، ٹالم ٹولے کرتا ہے۔ اری یاقوت! اری زمرد! تو جا کر جہاں سے ملے ابھی ڈھونڈ کر لے کر آ۔ ایلو! یہ موا غارتی کہیں سے یہ موٹے موٹے چنگڑ، موٹے کچکونڈرے اپنے نگلنے اور ٹھونسنے کو اٹھا لایا، یہ تم ہی بیٹھ کر تھوروا۔ کھانے کو بسم اللہ، کام کو نعوذ باللہ۔ یہ ہمارے نمک کا اثر ہے، ان کی کیا خطا ہے؟ چلو اب تو نہ روٹھو، آؤ من جاؤ، غصے کو تھوک دو، بہت چو چلے نہ بگھارو، مجھے یہ نکتوڑے نہیں بھاتے؟ آپس میں بیر اکھیری، کم کٹا نہیں کرتے، ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی؟ مجھے تو دونوں آنکھیں برابر ہیں۔ تم کیا جنت میں لے جاؤ گے، وہ کیا مجھے دوزخ دکھائے گی۔ چلو نہیں منتی نہ منو، جوتی کی نوک سے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے۔ ایلو! وہ چھوٹی بہن کیا کہہ رہی ہے۔ ہم بھی جلے کو جلائیں گے، نون مرچیں لگائیں گے"۔

(بزمِ آخر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۶۶ تا ۶۸)

قلعے کی زندگی کے زنانہ پن کے ذکر کے بعد اب لکھنو کے تاجداروں کے رنگ ڈھنگ کا ذکر برمحل ہے۔ سلطان عالم واجد علی شاہ کی رہس بازیاں اور زن نوازیاں تو مشہور ہیں، ان سے پہلے نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ تا ۱۸۳۷) کا ذوقِ زن نوازی بھی معمولی نہ تھا۔ اس کا بیان مولوی عبدالحلیم شرر کے قلم سے ملاحظہ ہو:۔

"نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ آئمہ اثنا عشر کی فرضی بی بیاں (اچھوتیاں) اور ان کی ولادت کی تقریبیں جو ان کی ماں نے قائم کی تھیں ان کو اور زیادہ ترقی دی۔ یہاں تک کہ ولادت آئمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے میں بیٹھتے چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لیے

---

۱ کھاؤ

ولادت، چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انہیں سے فرصت نہ ملتی۔ سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا''۔

(گزشتہ لکھنو، نسیم بک ڈپو، لکھنو، ص ۵۶)

واجد علی شاہ کے عہد میں رہس (کرشن اور گوپیوں کا کھیل) تخلیا گیا تو اودھ کے مسلمانوں کی دل بستگی ناٹک سے ہوئی اور اندر سبھا کا ڈراما اسٹیج پر آیا۔

اردو کی صحافت کو حساب میں شامل رکھ کر سوچیں تو ماننا پڑے گا کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں میں اردو میں نثر نگاری بھی بہت ہوئی ہے اور اردو نثر میں کلاسیکل پائے کے شاہکار بھی کم نہیں، لیکن یہ ماننے میں حجاب نہیں ہونا چاہیے کہ اردو کا ذائقہ اب بھی شاعری والا ہے، سوکھے کیک والا نہیں۔ رس گلے والا ذائقہ۔ راشد نے ٹھیک کہا تھا ''ہم غزلائے گئے ہیں''۔

سرسید کے ارشاد کی تعمیل میں حالی نے (شاید طبیعت پر جبر کر کے) تغزل کو ترک کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن غزل کی ضرورت ہم سب کو اب بھی اس لیے ہے کہ پردے کے اٹھ جانے کے باوجود سچ مچ کی کورٹ شپ والی محبت کے امکان اب بھی ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ چنانچہ غزل یعنی خیالی کورٹ شپ والی شاعری کی ضرورت برقرار ہے۔

سنجیدہ انشا پردازی کا فروغ ہمیں درکار ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ ہماری تہذیب میں شعریت بالکل زائل ہو جائے۔ مغربی تہذیب میں اس کے جاتے رہنے سے بلا کی خشکی آ گئی ہے، تخیل اور اساطیر سے مزا لینے کی صلاحیت رخصت ہو گئی ہے۔ اب تخیل کے گھوڑے کو ایڑ لگانے کے لیے منشیات کے تجربے ہو رہے ہیں۔ ینگ کی کسی نگارش میں میں نے پڑھا تھا کہ جس تہذیب میں مردانہ پن اور زنانہ پن ہم وزن ہو کر موجود نہ ہوں گے اس میں توازن نہ ہوگا۔ پس اردو (اور ہندی) کی رہس لیلا بھی کام کی چیز ہے۔

اقتباس

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدمی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپسیا سے گزرے تھے۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں اندھے کنوؤں کی تہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی، تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اور جتنا اور جس کا رن آدمی دکھ جوگتا ہے، ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروان ڈھونڈنے والے کو نروان مل جاتا ہے اور جو دنیا کی خاطر کشٹ اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔

آب گم از مشتاق احمد یوسفی

زندگی ادب اور صنفی حساسیت

افضل توصیف

طوطا مینا کی کہانی پرانی ہوگئی مگر طوطا مینا وہی ہیں۔ راجہ رانی کی کہانی وہی ہے مگر خود راجہ رانی پرانے ہوئے، بدل گئے۔ ان کے طور طریقے اور طبقے قطعی مختلف ہو گئے۔ وہ کہیں مڈل کلاسیے ہو گئے، کہیں عوام الناس ہوئے۔ محنت کش اور فاقہ زدہ، ہنرمند اور ہوش مند، مگر ادب نے جب ان کرداروں کو کہانی میں بنا تو انسانی جوڑے کے طور پر ان کی طبقاتی شخصیتوں اور نفسیاتی تبدیلیوں کے ساتھ ہی جنسی حسیات کو دیکھا اور پہچانا۔ اس حساب سے کہانی اور شاعری زندگی کے قریب تر آ گئے۔

یہ زندگی اور زندگی کا تغیر ہے جو ہر قسم کی Sensitivity کو بدل دیتا ہے اور یہ علم و احساس بھی دیتا ہے کہ مرد عورت کے علاوہ بھی کئی انواع و اقسام ہیں جہاں زندگی جوڑوں میں نمود کرتی ہے یا ان کے جوڑوں سے بھی جنسی حسیات نمو پاتی ہے۔ اس معاملے میں اتنا ادب تو نہیں لکھا گیا مگر سائنس اور بیالوجیکل سٹڈی کافی ہو رہی ہے۔ انسان کی صنفی حساسیت پہ ادب تو ہر دور میں تخلیق ہوا لیکن عمرانی، نفسیاتی اور فطری مطالعہ نہ کبھی ماضی میں ہوا، نہ آج ہو رہا ہے۔ اسی لیے انسانی کرداروں یعنی مرد و عورت اور ان کی باہمی حساسیت صرف قصہ کہانی ہی رہا اور قصہ کہانی لکھنے والے یعنی ادیبوں نے اصل سے کہیں زیادہ اپنے تخیل کو استعمال کر ڈالا اور خود انسان نے اپنے آپ کو چھپایا۔ رب کی بنائی ہوئی مخلوق کی سیدھی سادی بات کو معجزاتی رنگ دیئے۔ اپنے آپ کو پردوں میں رکھنا ہی اسے اچھا لگا۔ اسی لیے ایسا ادب بھی لکھا جاتا رہا جو زندگی سے دور خیالوں اور خواہشوں کی وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ ہر جگہ اسے ایک ہیرو ایک ہیروئن کی تلاش رہی جو ایک دوسرے کو ری ایکٹ کریں تو زندگی کی منشا اور فطرت کی مرضی کے بالکل الگ اور برعکس ہو۔ ایک ناولٹی تو ادیب نے چاہی دوسری صنعت کاری سماج اور کلاس نے خود پیدا کی۔ نتیجہ جو بھی نکلا وہ اصل سے کافی دور تھا۔

آپ چاہیں تو بحث کر سکتے ہیں، یا چلیے کھلا اور سادہ اختلاف ہی بانٹ لیتے ہیں، کیونکہ یہ ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی کے بڑے بڑے انٹیلکچوئل اور دانش ور پوری دنیا میں ایسی بحثیں کرتے رہے جو کبھی مدلل تھیں تو کہیں بے منطق۔ مگر آخری نتیجہ یہی رہا کہ ادب سے پہلے زندگی کو دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ ادب ایک سماجی عمل ہے نا کہ غیبی واردات، لیکن ہر سماجی عمل ادب یا آرٹ، قدرتی عمل سے مختلف ہوتا ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے۔ بے شک آدم کو عاقل اور کلاکار مانا گیا ہے اور وہ ماننے والا رب کائنات اور کائنات کا نظام عمل جو بڑا مکمل اور منطقی اسباب و نتائج پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر خود انسان نے اپنے بارے میں کئی مغالطے پیدا کر رکھے ہیں جس کا سیدھا اثر اس کی تخلیقات اور سماجی رویوں پر پڑتا ہے۔ مگر اپنی جنس مخالف کے لیے اس کی حساسیت پہ بھی۔ ایک بات یہ بھی کہ مرد عورت دونوں کے اپنے اپنے احساس کمتری اور برتری بھی ہیں۔ مقابلہ اور تصادم بھی ہے جو کسی اور مخلوق میں نہیں ہے۔ جھوٹ صرف انسان بولتا ہے، کوئی اور مخلوق نہیں بولتی۔ استحصال بھی صرف انسان کرتا ہے اور یہ دونوں عمل یعنی جھوٹ اور استحصال Gender sense and sensibility کو قطعی غیر فطری بنا دیتے ہیں۔

آدم ہو یا کوئی اور نوع، زندگی یعنی ہوشیار زندگی جوڑوں میں وجود پذیر ہوتی ہے۔ آدمی کا جوڑا جس نے بہت بعد میں اپنا نام خود ہی رکھا، یعنی آدم اور حوا، الگ الگ رہیں تو ادھورے ہوتے ہیں، مل جائیں تو پورے ہو جاتے ہیں۔ تاہم آدم جوڑے کو ابھی اس کا یقین پورا نہیں۔ کیونکہ اس جوڑے کی ترتیب عناصر میں ابھی کچھ آدھا آدھا ہے تاہم ان کے اندر شک کا مادہ پورا پورا ہے۔ شک کا توڑ تو یقین ہو سکتا ہے مگر وہ بھی دونوں طرف ہنوز ادھورا ہے۔ کوئی عورت مرد پہ پورا یقین نہیں کر سکتی۔ کچھ ایسا ہی مرد کا معاملہ ہے۔ اسی آدھے یقین کی وجہ سے یہ جوڑا ایک جیسا ہو کر بھی مختلف رہتا ہے۔ شکل و شباہت، سرشت، شغل اور ذوق و شوق میں بھی اپنی الگ پہچان بنانا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ فرق بھی پورا نہیں ہو پاتا تو کچھ اور طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ مرد نے عورت کو آدھی کہہ دیا تو عورت غصے میں آ گئی اور مرد کو ادھورا بنانے میں جٹ گئی۔ یہ سچ ہے دونوں نے ایک دوسرے کو ادھورا کرنے میں پرخلوص کاوشیں کی ہیں۔ مرد نے عورت کو تحفظ اور آرام کے نام پر باہر کی زندگی سے کاٹ دیا۔ بلکہ اس کے سر پہ لاج کا برقعہ اور پاؤں میں تنگ جوتی پہنا دی۔

جتنی قصوری پیریں نہ پوری ..... عورت نے پاؤں دکھنے کے ڈر سے خود ہی باہر نکلنا بند کر دیا، مگر اپنا بدلہ ضرور لیا۔ اس نے بڑے پیار، خلوص اور خدمت گزاری کے ہتھیار سے مرد کے ہاتھ بیکار کر دیئے۔ وہ گھر میں ہانڈی سے سالن نہیں نکال سکتا، بچے کی نیپی نہیں بدل سکتا، بستر نہیں بچھا سکتا، یہاں تک کہ وہ اپنا بٹوا بھی نہیں سنبھال سکتا۔ ہوا نہ فرق؟ اور وہ بھی ایک جیسا۔

واضح رہے کہ لفظ فرق کو میں نے یہاں سوچ سمجھ کر اور پورے اعتبار کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ سچ مچ کا فرق اور جھوٹ موٹ کا فرق بھی اپنے معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو ہم الگ، مختلف اور جداگانہ جیسے لفظوں سے بھی واضح کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہماری آپ کی سمجھ کا بھی تو فرق ہے نا۔ بے شک یہی فرق ہے Human میں اور Angel میں، Human میں اور دیگر افزائش نسل کرنے والے جانداروں میں۔ انسان، میل اور فی میل کے درمیان لفظوں کا گورکھ دھندا بھی کام بگاڑتا ہے۔ جانداروں اور ذی شعوروں کی کوئی اور نوع الفاظ کا استعمال نہیں کرتی۔ لفظ جو بولے گئے، بیان ہو گئے، لفظ جو لکھے گئے سند ہو گئے اور اگر خوبصورت انداز سے لکھے گئے تو ادب شمار ہو گئے۔ انہیں لفظوں نے مرد عورت کو نام دیئے۔ تذکیر و تانیث کے صیغے بنائے اور ہر وقت ایک دوسرے سے مختلف ہونے کا شعور جگائے رکھا۔ اگرچہ اس سے پہلے تخلیق کائنات کے خودسر اور خودکار نظام نے مرد عورت کے جسم اور جبلت میں فرق رکھا تو یہی فرق ان کی فطرت کا بنیادی رجحان بنا۔ پھر یہی فرق سماج کے دستوروں میں جنسی امتیاز و تمیز کی بنیاد بن گیا۔ اسے کس قدر الجھایا اور بڑھایا گیا۔ کس قدر تصنع کاری کی گئی کہ مرد اور عورت قطعی الگ الگ دنیاؤں کی مخلوق بنا دیئے گئے۔ حالانکہ ایسے فرق دیگر مخلوق کی بناوٹ اور فطرت میں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی اور مخلوق ۔۔۔ چرند پرند، چوپائے نہ تتلی چیونٹی، نہ ہی مینڈک بچھو اس طرح کے جنسی فرق اور تعصبات کا مظاہرہ کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ کسی بھی جنس میں جنسی حساسیت ہوتی ہے، مگر جنسی تعصبات صرف آدمی عورت کے درمیان ہی پلتے بڑھتے ہیں اور وہ بھی اس قدر کہ ایک طرف مالک ملکیت تو دوسری طرف فریق مخالف بن جاتے ہیں۔

آج تو عورت مرد کا فرق، مثبت اور منفی، محبت اور نفرت، ملکیت و حیثیت ہر جگہ ہر طرح سے نمایاں ہو چکا۔ انسانی سماج نے ان دونوں کے بہت سارے رشتے جوڑے بھی ہیں۔ مگر فرق و تفریق کا ایک کلچر بھی پیدا کیا ہے۔ حالانکہ یہ کلچر کسی بھی اعتبار و تمیز کے تمدن کی طرح کھوکھلی اقدار پہ کھڑا ہوتا ہے۔ عورت کا سیا ہوا کرتا، مرد کا بویا ہوا کھیت، فرق کیا ہے؟ جب مرد درزی بن جائے اور عورت کسان کا کام کرنے لگے، اسی طرح اور معاملات ہیں۔ مرد اچھی ہانڈی پکا سکتا ہے عورت اچھا آفس ورک کر سکتی ہے۔ مگر

ہاں عورت اکیلی بچہ نہیں پیدا کر سکتی۔ اس طرح مرد کی پہلی حاملہ نہیں ہو سکتی مگر یہ دونوں ادب تخلیق کر سکتے ہیں، اپنا اپنا، الگ الگ اور مکمل بھی۔ مگر بچہ ماں باپ دونوں کا ہوتا ہے۔ ورنہ ادھورا اور یتیم رہ جاتا ہے۔ یہی جگہ ہے جہاں آ کر یہ دونوں ادھورے وجود پورے ہو سکتے ہیں۔

عشق محبت کی بات بھی بڑی اہم ہے۔ مگر پہلے بانو قدسیہ کی بات تو سن لیں۔ کہتی ہیں مرد عورت جب ایک دوسرے کے مرد عورت ہو جائیں، یعنی ازدواجی حق اور فرض کے بندھن میں بندھ جائیں تو دونوں کے لیے وہ ایک بڑا رشتہ بن جاتا ہے۔ صرف یہی ایک رشتہ ہے جہاں بے حساب جنسی تعصبات اور Complexes جنم لیتے ہیں۔ بناوٹ اور غرض کا رشتہ۔ جب کہ دوسرے سبھی رشتے ماں بیٹا، باپ بیٹی، بھائی بہن، خالہ بھانجا، پھوپھی بھتیجا، یہاں تک کہ پڑوسی پڑوسن، کولیگ اور بزنس پارٹنر بھی باہم مرد عورت اچھے ہوتے ہیں۔ مگر یہ شوہر! یہ بیویاں! کس قدر بناوٹی! بانو قدسیہ جیسی مکھن ملائی عورت بھی دانت پیس لیتی ہے۔ سبھی رشتے۔ وہ کہتی ہیں Well defined ہیں، سمجھ میں آتے ہیں مگر یہ جنسی رشتہ قطعی طور پر ایک دوسرے کو فریب میں رکھنے اور چکر دینے کا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں اپنی مشترکہ تخلیق، یعنی اولاد کے لیے بھی باہم رقیب ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر عورت یہ مقابلہ جیت لیتی ہے۔ ممتا کا جھنڈا اونچا رہتا ہے۔ باپ کی محبت اور قربانی کو زبان نہیں مل پاتی۔ دوسرے سبھی رشتے سمجھ میں آتے ہیں کہ انہیں سمجھانے والے کسی تعصبات کا شکار نہیں ہوتے۔ لیکن خود مرد عورت نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی دیر کر دی ہے۔ انسانی معاشرہ اکیسویں صدی کے مشینی اور کمرشل دور میں داخل ہو گیا ہے۔ زندگی کے تصورات یکسر بدل رہے ہیں اور بدل رہی ہیں محبت نفرت کی قدریں اور مقامات بھی۔

اور ہاں، محبت! کلاسیکل دور تو گزر چکے۔ لیلیٰ مجنوں کی کہانی تو بہت زیادہ پرانی ہو گئی۔ بڑی بڑی محبتیں تو بہت پہلے سے اپنا ماحول کھو چکیں۔ اب نہ وہ بھرے دریاؤں کے کنارے ہیں نہ صحراؤں کی پراسرار پنہائیاں، نہ وہ سنگ گراں جن کے نیچے محبت کی دودھ شہد کی نہریں چھپی رہتی تھیں۔ کوئی کمی بھی نہیں۔ پردہ بھی نہیں، سماج بھی اتنا ظالم نہیں۔ لیلیٰ بے حجاب ہے۔ سوہنی آزاد ہے مگر اتنے کے دل میں شعلہ تو کیا محبت کی چنگاری تک نہیں۔ وہاں تو کمپیوٹر چیٹ (Chat) ہے۔ کیریئر کا مسئلہ ہے اور ڈالر کمانے کی دوڑ ہے، یعنی بھوک مٹانے کو فاسٹ فوڈ ہے نا۔ محبت کا استعارہ ادب لکھنے کے لیے کام آ سکتا ہے، محبت کی فرصت کہاں۔ عشق نہیں تو داستان ہجر و فراق بھی نہیں۔ اب تو عورت کو آدمی کی محبوبہ ہونے سے زیادہ مرد کی برابری کا شوق ہے، بلکہ آگے نکل جانے کا بھی۔ اب اس طرح کے حالات میں محبت بیچاری کہاں فل بوٹ پہنے ریس کورس جائے؟ اور پھر مرد ذات خود اس طرح کی صورت حال سے خائف دکھائی دیتی ہے۔ ویسے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں، ایک بہت پرانے زمانے میں مرد عورت ایسے کئی مقابلوں سے گزر چکے ہیں۔ تاریخ سے ماقبل ایک زمانہ جس کے بارے میں کارل مارکس نے تحقیق سے لکھا اور اسے مادری نظام کا سماج قرار دیا، وہ زمانہ مرد عورت کے ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کا زمانہ تھا اور پھر ملکیت و سماجی سٹیٹس کے نام پر اور ایک جنس کے دوسرے کے ساتھ سلوک پر ٹکراؤ ہوا۔ دونوں جانور ایک فیصلہ کن لڑائی لڑے اور نتیجے میں دونوں کی حیثیتیں یکسر بدل گئیں۔ تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ تب مرد کمزور تھا، کیونکہ عورت کھیتی باڑی کی موجد اور مالک تھی۔ اسی نے تو پہلے پہل اناج اگانا اور ذخیرہ کرنا شروع کیا تھا اور بچے بھی اسی کے ہوتے تھے۔ ماں، مالک، ملکیت سبھی کچھ عورت تھی۔ مرد لوگ غلام اور نوکر یا پالتو کی حیثیت سے آگے کچھ بھی نہ تھے۔ اکٹھے رہتے تھے مگر مرد عورت کے کسی رشتے کا نام کوئی نہ تھا۔ مرد جو کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا، اسی کی ملکیت رہتا، اسی کا کامایا غلام اور کبھی تو پسندیدہ مرد بھی۔ ایک عورت کا ایک مرد، یہ حیثیت ابھی تسلیم ہی نہ ہوئی تھی۔ برتری عورت ذات کی تھی۔

وہی اناج اور کاسے کو کنٹرول کرتی، بلکہ اجتماعی طور سے عورتیں مردوں کو کنٹرول کرتیں اور ایک دوسرے کو تعاون دیتیں۔ غلاموں کے خلاف مالکوں کے اتحاد آج بھی ہیں۔ اس وقت کل ملکیت عورتوں کی تھی۔ کھیتی باڑی ان کی ایجاد تھی اور کھیت مزدور بھی ان کی پیداوار۔ بچے اور اناج عورتیں ہی کنٹرول کیا کرتی تھیں اور جیسے کہ مارگن نے لکھا ہے:

''عالم فطرت پر انسان کی ساری برتری کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ذرائع زندگی کی پیداوار میں اس نے کتنی مہارت حاصل کی ہے۔ انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے غذائی پیداوار پر پوری قدرت حاصل کر لی مگر یہ قدرت عورتوں نے پہلے حاصل کی تھی''۔

اور اس قدرت کو حاصل کرنے میں عورت کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ زمانہ جب سماجی طاقت اور پیداواری وسائل پر عورتیں حاوی تھیں۔ عورت کا سماج یا خاندان کے مادری نظام کا دور، اس میں مرد لوگ اوپر کے کاموں کے نوکر تھے، سماجی طور پہ بے حیثیت، عورت کا بچے پیدا کرنا اس کی طاقت تھی، اس طاقت میں مرد کی شراکت کا ابھی پتہ نہیں چلا تھا، بے شک مردوں کے لیے ایک برا دور رہا ہوگا لیکن عورتوں نے مردوں سے محبت بھی ضرور کی ہوگی۔ آخر جنسی احساس اور حساسیت تو فطری تقاضوں میں آتا ہے لیکن غلامی اور ماتحتی کی نفرت بھی ایک فطری رجحان ہے۔

تب اس نفرت کا بھرپور اظہار ایک بڑی بغاوت کی صورت میں ہوا۔ یہ مردوں کی بغاوت تھی عورتوں کے جبر کے خلاف۔ جنسی جنگ۔ مگر دراصل ملکیت، اختیار اور حق حصے کے لیے اور شاید جنسی برتری کے لیے بھی۔ اس مقابلے میں آدمی جیت گیا عورتیں ہار گئیں۔ یہ بھی فطرت کی منشا نہیں تھی۔ بلکہ اس لیے کہ عورتیں بیٹھ کر کھانے اور آرام کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے Muscle کی جنگ کے لیے فٹ نہ رہی تھیں۔ لیکن مردمحنت مشقت کی وجہ سے ہاتھ پاؤں سے مضبوط اور پھرتیلے تھے۔ کہتے ہیں اس دور میں عورت بہت موٹی ہوا کرتی تھی۔ اب جگہیں بدل گئیں۔ مگر طبقاتی نظام کے آنے سے کچھ تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ اب نمبرون ہونے کے لیے مرد کا مرد اور نمبر ٹو کے لیے عورت کا عورت ہونا لازم نہ رہا۔ طبقاتی حیثیت جنسی حیثیت سے الگ ہے اب مرد بڑی بیگم کے نوکر غلام بھی کچھ ہو سکتے ہیں لیکن بڑی بیگم اپنے طبقے کے مرد سے بڑی نہیں ہو سکتی۔ وہاں تو صاحب ہی بڑے ہوں گے۔ کماؤ پوت ہو تو ماں پہ بھی حکم چلاتا ہے۔ صورت حال ملکیت اور مرد دونوں حوالوں سے بدل گئی۔ اب زیادہ تر مرد ہی ملک کے مالک ہو گئے تھے۔ اب خاندان سے لے کر سماج تک ملکیت ہی فیصلہ کن تھی۔ طبقاتی کرداروں، طبقاتی حاکموں اور طبقاتی مالک اور ملکیت والا ایک ایسا سماج وجود میں آیا جو بہت زیادہ Complicated اور Complex تھا۔ اس طرح مرد عورت کا رشتہ بھی کسی طرح سیدھا سادہ نہیں رہا۔

پھر بھی مرد عورت ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم رہے۔ گو محبت نفرت کی جگہیں اور حالتیں بدل گئیں۔ ایک سرمایہ دار اور ملکیتی سماج میں عورت کی حیثیت گھٹ گئی وہ دوہری غلامی کا شکار ہو گئی۔ ایک اس کا عورت ہونا، دوسرے نادار ہونا۔ غلام اور نادار طبقوں میں بھی جہاں مرد خود کچھ نہیں، عورت اس کی باندی ہے۔ اس کی حیثیت دو ہاتھوں کی محنت اور بچوں سے متعین ہوتی ہے۔ جنس کے لحاظ سے وہ خود ملکیت ہے۔ خاندان اور مرد اسے بیچ بھی سکتے ہیں، اسے مزدوری پہ بھی لگا سکتے ہیں۔ مرد خواہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اس سے اہم اور برتر ہے۔

صدیوں پہ صدیاں گزریں، پدری اور ملکیتی نظام سرمایہ داری نظام میں تبدیل ہو گیا۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور عمرانی علوم نے جنسی کمتری برتری، نسلی اور طبقاتی امتیاز وتمیز کے اندھیروں میں روشنی کے چراغ جلائے تو عورت نے بھی اپنی خودی پہچاننے کی

کوشش کی لیکن اتنے عرصے میں عورت خود بڑی عورت دشمن ہو چکی تھی۔ اس کا استحصال بھی کچھ زیادہ ہی ہوا تھا۔ اسے علم سے دور بھی رکھا گیا تھا اور وہ آداب غلامی سے مزین سماجوں کی بڑی اچھی ٹیکنیشن اور انجینیر بن چکی تھی۔ وہ خود بیٹی کو تعلیم سے دور رکھنے کی حامی رہی ہے۔ آج بھی پسماندہ طبقات میں عورتوں کو تعلیم سے دور ہی رکھا جاتا ہے اور بہت سی بیٹیاں باپ سے کہیں زیادہ ماؤں کی غلام رہتی ہیں۔

مرد عورت کے ساتھ ساتھ عورت عورت کا رشتہ بھی غیر فطری بنتا چلا گیا۔ یہ محلاتی، سرمایہ داری اور ملکیتی سماجوں میں تو ہونا ہی تھا، مگر ان لوگوں نے بھی جو اصلاح معاشرہ کے لیے اٹھے قدرت کی منشا سے زیادہ سماجی حالات کو سامنے رکھا۔ ان کی مساوات بھی ایک فارمولا رہی۔ انفرادی سطح پہ خود فطرت نے بھی سب کچھ ایک جیسا نہیں رکھا۔ فرد فرد میں فرق ہے۔ عورتوں عورتوں میں فرق ہے اور مرد سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ ذہانت اور صلاحیت کی بات ہے۔ سائنٹیفک بنیادوں پہ سماج کی تعمیر ایک خیال ہے۔ عمل کی بات جس دن ہوگی افراد کی جداگانہ ہستی اور حیثیت ضرور حوالہ بنے گی اور اس لحاظ سے جنسی حساسیات کو دیکھا پرکھا جائے گا۔ آج تو کوئی بات بھی حتمی نہیں۔ آج کا خیال کل کا خیال خام ہو جاتا ہے۔ صنف نازک جو تھی، خلاؤں میں جا چکی، اب اکھاڑوں میں اتر رہی ہے۔ کل کو وہ ایک صنف تو ہوگی مگر نازک بالکل نہیں ہوگی۔ اس کے قد اور بازو کی لمبائی کے دو چار انچ کم رہے بھی تو کمپیوٹر کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ تاہم ابھی تو ماڈل مرد ہی ہے۔ خواہ جگہ بدل جائے۔ امریکی آئین کی طرح مرد عورت برابر ہوں یا سوویت منشور کی طرح عورت مرد یکساں لکھے جائیں، جنسی لحاظ، امتیازی نشان مٹ جائیں تو بھی Gender Sensibility کسی نہ کسی کیفیت میں اپنا خاص اظہار کرتی رہے گی۔ ادب اور آرٹ اس کے بغیر نہ دلکش ہو سکتے ہیں نہ تخلیقی حسیات کے جذبوں کی نرمی گرمی ان میں اجاگر ہو سکتی ہے۔ آج عورت مرد کے کردار تیزی سے بدل رہے ہیں۔ یہ تبدیلی بھی مصنوعی ہے۔ عورت مرد سے دوری اور بیزاری کا اظہار کر رہی ہے اور مرد اس کی طراری سے خائف پرانی محبوبہ کی انگشت حنائی ڈھونڈ رہا ہے۔ Marriage of commerce کی طرح محبت بھی ضرورت اور سہولت کی ہو جائے تو محبت کی کہانی کاروبار کی کہانی اور محبت کی غزل ڈائینگ کے بسکٹ جیسی روکھی پھیکی۔ اب نہ وہ نازک نازک جذبیاں ہیں جو دن کو مٹیاں بلوتیں اور رات کو دلوں کا شکار کرتیں۔ نہ وہ پنوں کی سسی ہے نہ صحرا کی لیلیٰ نہ جولیٹ۔ اب تو امراؤ جان بھی کہیں نہیں۔ مگر خیر مرزے رانجھے بھی کہاں ہیں۔ اب تو برابری کے دعوے ہیں۔ عورتیں کرائے کرتی ہیں اور یہ ہونا ہی تھا۔ جب وقت بدلنا چاہے اور بدل نہ سکے تو چیزیں، حالات اور ہر قسم کے جذبے احساس ابنارمل سے ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا، ایشیا ہی میں ایک عورت ابھی تک برقعے میں رہنا چاہتی ہے۔ چادر اور چولا ہی اس کا من پسند لباس ہے، لیکن دوسری نے جسم کو نمائش پہ لگا دیا اور تیسری ان دونوں کے درمیان زچ ہو گئی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایسے ہی حالات ترقی یافتہ اور ریفارمڈ یورپ میں بھی ہوتے تھے۔ ادب ہر جگہ کئی مراحل سے گزرا اور اس کی جنسی حساسیت بدلتی رہی۔ پہلے تو پری ہی تھی جسے مرد چھو نہیں سکتا تھا۔ بس دیکھ سکتا تھا، وہ بھی تخیل کی نگاہ سے۔ لیکن پھر جب شہزادی آئی تو اس سے عام آدمی ہم کلام ہونے کو ترستا رہا اور بالآخر ایک عام آدمی نے جن اور شہزادے کی جگہ لے کر عام عورت کو ادب کی محبوبہ بنایا، لیکن یہ عورت مرد کے خیال کی عورت تھی۔ سماج کی عورت سے تو وہ ابھی واقف ہی نہ ہوا تھا۔ مگر ادب لکھنے میں اولیت مردوں کی رہی۔ عورت ادیبہ جنریشن گیپ لے کر پیدا ہوئی تو، لیکن ابھی تو اسے خود پردے میں رہنا تھا۔ کبھی اپنے آپ کے اندر تو کبھی سماج کی دیوار کے پیچھے اور اس کا نتیجہ یہ کہ اول نسل کی ادیباؤں کا لکھا گمنام رہ کر آخر گم ہو گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا انہوں

نے ادب کے جنات اور شہزادوں کو کس طرح ری ایکٹ کیا۔ ہمارے پاس تو جو کہانی پہنچی اس کی ہیروئن کو تپ دق ہوتی اور پھر ایک ڈاکٹر ہوتا ہے۔ بس یہی ایک سچویشن ہو سکتی تھی، محبوبہ کی کلائی تھام کر نبض دیکھنے کی۔ انجام کار شادی ہو جاتی یا گھٹ گھٹ کر مرنے والی کنواری محبت کو قبر میں لے جاتی، جہاں ہیرو کو چراغ جلانے ایک بار تو آنا ہی ہوتا، محبت کی آخری امید۔ کئی عورتیں اپنے نام چھپاتی، مردانہ قسم کے ناموں سے لکھتی رہیں۔ یورپ میں بھی، جارج ایلیٹ کی مثال تو موجود ہے۔ بات آخر کو کھل گئی۔ لیکن شیکسپیئر کی بہنوں کو تو حسرت ہی رہی۔ اگر وہ بھی نائٹ تھیٹروں میں جا سکتیں تو ایسے ایسے ڈرامے لکھتیں کہ ولیم شیکسپیئر سے پہلے سسٹر شیکسپیئر کا نام ہوتا۔ اسی طرح ہیزلٹ کی بہن میری بھی قلم لیے بھائی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اس دور کے یورپ کی عورتوں کا ادب مردوں سے مرعوب ہے اور خود ان کی طرح ادب کی عورت بھی لمبے فراک، سر پر ٹوپی، دل سے بے چین مگر اوپر سے Composed اور لیڈی لائق دکھائی دیتی ہے۔ آخر Victorian age کا کلچر تھا کہ کرسی میز کی ٹانگیں بھی غلاف میں رکھی جاتیں لیکن جب وقت بدلا تو کچھ زیادہ ہی ری ایکشن ہوا۔ ینگ لیڈیز کی ٹانگیں اونچی سکرٹ میں اور اور سینے Low neck یا Topless بلاؤز میں۔ ویسے یہ سب مردوں کا کیا دھرا تھا۔ ہالی وڈ کے فلم سازوں نے اپنی ضرورت اور پسند کی عورت بنائی اور کاروباری اشتہاروں نے اپنی ضرورت کی بنائی۔ سوشلسٹ انقلابوں نے عورت کو اپنے بارے میں خود سوچنا سکھایا تو اس نے عورت میں طوائفیت کے سارے انداز ختم کر کے مرد کی عورت کے تصورات اپنے بوٹوں تلے کچل ڈالے۔ پروگریسو عورت نے برائتھل ہاؤس کو بمبارڈ کر دیا اور جسم کے جنسی اعضا کو خاکی وردی پہنا کر محنت اور Intellect کے میدانوں میں مارچ کرنے لگی۔

لیکن بیسویں صدی کی چھٹی دھائی تک آتے آتے ماڈرن یورپ اور امریکہ کی عورت کو مرد برے لگنے لگے، مگر اسے اپنا عورت ہونا بھی برا لگنے لگا۔ اس نے اپنی ٹانگوں کو ملفوف کرنے والی لمبی جرابیں اور سینہ بند چوراہوں میں کھڑے ہو کر اتارے اور جلائے۔ Feminist protest مگر کس کے خلاف؟ شاید اس سماج کے ادب کے خلاف جس نے عورت کے جسم کو میٹ شاپ بنا کر رکھ دیا یا اس کمرشل ازم کے خلاف جس نے عورت کی باقی شخصیت کو ختم کر دیا۔ صرف جنسی اعضا پر میک اپ لگا کر بازار میں لٹکا دیا۔ اب پروگریسو عورت کے مقابل Feminist کردار ابھر آیا۔ مرد سے بیزاری نے لزبین عورت پیدا کی اور اس عورت نے لزبین لٹریچر فروغ دیا۔ مگر مرد بھی کم بیزار نہیں تھے۔ پچھلی ایک صدی سے عورت محبت کے نام پر سوداگری کر رہی تھی اور خود محبتِ جیب کازیاں اور جی کا جنجال ہو رہی تھی۔ سو اس نے (مرد نے) بھی 'گے' کلب جوائن کر لیا۔ اب دونوں اپنا اپنا کھاتے ہیں اور اپنا اپنا لکھتے ہیں۔ امریکہ میں گے اور لزبین لٹریچر کی بھرمار ہو گئی ہے۔ لیکن یہاں دنیائے مشرق میں اسی طرح کے جنسی رویے بہت پرانے گوڈھکے چھپے موجود ہی رہے، لٹریچر نے اس کی غمازی بھی کی۔ میر کی شاعری ہو یا عصمت کی کہانی، مرد کے دیوان میں اور عورت کے لحاف میں، مگر سماج نے اسے کبھی کراہت کے بغیر نہیں پڑھا۔ تاہم یہاں نئے سرے سے یہ رجحان بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ کبھی اس طرح کی تحریک نہیں بن پائے گی جس طرح سے امریکہ میں 'گے' اور 'لزبین' سوشل تحریک بنا رہے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں یہ سب بگڑے سماج کی تخلیق ہے یا سماج کو بگاڑنے والوں کا کلچر ہے۔ آج تو گھروں سے دور بھاگنے، طلاقیں لیے اور بانجھ ہونے والے اپریشن کروانے، بچوں کو گھر سے باہر کرنے، مردوں کی جیب کاٹنے اور سیکس سمبل بن جانے کے علاوہ عورت کو اپنا کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا اور مرد اس عورت پر فدا ہونے کی بجائے defensive ہو گیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ ادیب اس کمزور مٹیریل کے ساتھ کوئی بڑا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ کیسے کر سکتا ہے؟ دنیائے مشرق کا حال

یہ ہے کہ اس نے مغرب کے ادب، کلچر اور سیاست کے اثرات کبھی قبول کیے تو کبھی آئیڈیلائز بھی کیے۔ اردو ادب میں جو عورتیں اول کہانی لے کر آئیں وہ انگریزی ادب سے واقف نہیں تھیں۔ زیب النساء، حور جیسے پرچوں میں خالص نسوانی رومانیت کے افسانے چھپتے رہے۔ شمع جیسے ناول بھی سوشل پکچر کا مواد فراہم کرتے رہے۔ ان تمام کہانیوں میں مرد عورت کے تعلقات انتہائی رومانٹک ہیں، لیکن سوشلسٹ تحریکوں کے زیر اثر ادب اور دیگر فنون میں جو زبردست حقیقت پسندی آئی تھی، اس کے اثرات بڑی دور تک گئے۔ دنیائے ادب کا ماحول بدل گیا، کردار بدل گئے اور ترقی پسند ادب کی قدروں میں جنسی Sense and sensibility کچھ کی کچھ ہوگئی۔ بڑے بڑے ادیبوں کے پیدا ہونے کا زمانہ تھا وہ، لیکن جب عورت ادیبہ حقیقت پسندی کے ساتھ اور اپنے اصلی نام کے ساتھ آگے آئی تو کسی مرد کو یقین ہی نہ آیا۔ عصمت چغتائی کی دبنگ تحریریں آئیں تو بھائی لوگوں کو یقین ہی نہ آیا ''ارے بھئی کوئی مرد ہے جو عورت کے نام سے لکھ رہا ہے'' انہوں نے یقین سے کہا۔ مگر خیر، جلد ہی انہوں نے عصمت چغتائی کو دیکھ لیا اور پھر جس کسی نے تعریف کی وہ بھی، جس کسی نے تنقید کی وہ بھی تعصبات سے بھری ہوئی تھی۔ مردانہ تعصبات بھی زنانہ تعصبات کی طرح بدبودار ہوتے ہیں۔ ویسے عصمت چغتائی نے مردوں کے لیے ڈنڈا پکڑا نہ عورتوں کے ساتھ کوئی رعایت کی۔ ان کی تحریریں کالی چٹی فوٹوگرافی تھیں جو رومانٹک کیمیا گری اور رنگ بازی سے صاف رہیں۔ عورتوں کے کردار انہوں نے کمزوریوں اور کمینگیوں سے صاف کر کے نہیں لکھے۔ یہاں جنسی رویے میں بھی کوئی آئیڈل وغیرہ نہیں آیا۔ مرد ادیب جن کے پاس آئیڈیل کوئی نہ تھا اور اسے لوئر مڈل کلاس گھروں میں گھسنے کی اجازت بھی نہ ملی۔ نہ ہی وہ اپنے گھر کی عورتوں کو رشتوں کے پردوں سے باہر نکالنے کی جرأت کر سکا۔ سیدھا کوٹھے چڑھ گیا۔ منٹو جیسا بڑا کہانی کار طوائف سے ہٹ کر کوئی عورت کردار نہ لکھ سکا اور فلم جو عورت کے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ چل سکتی ہے۔ اس کے کل کردار مردوں نے لکھے اور اکثر غلط لکھے۔ فلم کی عورت اور اشتہار کی عورت تجارتی ضرورت کو پورا کرتی ہے لیکن زندگی اور ادب کی ضرورت سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ ذرا دیکھیے مردوں کی تخلیق، برہنہ تن، بے لحاظ، اچھل کود کرتی یہ بھڑکیلی لڑکیاں یہ حوا کی بیٹیاں ہیں؟ کون کہتا ہے بھائی یہ تو مردوں کی تخلیق ہیں۔ مگر ان فلمی اور اشتہاری عورتوں نے نئی نسل کی عورتوں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ مصنوعی ماڈرن ازم، کھوکھلے ذہن اور زندگی کو کچھ دیئے بغیر سبھی کچھ لینے کی خواہشیں۔ بدتمیز اور روکھے رویے اور سیکس سمبل و سامان تجارت بن جانے کے رجحان بڑھے تو سماج کی ٹھیکریاں گرنے لگیں۔ گھر ٹوٹے، طلاق کا تناسب بڑھ گیا۔ بچے بگڑے اور طوائفیت بڑھ گئی۔ عورت کا کردار جو باعث تسلی تھا، ادھر مشرق میں بھی اس کا بت ٹوٹنے لگا۔ یہاں سب سے بڑی خرابی یہ رہی کہ نئی عورت نے اپنے آپ کو بہتر کے لیے بدلنے کی بجائے مردوں سے اپنا قد ناپنا شروع کر دیا۔ اتنا ہی نہیں، انہوں نے پرانی عورت کو بھی شرمندہ کیا۔ مگر خیر اچھا ہی ہوا۔ مردوں کے بنائے ہوئے بت بھی تو ٹوٹے۔ بڑی بڑی قصے کہانیاں تراش رکھی تھیں انہوں نے بھی صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہی ہیں جنہوں نے عورت کو بنایا اور وہی اس کے کنٹرولر بھی ہیں۔ عورت کو کبھی گھر دیا کبھی بازار، کبھی ملکہ بنایا کبھی لونڈی۔ کبھی جنت کہا کبھی جہنم بنایا۔ اب یہ عورت خود بننے بنانے کھڑی ہوئی تو اس کے پاس اپنا کوئی آئیڈیل تھا نہ ماڈل۔ وہی مرد کہیں اسے نئی عورت کہنے لگا کہیں بری عورت۔ ویسے یہ بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ مردوں نے کبھی اصل عورت کو دیکھا ہے نہ لکھا ہے۔ انہوں نے صرف بری عورت، اچھی عورت، عجیب عورت اور دلچسپ عورت دیکھی اور لکھی ہے۔

اردو ادب میں پہلا ناول مراۃ العروس ایسی ہی ماڈل عورتیں سامنے لاتا ہے۔ اکبری اصغری میں ایک پرانی روایتی اور سگھڑ و تمیز دار لڑکی ہے، دوسری بدتمیز پھوہڑ اور مزے کرنے والی۔ ایک گھر بناتی ہے، دوسری ڈفلی بجاتی ہے۔ پرانی وضع کے سماج

میں اصغری پسندیدہ عورت ہے جبکہ اکبری ناپسندیدہ۔ بات آج جو کچھ ایسی ہی ہے، مگر آج اکبریوں کے لیے سماج میں جگہ خاصی ہو گئی ہے۔ وہ ڈفلی منگوانے کے لیے مرد کی محتاج بھی نہیں، خود بازار سے لاسکتی ہیں۔ آج بے شک دنیا بدل گئی ہے مگر ہمارے ہاں آج بھی اکبری اصغری کے کردار موجود ہیں، مگر ادبی قدریں بہت بدل گئی ہیں۔ تاہم لکھنے والوں نے آج بھی اس عورت کو لکھا نہیں جو اکبریوں اصغریوں سے الگ اور خود اپنے جیسی ہے۔ عورت جیسی یا زندگی جیسی۔ مگر زندگی کو دیکھنے کی فرصت کسے۔ لوگ تو ٹی وی دیکھتے ہیں یا فلم۔ فلم ٹی وی کے کردار بھی مردوں کے لکھے یا بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور زیادہ تر مردوں کے کام آتے ہیں۔

عورت جب خود لکھنے بیٹھی تو ایک طرف اس کا اپنا Calibre تھا تو دوسری طرف مرد ادیبوں کے بنائے ہوئے آئیڈیل ماڈل اصول تھے۔ لکھنے والیوں نے خوب لکھا اور منفرد انداز میں اپنی پہچان سے آگے تک پہنچیں۔ عصمت چغتائی نے مردوں کو چونکا دیا۔ قرۃ العین حیدر نے ایسا لکھا کہ مرد لوگ اس کی نقل کرنے لگے۔ امرتا پریتم کے ہم عصر تو اس کی ذات سے عشق اور کام سے حسد ایک ساتھ کرتے رہے۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب سے اچھا لکھ کر بھی اپنے آپ کو ان شیروں کی جوہ سے پانی پینے والی بکری ہی کہتی رہی۔ یہ تو منفرد عورتوں کی بات ہوئی، لیکن کچھ لکھنے والیوں نے مردوں سے متاثر یا مرعوب ہو کر اپنے اندر احساس کمتری بھی پیدا کیا۔ اس معاملے پر انگلی اٹھانا ضروری ہے کہ کیونکہ مردوں نے انہیں Build کرنے کے نام پر خراب کیا ہے۔ ویسے مقابلہ ادب کا ہونا چاہیے، مرد عورت کا نہیں۔ لکھنا لکھنے والوں کی ذمہ داری ہے اور پرکھنا پرکھنے والوں کی۔ ہاں، مگر اچھا ادب زندہ رہتا ہے، اپنے وقت کو ذوق اور یقین دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہو تو موت ہے اس کی برات! اگر کوئی سماج کو رذوق ہے یا عیاش طبع ہے تو کبھی فنکاروں پر الزام آئے گا۔ ویسے تو یہاں بھی متضاد رائیں ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے تو ادیب کو ذمہ داری سے صاف بچالیا۔ ادب کو خود سر خود رو قرار دے کر۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو ادب کی جمالیات اور حساسیات پر بات کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے یہ سوچنا کہ سمندر کی جگہ سمندر کیوں اور صحرا کی جگہ صحرا کیوں ہے۔ مگر زیادہ تر اور تنقید کے ہر سکول آف تھاٹ نے فنکار کو اس کی اچھی بری تخلیق کے لیے اچھا اور برا لکھا ہے۔ اسی طرح جنسی حساسیات کی بات رہی۔

وہ زمانہ جب اقبال زندگی کے معنی کو اتھاہ کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے شاعر ادیب کو بڑا طعنہ دیا۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

مگر دوسرے شاعروں اور ادیبوں نے، اور بعد میں خود اقبال نے بھی اس بات کو الگ معنی دیئے یا ذومعنی باتیں کہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ تحریک اٹھی کہ ادب کے معنی زندگی کے برابر لائے جائیں۔ فکر و فلسفے کے لیے جنسی احساس کے معیار بھی تبدیل ہوئے۔ پریم چند جیسے بڑے فکشن رائٹر نے اپنے ہم عصروں کو سیدھا مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ عوام کی زندگی اور ان کی کشمکش حیات میں حسن کی معراج دیکھنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے صاف ہی کہہ دیا۔ ''مت سمجھو کہ حسن صرف رنگے ہونٹوں والی معطر عورتوں کے رخساروں اور ابروؤں میں ہے''۔ ..... حسن تو ڈھونڈنا پڑتا ہے ..... جب عشق عورت سے نہیں آئیڈیل سے ہو تو اسی طرح ہوتا ہے۔ مگر تب ہمارے بھائی لوگ کہتے ہیں سب کچھ روکھا پھیکا ہو گیا ہے، عورت چاہیے۔ آئیڈیل بدلنا ہے تو جمالیات کی حس بھی بدل ڈالو۔ مگر برائے خدا عورت کو ہر حال میں سامنے رکھو۔ پریم چند نے میک اپ کی ہوئی رنگین گڑیا کو رد کیا تو کھیت کی منڈیر پہ اپنا بچہ سلا کر مٹی کی گود ہری کرتی محنت کش کو ادب کی شہزادی بنانے کو کہا۔ کرشن چندر کھیتوں کی رانی کو ملکہ بنا کر لے گیا۔ ترقی پسند اور جدید زندگی کے طرف داروں نے امراؤ جان ادا کے مجرے سے منہ موڑا اور رشید جہاں کی تقریر سننے کو چلے

گئے۔ محبت کا آستانہ بدل گیا:

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے

پری نہیں، شہزادی نہیں، طوائف نہیں، سوداگر زادی بھی نہیں۔ ایک عورت بس عورت آخر یہ سب ہے کیا؟ ہزاروں باتیں ہزاروں رویے ادب کے اور آداب محبت کے۔ کس کے معنی کیا ہیں؟ اور کیوں ہیں؟ ادب وفن کی تخلیق کا عمل کس کی تحریک پہ ہوتا ہے؟ کیا رشتہ ہے ان سب کا؟

عالی ذہن لوگوں نے جو کچھ کہا، اس میں تضاد ملتے ہیں۔ لیکن گہرے تجزیے سے پتہ چلتا ہے وہ تو صرف اپنی سمجھ کا قصور تھا۔ اندر کی بات تو ایک ہی تھی۔ ایاز نے کہا:

''فنکار کسی بھی سماج کا ذمہ دار نہیں
سوائے اس کے جو اس کی سوچ میں ہوتا ہے
اسی طرح جیسے مورنا چتا ہے فقط
اپنی مورنی کے لیے، یا
اودی گھٹا کے لیے

ٹھیک ہے۔ مگر لینن کہتا ہے ادب لکھنا بھی ایک سماجی عمل ہے۔ شعوری اور سماجی، نہ کہ الہامی اور غیبی۔ اب لینن تو خود ادیب بھی ہے، صاحب علم بھی، سماج کا نبض شناس بھی اور ادب کا پارکھ بھی ہوسکتا ہے۔ مگر جنسی حساسیت؟ لیکن غالب، ہاں یاد آیا۔ غالب کے ہاں جنسی حساسیت میں نمایاں تضاد و تبدیلی ہے۔ اس کی ڈومنی خاصی ذہین عورت ہے۔ مگر تخلیق ادب کے لیے اس کا یقین غائب پر ہے۔ حاضر پہ نہیں۔ ''آتے ہیں غائب سے مضامین خیال..... عشق کرتا ہے نہ دماغ کا خلل کہتا ہے۔ لیکن حسن کاری کی بات تو جو انیسویں صدی کے یورپین شعرا نے کی، آج بھی دل کو لگتی ہے۔ ادب شاعری حسن کاری کا کام کرتی ہے تو پھر حسن پھول کی پنکھڑی میں ہو یا لیلیٰ کی آنکھوں میں بات یہ بھی اصلی ہے اور وہ بھی جو اقبال نے کہی۔ اپنے آپ کو مجموعہ اضداد کہا تو دوسروں کے جنسی رویے کو بمبارڈ بھی کیا۔ مگر خود ان کے ہاں سلمیٰ کی آنکھیں بھی ہیں، عطیہ کی ذکاوت اور کوئی وہ بھی ہے جس کی گود میں بلی دیکھتے ہیں تو بلی پہ نظم لکھ دیتے ہیں۔ کیوں نہیں۔ ذوق تخلیق کا اثبات ذوق حسن کے بغیر..... ہاں مگر ان کی پہلی بات غور طلب بن جاتی ہے جب ادب میں خوشبو کی جگہ بدبو آجائے۔ ''جنسی ادب'' ایک غلط مرکب ہے۔

جنسی تحریروں کو ادب سے خارج کرنے کا آپریشن فیئر پلے ہونا ہی چاہیے۔ اسی طرح آج کی Feminist تحریروں کو ادب نہیں ماننا چاہیے اور وہ تحریریں بھی جنہیں لزبین لٹریچر کہا جارہا ہے۔ امرد پرستی پہ تو ماضی میں بھی بہت کچھ لکھا گیا اور ماضی کے نقادوں نے اچھا نہیں کیا جو ایسی غزلوں کو اب تک دیوان باہر نہیں کیا۔ آج تو بڑا مشکل ہے۔ 'گے' اور 'لزبین' تحریکیں ہماری بات سن لیں تو اچھی خاصی جنگ چھڑ جائے اور پھر بمباری تو ہمارے اوپر ہی ہوگی۔ ہم مشرق والے آج کل زیر بار بھی ہیں اور زیر بمباری بھی۔ کیونکہ یہ سبھی کچھ امریکہ میں نہیں پنپ رہا ہے اور اس طرح کا ابنارمل رویہ بھی انسانی حقوق کے چارٹر پر جگہ حاصل کر چکا ہے۔ اور یہ لوگ جو بھی ہیں، اب خود اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ کل ہمیں غلط کہنے کو بھی تیار ہوں گے۔ اور یہ بگڑا سماج کل کو 'گے' غزلوں پہ بھی داد کے ڈونگرے برسانے لگے گا۔ ذوق عریانی میں تقدیس کے پھول ٹانکنا بھی تو ایک فن ہے نا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ نئی لکھنے والیوں کا احساس کمتری اور مرد حضرات کا ان کی سرپرستی کرنا ہے۔ عورت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی لیکن کچھ نئی لکھنے والیوں کے پاؤں میں پولیو جو آ چکا ہے۔ وہ مرد کی بیساکھی لے کر چلتی ہیں اور برے ادب کے ساتھ برا نام بھی کماتی ہیں۔ اصلاح کے پردے میں ٹھرک چلتا ہے لیکن جب ادبی کھیل جیسے لفظ بازار میں آ جائیں اور ادبی طوائفیت عام ہو جائے تو سب سے پہلے خواتین ادیباؤں کو اس کا نوٹس لینا چاہیے۔ ادب میں طوائف ہمیشہ موجود رہی کیونکہ مرد کی دلچسپی اور رسائی وہاں تک رہی۔ لیکن ادبی عمل میں طوائفیت ایسی بات ہے کہ خواتین رائٹرز کو شرمندہ کرتی ہے اور نقصان تو ہوتا ہی عورت کا ہے۔ عورتیں مردوں کے لیے شاعری کریں یا گیت گائیں، جیسے کہ ہندی شاعری کی رادھا کرتی ہے۔ نیچرل ہے، جنسی حساسیت دونوں طرف کی ہونی چاہیے۔ لیکن مرد کے تنے سے چمٹ کر اوپر چڑھنے والی کمزور بیلیں سارہ شگفتہ اور گوہر سلطانہ۔ کاش انہیں کوئی بانو قدسیہ مل جاتی۔

ایک بات اور ہے جو جنسی احساس کے ساتھ چھیڑی جاتی ہے۔ عورتوں کا ادب، مردوں کا ادب۔ نہیں بھائی۔ ادب میں زنانہ مردانہ کیٹیگرز بنانے کی کوشش ناکام ہو چکی۔ اسی طرح اچھا برا لکھنا Comitment اور Creativity کی بات ہے۔ جو جتنا زندگی سے لے لے اور جتنا پیدا کر کے لوٹا دے اور آج کل تو یہ دیکھنا بھی ضروری ہو چکا کہ زندگی صرف تیری میری کہانی نہیں ہے۔ ادب تو زندگی کا گیت ہے اور خود زندگی زمین بھی ہے آسمان بھی۔ ساری گولائیاں، ساری جہتیں زمین کی، ساری بلندیاں آسمان کی اور سبھی گہرائیاں سمندر کی، زندگی کہاں آباد نہیں ہے اور ادب کی Sense and Sensibility بھی شش جہت ہونی چاہیے اور یہ بھی کہ مرد عورت ہی سب کے اہم موضوع ہیں۔ اشرف المخلوقات ایک مغالطہ ہی تو ہے۔ تاہم ادب انسان کا ہنر ہے۔ ایک حقیقت جو اسے خالقیت کے درجے تک لے جاتی ہے۔ ادب تخلیق کرنا بڑی بات ہے مگر بھئی ذرا بچ کے ذرا سمجھ کے۔ یہ برہنہ لفظ یہ ننگی ٹانگیں، یہ کھلی چھاتیاں، یہ جنسی بھوک سے بھری آنکھیں نہیں بھئی یہ ادب ہے نہ آرٹ کا کوئی اور شعبہ۔ یہ تو کوئی بچڑ خانہ ہے یا اعضا کی دکان! یہ وہ ذوق عریانی نہیں جس کے سہارے تقدس جیا کرتا ہے!

دیوتا اور فرشتے کا ننگا مجسمہ تقدس کے لباس پہن لیتا ہے۔ دوسری مخلوق کی عریانی بذات خود اس کا لباس ہے، صرف انسان ہے جس نے اپنے آپ کو خود لباس پہنایا۔ اسے اتار لے تو بات تہذیب اخلاق سے آگے چلی جاتی ہے۔ ادب کو انسان کی برہنگی کا فوٹو گرافر نہیں ہونا چاہیے مگر ادب کا عمل اور اثر کیسا ہو، اس کا دارومدار سماج کی قدروں پر ہے۔ سماج کن اقدار کی پرورش کرتا ہے۔ اس کا دارومدار بڑی حد تک مردوں اور عورتوں کی Sense and Sensibilities پر بھی ہوتا ہے۔ ایک بات اور بھی جسے سمجھا جانا چاہیے۔ وہ بات سبھی لوگوں کی ہے۔ لوگوں کی اکثریت جن کی رائے اور رویوں کو ادب میں جگہ نہیں ملتی۔ خود ادیب کو ان کی ترجمانی کرنی ہی چاہیے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کچھ ایسا ہی احوال Opinion makers کا ہوتا ہے۔ وہ جو کہتے یا لکھتے ہیں، ضروری نہیں پوری سچائی ہو یا پوری دیانت داری۔ ویسے تو اس بات پر بھی دھواں دھار بحث چھڑ سکتی ہے۔ سچائی پوری ہی ہوتی ہے، ورنہ نہیں ہوتی۔ دیانت کے لیے بھی یہی کہہ سکتے ہیں۔ مگر میں جو کہنا چاہ رہی ہوں، وہ بات ناپ تول کی نہیں زندگی اور جمہوری اقدار کی ہے۔ ادیب کو زندگی اور جمہوری اقدار کا طرف دار ہونا چاہیے۔ نا کہ بگڑے تگڑے سماج کے بگڑے تگڑے مردوں عورتوں کا۔

ویسے یہ بات بھی خیال اور خواہش کی ہے۔ ادب کی قدریں زندگی سے متعین ہوتی ہیں۔ یہاں زندگی منافقت سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح سے مرد عورت کے باہم رویے بھی فریب کاری اور جنسی منافقت سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کی محبتیں نفرتیں، بہت سے افسانے، کہانیاں، بہت سے گیت، غزلیں۔ مگر بھئی حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔

بھرتری ہری کی شاعری کے اردو تراجم

ڈاکٹر اختر شمار

بارہ برس قبل، (۱۹۹۲ء) فنون لاہور میں میرا ایک مضمون ''سنسکرت کا شہرہ آفاق شاعر بھرتری ہری'' شائع ہوا تھا۔ جس میں جے کرشن چودھری کی اردو تصنیف ''بھرتری ہری''[۱] کو موضوع بناتے ہوئے میں نے بھرتری ہری کے افکار کا تجزیہ پیش کیا تھا۔ گزشتہ دنوں بھرتری ہری کا ایک اور ترجمہ میسر آیا تو اپنے پرانے مضمون کو نئے سرے اور نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ بھرتری ہری کا زیرِ نظر ترجمہ کتابی شکل میں ''بھرتری ہری شتک'' کے نام سے موجود ہے۔ اس کے مترجم بابو گوری شنکر لال اختر ہیں۔ ۱۲۶ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں بھرتری ہری کے سوانحی حالات بھی قدرے تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔ مترجم کا بھرپور دیباچہ بھی کتاب کا حصہ ہے۔ اندرونی ٹائٹل میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور کا حوالہ موجود ہے۔ دیباچے کے آخر میں مترجم کے نام کے ساتھ ۱۵ فروری ۱۹۱۳ء کی تاریخ درج ہے۔ بھرتری ہری کے کلام (اردو ترجمے) کی اولین اشاعت کب ہوئی اس کے بارے میں تو پتہ نہیں چلتا البتہ "IQBAL AND BHARTARIHARI" کے مقالہ نویس نے بھرتری ہری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس کا تعلق اجین سے تھا۔ شاہزادگی، بادشاہی اور جوگی پن اس کی زندگی کے تین دور ہیں جس میں اس نے ایک ایک شستکار (سو قطعات) لکھا۔ ان قطعات کے موضوعات، محبت، سیاست اور اخلاقیات ہیں۔ پروہت گوپی ناتھ نے ان کا ترجمہ ۱۸۹۴ء میں بمبئی سے شائع کیا جو ۱۹۱۴ء میں دوبارہ چھپا''۔[۲]

مقالہ نویس کے مطابق ۱۹۱۴ء میں بھرتری ہری کا اردو ترجمہ دوبارہ شائع ہوا۔ ممکن ہے یہ رائے درست ہو لیکن لاہور سے شائع ہونے والے اردو ترجمے پر مشتمل کتاب کے مترجم اور دیباچہ نگار نے اپنے دیباچے کے آخر میں ۱۵ فروری ۱۹۱۳ء کی تاریخ درج کی ہے۔ جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ بھرتری ہری کے کلام کا اردو ترجمہ پروھت گوپی ناتھ کے بعد ۱۹۱۳ء میں گوری شنکر لال اختر نے لاہور سے شائع کیا۔ ۱۹۱۴ء میں دوبارہ شائع ہونے والی کتاب (مترجم پروہت گوپی ناتھ) کا قصہ قدرے مشکوک ہو جاتا ہے۔

بھرتری ہری کے کلام کے اردو ترجمے کی حتمی اشاعتی تاریخ سے قطع نظر، ہم نے جو دونوں تراجم دیکھے ہیں ان میں جے کرشن چودھری کا ترجمہ زیادہ موزوں، دلنشیں اور مؤثر ہے۔ اور اس کی گواہی بھرتری ہری کے دیباچہ نگار تلوک چند محروم بھی دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''سنسکرت اور اکثر ہندی جاننے والے حضرات تو مہاراج بھرتری ہری کے نام اور کلام سے بخوبی واقف ہیں لیکن اردو میں اب تک بھرتری ہری کے کلام کا کوئی ایسا ترجمہ نظر سے نہیں گزرا جسے ذوق ادب کی طرف سے لائق اعتنا قرار دیا جا سکے''۔

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں:

''کہنے کو تو یہ بھرتری ہری کے شلوکوں کا ترجمہ ہے لیکن الفاظ کی موزونیت اور معنی کی مطابقت نے ایسا نظر فریب، دلکش اور دلنشیں بنا دیا ہے کہ ترجمے پر اصل کا گماں ہوتا ہے۔ مجھے ہندی سے کچھ واقفیت ہے اس کی مدد سے میں نے اس ترجمے کے بعض الفاظ کا اصل سنسکرت کے الفاظ سے مقابلہ کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس سے بہتر اور موزوں تر الفاظ اردو میں دستیاب نہیں ہو سکتے''۔۳

تلوک چند محروم جیسے پختہ فکر شاعر اور ادیب کی رائے کی اپنی ایک اہمیت ہے اور انہوں نے کچھ ایسا بے جا بھی نہیں کہا، واقعتاً جے کرشن چودھری کا ترجمہ کم از کم بابو گوری شنکر لال اختر کے ترجمے سے زیادہ بہتر اور پُر اثر ہے۔ بھرتری ہری کون تھا، کب پیدا ہوا اور اس نے کب وفات پائی؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے۔ یعنی زیادہ معلومات نہیں ملتیں اور اس کے لیے ہمیں محض روایات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جے کرشن چودھری کے مطابق تو وہ اجین یا اس کے نواح کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے کچھ عرصہ حکومت بھی کی، لیکن بعد ازاں کسی وجہ سے اس نے راج پاٹ چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لی اور باقی عمر انہیں جنگلوں میں گزار دی۔ کچھ عرصہ وہ اجین کے قریب ایک گپھا میں رہا اور اس کے بعد ہردوار اور بنارس میں گنگا کے کنارے قطرت سے ہم آغوش رہا۔ بعض مورخین اسے مہاراجہ بکرماجیت کا بھائی بتاتے ہیں۴۔ اگر اسی رائے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو وہ پہلی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ کئی محققین اس کے دور کو ۶۵۰ء کے قریب بتاتے ہیں جب سلادتیہ دوئم اجین کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ''تاریخ تمدن ہند'' کے مصنف محمد مجیب اس بارے میں رقم طراز ہیں:۔

''بھرتری ہری کا زمانہ ساتویں صدی کا پہلا حصہ تھا اس کے متعلق بہت سی روایتیں ہیں، لیکن کوئی صحیح بات معلوم نہیں۔ ہم یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ بدھ متی تھا یا ہندو''۔۵

بعض ناقدین بھرتری ہری کو مالوہ کو حکمران قرار دیتے ہیں۶۔ جس کی ابتدائی زندگی کا حصہ بہت عیش و عشرت میں بسر ہوا، لیکن آخری عمر میں اس نے ویراگ (ترک دنیا) اختیار کر لیا تھا اور مشہور جوگی گورکھ ناتھ ۷ کی خدمت میں رہ کر ویراگ کی تکمیل کی تھی ۸۔ بابو گوری شنکر لال اختر نے بھرتری ہری شتک میں، بھرتری ہری کی مختصر سوانح بھی تحریر کی جو فکر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور پُر اثر بھی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بھرتری ہری مالوہ کا راجہ تھا۔ اس کے باپ کا نام گندھرب سین تھا اور اس کے چار بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام وکرمادتیہ تھا۔ بھرتری ہری کی راجدھانی اجین تھی اور وہ نسلاً کشتری تھا۔ بابو گوری شنکر لال اختر، بھرتری ہری کے گورو کا نام چندر چاریہ دسورایان لکھتے ہیں۹۔ جس سے بھرتری ہری نے سنسکرت کی ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی اور اسی تربیت کے سبب بھرتری ہری کو سنسکرت کا لاثانی عالم بھی قرار دیا جاتا ہے۔

بھرتری ہری نہ صرف ایک اعلیٰ حکمران تھا بلکہ موسیقی اور علم عروض میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ وہ ایک نیک دل، خدا ترس اور عادل بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں علما اور باکمال افراد کی بے حد قدر تھی۔ اس کے آٹھ وزیر تھے جو بے حد زیرک اور لائق سمجھے جاتے تھے۔ بھرتری ہری کے دور میں دھرم کی تبلیغ سرکاری خزانے سے ہوتی تھی۔ دھرم کی تبلیغ کے لیے اپدیشک (دھرم آچاریہ) گاؤں، گاؤں جایا کرتے تھے۔ اس کے عہد میں مالوہ کے ہر قصبے میں شعر و شاعری کی محافل منعقد ہوتی تھیں اور واقعتاً اس زمانے میں رعایا خوشحال ہوتی تھی۔

راجہ کے محل میں تین سورانیاں تھیں اور ان میں سے سب سے خوبصورت پنگلا تھی ۱۰۔ جس سے بھرتری ہری کو بے حد

محبت تھی۔ لیکن پنگلا ایک بدچلن لونڈی کی صحبت میں اپنا آپ سنبھال کر نہ رکھ سکی اور اصطبل کے ایک داروغہ کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ بھرتری ہری کا چھوٹا بھائی وکرمادتیہ ایک عالم، فاضل، بہادر اور نیک سیرت نوجوان تھا۔ وہ شاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ بھرتری ہری بھی اس سے بے حد پیار کرتا تھا۔ وکرمادتیہ محل کی تمام رانیوں کو ماں کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وکرمادتیہ چوروں، رشوت خوروں اور بے ایمان لوگوں کے لیے بہت سخت گیر تھا۔ راجہ نے وکرما کو اصطبل کی نگرانی سونپ رکھی تھی۔ جب اصطبل کے داروغہ کے ساتھ پنگلا کے ناجائز تعلقات کا شک وکرم کے دل میں پیدا ہوا تو اس نے داروغہ کو اصطبل سے الگ کرنے کی تدبیر شروع کر دی لیکن پنگلا یہ بات برداشت نہ کر سکی اور اس نے بھرتری ہری سے شکایت کر دی کہ وکرما کا چال چلن اچھا نہیں ہے اور یہ کہ اسے جلاوطن کر دیا جائے۔ بھرتری ہری یہ باتیں سن کر آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے ملکہ کی باتوں میں آ کر اپنے بھائی کو جلاوطن کر دیا۔ وکرما نے راجہ بھرتری کو بہت سمجھانے کی کوشش کی یہ سب الزام ہے اور ایک دن اس فیصلے پر آپ کو پچھتانا ہوگا، لیکن بھرتری ہری ملکہ (پنگلا) کی محبت میں اندھا تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا اور وکرما کو وطن سے دربدر ہونا پڑا۔ وکرما کے دربار سے نکلتے ہی ہر طرف ایک ابتری پھیل گئی۔ رشوت خور، مفاد پرست اور بے ایمان درباری من مانی کرنے لگے۔ ادھر بھرتری ہری بھی اپنی محبت میں دربار سے قدرے بے نیاز ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد ہی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے بھرتری ہری کی آنکھیں کھول دیں۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کے نتیجے میں بھرتری ہری راج پاٹ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جنگلوں کا ہو کر رہ گیا۔ بھرتری ہری کے اس واقعہ کے بارے میں گوری شنکر لال اختر نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن جے کرشن چودھری نے اسے مختصراً بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بھرتری ہری کی زندگی کا اہم واقعہ اس کے ترک دنیا کا ہے۔ تاریخ اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ لے دے کر چند روایات پر ہمیں انحصار کرنا پڑتا ہے۔ مشہور روایت یہ ہے کہ ایک برہمن نے بہت عرصہ ''خدائی بندگی'' کی اور اسے ایک ''امرت پھل'' ملا جسے کھا کر انسان ہمیشہ جوان اور زندہ رہتا ہے۔ اس نے یہ پھل بھرتری ہری کی خدمت میں پیش کیا کیوں کہ وہ ایک دھرم کا پابند اور نیک راجہ تھا۔ بھرتری ہری کو اپنی رانی اننگ سینا سے بڑی محبت تھی۔ اس نے یہ پھل اسے دے دیا تاکہ اس کا حسن و شباب دائمی بن جائے۔ رانی کی محبت ایک کوتوال سے تھی۔ رانی نے یہ پھل اسے دے دیا۔ کوتوال ایک بیسوا کی محبت میں سرشار تھا، اس نے یہ پھل اپنی محبوبہ کو دے ڈالا۔ بیسوا اپنی زندگی سے بیزار تھی، اس نے یہ پھل راجہ کو ہی دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ہوتے ہوتے یہ پھل پھر بھرتری ہری کے پاس آ پہنچا، راجہ حیران رہ گیا۔ اور جب اس پر تمام حقیقت حال کھلی تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور دل کی دنیا ایک لمحہ میں بدل گئی''۔[11]

کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد بھرتری ہری نے شاہی لباس ترک کر کے گلے میں کفنی پہن لی اور دنیا سے الگ ہو کر جنگل کی راہ لی۔ جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح رعایا تک پہنچی تو گلی گلی آہ و نالوں کی صدائیں گونجنے لگیں۔ محل کی رانیوں نے وہ شور مچایا، گویا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پنگلا بھی اس صدمے سے سکتہ میں تھی۔ ہر جگہ ایک کہرام کا سا عالم تھا۔ بہت سے لوگوں نے بھرتری ہری کو اپنے فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن مالوہ کا راجہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے کسی کی نہ سنی اور جنگل کو نکل گیا۔ ایک جنگل میں اس نے متیندر ناتھ نامی جوگی کی شاگردی اختیار کی۔ گورو نے اپنے شاگرد کی تشفی کی اور اسے حکم دیا کہ جا کر اپنے محل کی

رانیوں سے بھیک مانگ کر لا۔ بھرتری ہری حکم بجالایا۔ اس تربیت کے بعد اسے ''یوگ ابھیاس'' کی تعلیم دی گئی ۱۲۔ رات دن کی ریاضت اور سادھوؤں کی صحبت نے اسے خود کو تبدیل کرنے میں مدد دی۔ بھرتری ہری نے کچھ دن، سوراشٹر دیش میں جا کر چلہ کاٹا۔ وہاں اس کے نام سے ''بھرتری گوپھا'' اب بھی موجود ہے۔ چنار نامی مقام کے قلعہ میں بھی، جو ضلع مرزاپور (بھارت) میں واقع ہے، بھرتری ہری کی سمادھ موجود ہے۔ ملک میں جا بجا، بہت سی یادگاریں، اس بزرگ کی یاد میں تعمیر کی گئیں جو اب بھی اس کے زندہ و جاوید ہونے کا ثبوت ہیں ۱۳۔ بھرتری ہری ایک عظیم مفکر، صاحب علم اور بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کی سنسکرت کی دو گرائمریں بھی ''واکیہ پدیہ'' کے نام سے مشہور ہیں جو اس کے کمال فن کی مظہر ہیں ۱۴۔ لیکن جس وجہ سے وہ ادب کا شہرہ آفاق شاعر بنا وہ اس کے گیتوں کی تین کتابیں ہیں۔ جو ''شرنگار شتک''، ''نیتی شتک'' اور ''ویراگ شتک'' کے نام سے شہرت دوام حاصل کر چکی ہیں۔

بھرتری ہری کے گیتوں کی ان تینوں کتابوں سے مرحلہ وار اس کے ذہنی فکری اور روحانی ارتقاء کا احساس ہوتا ہے۔ گوری شنکر لال اختر کے ترجمے پر مشتمل کتاب ''بھرتری ہری شتک'' اور جے کرشن چودھری کی ''بھرتری ہری'' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ گوری شنکر لال اختر نے بھرتری ہری کے کلام کا ترجمہ ۱۹۱۳ء کے لگ بھگ کیا۔ اس نے بھرتری ہری کے گیتوں کی کتاب کی فہرست اور ترتیب یوں دی ہے: ابتدا میں دیباچہ اور بھرتری ہری کی سوانح عمری ہے، بعد میں پہلے حصے نیتی شتک میں عقل مندوں کے اوصاف، خواص طبعی، دولت قناعت، بروں کے اطوار، مستقل مزاجی، پرماتما کی قدرت اور فعلوں کی تعریف کے عنوانات کے تحت بھرتری ہری کے افکار شامل ہیں۔ دوسرا حصہ شرنگار شتک ہے اس میں جو عنوانات دیئے گئے ہیں ان میں شرنگار شتک، موسم بسنت کی تعریف، موسم گرما کی تعریف، موسم برسات، آغاز موسم سرما، موسم سرما درمیانی، موسم سرما کا اختتام، استریوں سے دور رہنے کی تعریف، خوبصورتی کی تعریف، تذکرۂ ترک اور عارفوں کی تعریف شامل ہیں۔ ''ویراگ شتک'' آخری حصہ ہے۔ اس میں حرص و ہوس کی مذمت، دنیاوی لذت کی مذمت، خوبصورتی کی مذمت، کھوٹے انسانوں کی مذمت، غرور، بے غرض لوگوں کے خیالات، بے مروتی کا ذکر، دنیاوی لذات، کامل مہما، مترجم کی التماس اور معذرت کے عنوانات درج ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں گوری شنکر لال اختر نے تفصیل سے بھرتری ہری کے افکار کی تفصیل و تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کی زبان میں ہندو مذہب کی ہندی اصطلاحات کی بھرمار ہے اس کے باوجود یہ دیباچہ بھرتری ہری کے نظریۂ حیات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کتاب کے پہلے حصے ''نیتی شتک'' کے حوالے سے گوری شنکر لال اختر لکھتے ہیں:

> ''نیتی کا تعلق برہما سے ہے جو دنیا کا پیدا کرنے والا اور قانون قدرت کو ایک شاندار قاعدہ پر چلانے والا ہے۔ یگیہ، ہون، کرم دھرم، مل کر بیٹھنا، مجلسی حالت کو قابل اطمینان صورت میں قائم رکھنا اس کا فرض اعلیٰ ہے۔ سرشٹی کا انحصار کرم پر ہے۔ کرم کے ساتھ جزا و سزا ہوتی ہیں۔ علم سیاست، علم تمدن، علم تہذیب کا دارومدار برہما کی علم شریعت پر ہے اور اگر شریعت کی مراد کو اصل معنی میں سمجھا جائے تو اس کے تحت میں جتنے کاروبار ہیں دنیاداری کے جتنے رسم و رواج ہیں۔ کاروبار کے جتنے شعبے ہیں، درس و تدریس حکومت و جہاں داری کے تعلقات لوک پرلوک کے مسائل، سب کچھ آ جاتے ہیں۔ یہ برہما کے کام ہیں اور جو لوگ کرم کی ماہیت اور کرم کی اہمیت کے دلدادہ ہیں، وہ برہما کے سچے پتر ہیں، ویدک دھرم ست سناتن ان کا دھرم ہے اور حسب ہدایت برہما جی، وہ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ نظر غائر کے لیے جس میں تعمق اور گہرائی ہے وہ

یوگی راج بھرتری ہری کی نیتی شتک کے دلکش پیرایہ میں، ان سب باتوں کو، جو میں نے اوپر اختصار کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے دیکھیں گے''۔ ۱۵

گوری شنکر لال اختر نے کتاب کے دوسرے حصے ''شرنگار شتک'' اور آخری حصے ویراگ شتک کے حوالے سے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ شرنگار کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس کا تعلق وشنو سے ہے جو حسن وسیرت اور حسن وصورت کا دیوتا تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حصے میں حسن وعشق کے مدارج کا بیان ہے۔ شرنگار شتک میں کہیں کہیں بھرتری ہری نے کراہیت اور نفرت کے کلمے بھی استعمال کیے ہیں۔ اس سلسلے میں شنکر لال اختر کا خیال ہے کہ بھرتری ہری نہ تو کرم یوگی تھے نہ اپاسنا اور بھگتی کے حامی بلکہ وہ گیانی تھے اور اس نگاہ سے کرم اور اپاسنا کا گھنڈن کرنا انسان کے لیے ناموزوں ہے کیونکہ ویراگی اور گیانی دراصل کرم اور بھگتی کے طبقات سے کہیں اونچے ہوتے ہیں۔ نیتی، شرنگار اور ویراگ میں دراصل پرلے۔ استتھی اور سرشٹھی کے تماشے میں نظر غائر سے دیکھنے والے راج رشی بھرتری ہری کے نیتی، شرنگار اور ویراگ شتک میں برہما، وشنو اور مہش کی وہ نرالی اور خوبصورت تصاویر دیکھ سکتے ہیں جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی ۱۶۔

جہاں تک بھرتری ہری کے افکار کے اردو ترجمے کا تعلق ہے، گوری شنکر لال اختر سے کہیں بہتر اور مناسب ترجمہ جے کرشن چودھری نے کیا ہے۔ صرف چند مثالیں پیش خدمت ہیں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کون سا ترجمہ زیادہ بلیغ اور پر اثر ہے۔ پہلے نیتی شتک میں شامل اشلوک کا وہ ترجمہ ملاحظہ کیجیے جو شنکر لال اختر نے کیا ہے:

''ممکن ہے کہ انسان مگرمچھ کے دانتوں میں سے موتی گھسیٹ کر نکال لے اور طوفان خیز موج افزا سمندر کو عبور کر جائے یا غضبناک سانپ کے سر کو پھول کی طرح سے ہاتھ میں پکڑ لے، مگر بیوقوف کے دل میں جو خیال جم گیا ہے اس کا نکالنا ناممکن ہے''۔ ۱۷

اب اسی اشلوک کا جے کرشن چودھری کا ترجمہ دیکھیے:

''مگرمچھ کے جبڑے سے موتی نکال لینا بہت ممکن،
متلاطم سمندر کو تیر کر عبور کرنا آسان،
غضب ناک سانپ کو سر پر پھول کی طرح رکھ لینا سہل،
پر یہ ناممکن ہے کہ جاہل کے دل میں جاگزیں کسی خیال
کو ہٹایا جاسکے''۔ ۱۸

گوری شنکر لال اختر کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

''جو شخص کھوٹے آدمی کو اپنی نصیحت سے راہ نیک پر لانے کی خواہش رکھتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کوئی نازک کنول کی ڈنڈی کے سوت سے ہاتھی کو باندھنا چاہتا ہے۔ اور سرس کے پھول کی پنکھڑی سے ہیرے کو پرونا چاہتا ہو یا کھاری سمندر کو ایک بوند شہد سے میٹھا کرنا چاہتا ہو''۔ ۱۹

اب جے کرشن چوہدری کا ترجمہ دیکھیں، اشلوک وہی ہے:

''کنول کی نازک ڈنڈی (شاخ) سے ہاتھی کو باندھا جا سکتا ہے۔
ہیرے کو سرسوں کے پھول کی پتی سے بیندھا جا سکتا ہے۔

اور شہد کی ایک بوند سے کھارے سمندر کو میٹھا کیا جا سکتا ہے۔
لیکن، مرد ناداں کو میٹھی باتوں سے رام کر لینا سعی لاحاصل ہے''۔۲۰

اسی اشلوک کا ترجمہ حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبال نے بھی کیا ہے جو جے کرشن چودھری کے ترجمے سے مطابقت رکھتا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر ۲۱

اب ویراگ شتک سے گوری شنکر لال اختر کا ترجمہ دیکھیے:

''جس وقت ہم گنگا کے کنارے ہماچل کی چٹان پر پدم آسن لگا کر بیٹھیں گے اور برہم گیان کے ابھیاس میں اچھی طرح آنکھ بند کر کے یوگ کی نیند کے مزے لیں گے دیکھیں ہمارے جسم میں اپنے سینگوں کو رگڑتے ہوئے، ہرن اپنی اپنی کھجلاہٹ مٹاتے ہیں یا نہیں''۔۲۲

یہی اشلوک جے کرشن چودھری نے بھی ترجمہ کیا ہے، دیکھیے کس قدر خوبصورت ہے:

''وہ خوشی کے دن کب آئیں گے
جب میں کوہ ہمالیہ کی کسی چٹان پر مقدس گنگا کنارے،
پدم آسن لگائے دنیا اور مافیہا سے بے خبر، آنکھیں بند کیے
برہم کے تصور میں محو ہوں گا اور بوڑھے ہرن،
بے خوف و خطر، اپنے کندھوں کو میرے جسم سے
مل کر اپنی خارش مٹائیں گے''۔۲۳

شرنگار شتک سے بھی مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

پہلے گوری شنکر لال اختر کا ترجمہ دیکھیے:

باتیں تو کسی اور سے کرتی ہے
پیار و محبت کی نگاہوں سے کسی اور کو دیکھتی ہے
اور ملنے کی آرزو کسی اور ہی سے ہے
اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کس کے ساتھ
انس اور پیار ہے؟ ۲۴

اب فرق ملاحظہ کیجیے اور جے کرشن چودھری کا ترجمہ دیکھیے:

''کیا عورت حقیقت میں کسی شخص سے محبت کرتی ہے؟
وہ (بیک وقت) ایک انسان سے باتیں کرتی ہے۔
دوسرے کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہے۔
اور تیسرے شخص کی یاد کو سینے سے لگائے رکھتی ہے''۔۲۵

محولہ بالا مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جے کرشن چودھری کا ترجمہ گوری شنکر لال اختر کے ترجمے سے زیادہ تخلیقی، رواں، شستہ اور خوبصورت ہے۔ جے کرشن چودھری کی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف میں نامور شاعر جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''چودھری صاحب صرف پڑھے ہی نہیں ''کڑھے'' ہوئے آدمی بھی ہیں اور یونیورسٹیوں کے ان فارغ التحصیل افراد سے ان کا دور کا بھی کوئی رشتہ نہیں جن کی جیبوں میں تو علمی ڈگریاں اور کھوپڑیوں میں جہل کا آشیانہ ہوتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ پڑھا، اسے ہضم کیا اور اپنے وجود میں اسے رچایا بھی ہے۔ وہ نثر اور نظم دونوں پر قادر ہیں، سخن گوئی اور سخن سنجی کی دولت سے بھی بہرہ یاب ہیں''۔ ۲۶

۲

اب ہم جے کرشن چودھری ہی کے ترجمے کو مدنظر رکھتے ہوئے بھرتری ہری کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈال رہے ہیں۔

بھرتری ہری کے تینوں مجموعوں میں تفکر کی ایک لہر صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس کے ہر مصرعے میں اس کا گہرا مشاہدہ، باریک بینی اور حساسیت کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ ''شرنگار شتک'' میں وہ ''ایام شباب'' کے جذبات و احساسات کی نکتہ آفرینیاں بیان کرتا ہے۔ ''نیتی شتک'' میں زندگی کے گوناں گوں مسائل اور قدرے سنجیدہ موضوعات کو چھیڑا گیا۔ اس دور کے اشلوک اس کی دنیاوی سوجھ بوجھ، عقل و خرد اور شعور کی رہنمائی کا پتہ دیتے ہیں۔ آخری دور کی کتاب ''ویراگ شتک'' میں بھرتری ہری نے حیات کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویہ اپنایا ہے۔ اس کی نظر میں دنیا دکھوں کا گھر ہے اور وہ یہاں بالکل تنہا اور اکیلا ہے۔ یہاں کے رشتے ناطے سب عارضی اور مفاداتی ہیں اور انسانی خواہشات، سراب سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ بھرتری ہری کے نزدیک بہترین زندگی انتہائی سادہ اور فطرت کے قریب ہونی چاہیے۔ اس کے آخری دور کے کلام میں اس کی پختہ فکری، قادرالکلامی اور تخیل کی پرواز دیدنی ہے۔

بھرتری ہری کے ابتدائی گیت ''شرنگار شتک'' میں شامل ہیں۔ یہ وہ کلام ہے جو اس وقت تخلیق ہوا جب بھرتری ہری ایک شاہانہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے پاس تخت و تاج، دولت اور دنیا بھر کی رنگینیاں اور لطف سب کچھ موجود تھا۔ وہ خود بھی جوان، خوبصورت اور ذوق جمال کا دلدادہ تھا۔ ایام جوانی میں آنکھیں، دل کا ساتھ دیتی ہیں۔ ہر چیز حسین اور دلفریب لگتی ہے۔ لہو میں گرمی اور جوش انسانی حواس کی ایک نہیں چلنے دیتے۔ بھرتری ہری بھی حسن و عشق کی رنگینیوں میں غرق نظر آتا ہے۔ اس دور کے گیتوں میں وہ حسن کا پجاری دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ پوجا جذباتی سطح پر ہے۔ ان گیتوں میں تفکر سے زیادہ جذبہ نمایاں ہے۔ اس دور میں جواں جذبے خوبرو حسینوں کی مدح سرائی میں سرشار نظر آتے ہیں۔ بھرتری ہری نے اس دور میں جو گیت لکھے ان میں، عورت کے حسن اور اس کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ جھلکتا ہے۔ وہ حسین عورت کی طاقت اور حسن کے جادو کا معترف ہے۔ اسے علم ہے کہ حسین و جوان عورت بڑے بڑے زیرک انسانوں کو سر کرسکتی ہے۔ ایک گیت نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجیے:

کیا عورت فی الحقیقت کمزور ہے؟
وہ شاعر سخن طراز، جو عورت کو کمزور کہتا ہے،
بلاشبہ، عورت کی فطرت سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے،

جس کی ایک نگاہ غلط انداز، اندر جیسے دیوتا
کو بھی مفتوح کر لیتی ہے ۲۷

بھرتری ہری کے دل و دماغ پر بھی کسی حسینہ کا قبضہ صاف نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''چراغ، آگ، ستارے، سورج اور چاند،
ان سب کے ہوتے ہوئے بھی، ایک آہو چشم حسینہ کے بغیر،
میرے لیے، دنیا تاریک ہے ۲۸

=====

بغیر لاگ لپٹ کے میں سچ کہتا ہوں
اسے غور سے سنیئے!
اس دنیا میں عورت سے بڑھ کر نہ کوئی راحت ہے اور نہ ہی
اس سے بڑھ کر کوئی تلخی اور اذیت کا باعث!'' ۲۹

=====

''چاند سا خوبصورت مکھڑا، کنول کو شرمانے والی مخمور آنکھیں
سونے کی چمک کو ماند کر دینے والا کندن سا جسم
بھنوروں سے بڑھ کر سیاہ گھنی زلفیں
طلائی کلس کی طرح چھاتیوں کا (زہد شکن) ابھار
ہاتھی کی سونڈ کی طرح خوشنما اور گداز رانیں
اور شیرینیٔ کلام،
یہ سب جوان دوشیزاؤں کے فطری جوہر ہیں
جو انسان کے دل و دماغ کو تسخیر کر لیتے ہیں'' ۔۳۰

بھرتری ہری، عورت کے حسن کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے گیتوں میں حسن کی مرصع سازی کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ اس کی نگاہوں میں عورت کا ایک ایک عضو کتنی خوبصورت تشبیہات کے ساتھ لہراتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسن اس کے لہو میں رقصاں ہے۔ بھرتری ہری حسن و عشق کے میدان میں بھی عقل و خرد سے بیگانہ نہیں ہوتا، گویا حسن کے دلفریب جلوؤں میں بھی اس کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں اور وہ مکمل حواس کے ساتھ حسن کا جلوہ دیکھتا ہے۔ بلکہ وہ حسن کی دھڑکنوں تک رسائی حاصل کر کے اس کی ''سوچ'' کو سر کرنے کا ہنر بھی رکھتا ہے۔

کیا عورت حقیقت میں کسی شخص سے محبت کرتی ہے؟
وہ بیک وقت ایک انسان سے باتیں کرتی ہے،
دوسرے کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہے،
اور تیسرے شخص کی یاد کو سینے سے لگائے رکھتی ہے ۳۱

محولہ بالا اشلوک میں بھرتری ہری ایک مشاق ماہر نفسیات دکھائی دیتا ہے۔ عورت کی نفسیات کے بارے میں اس کا مشاہدہ کس قدر گہرا اور بلیغ ہے۔ ''شرنگار شتک'' کو بھرتری ہری کے ایام جوانی کے گیتوں کا مجموعہ قرار دینا کسی حد تک درست سہی لیکن ان گیتوں میں محض حسن و عشق کی داستانیں ہرگز نہیں ہیں۔ ان گیتوں میں بھی وہ ایک سنجیدہ، حساس اور ذہین فنکار نظر آتا ہے۔ آخری دور کے افکار میں وہ دنیا کی دلدل سے بچنے اور حرص و ہوس سے دور رہنے کا درس دیتا ہے۔ اس فکر کے آثار اس کی ابتدائی شاعری میں بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ وہ حسن و عشق میں مست ہوتے ہوئے بھی، زندگی کے حقیقی حسن و سرور اور لطف سے بے گانہ نہیں لگتا۔ ایک گیت کا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

اے علم و فن کے پروانو، سچ بتاؤ!
تمہیں کون سی چیز پسند ہے..... شب و روز کسی دل نواز
حسینہ کے قدموں پر سر نیاز جھکائے رکھنا، یا دور بہت
دور، پہاڑوں کی گپھاؤں میں تن تنہا
یادِ خدا میں محو رہنا۔[۳۲]

اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ بھرتری ہری کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی فکر و شعور کے چراغ جا بجا جلتے نظر آتے ہیں۔ وہ حسن کی حقیقت سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ سچی خوشی لذت وصال میں ہرگز نہیں لیکن وہ حسن کے جادو اثر پر ایمان بھی رکھتا ہے۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ عقل، عشق سے شکست بھی کھا جاتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

عالم کے علم و فن کا چراغ محض اس وقت تک
روشن ہے۔ جب تک، کسی دلنواز حسینہ
کے دامنِ حسن کا جھونکا اس تک نہ پہنچے۔[۳۳]

اس کے گیتوں میں حسن و عشق کی دل آویز اور پر لطف تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو قاری کو روح تک سرشار کر جاتی ہیں:۔

''موسم سرما کی خوشگوار ہوا حسینوں کے ساتھ
اپنے خاوندوں کی سی خوش فعلیاں کرتی ہے
وہ ان کے بالوں کو بکھیرتی، آنکھوں کو موندتی
جامہ کو زور سے اڑاتی،
بدن میں کپکپی اور چال میں پھرتی پیدا کرتی اور
ٹھنڈک اور خشکی کے باعث لبوں سے
سوکھے پتوں کی طرح
''سی سی'' کی آواز پیدا کرتی ہے''[۳۴]

''تاریخ تمدن ہند'' کے مصنف محمد مجیب 'گپت عہد' کے ادب کا تذکرہ کرتے ہوئے بھرتری ہری کی رباعیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کی رباعیوں کی ایک ''شرنگار شتک'' کا موضوع مجازی عشق ہے، دوسرے 'نیتی شتک' کا دانش مندی

اور فن زندگی جب کہ تیسرا ''بیراگیہ شتک'' دنیا سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ ان رباعیات میں خیالات کا کوئی تسلسل نہیں وہ شاعر کے احساسات کا نچوڑ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی طبیعت سے نکل کر اسی طرح زبان پر آ گئی تھیں جیسے ہوا کی رطوبت سے پتوں پر اوس کی بوندیں''۔ ۳۵

پہلے مجموعے ''شرنگار شتک'' کی رباعیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد مجیب رقم طراز ہیں:

''مجازی عشق کی رباعیوں میں شاعر نے ایسی بے تکلفی برتی ہے کہ جس کے ہم عادی نہیں لیکن کہیں کہیں ضبط سے بھی کام لیا گیا ہے''۔ ۳۶

دوسرے مجموعے ''نیتی شتک'' میں بھرتری ہری نے فکر و دانش کے پھول کھلائے ہیں۔ اس مجموعے کے گیتوں میں وہ غور و فکر کرنے والے ایک ایسے شخص کی طرح سامنے آتا ہے جو زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اس دور کے گیتوں میں انسانی احساسات، تفکر اور جذبات کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ ان فکر انگیز افکار کے بارے میں محمد مجیب لکھتے ہیں:۔

''دوسرے مجموعے کی رباعیاں جواہر پارے ہیں انہیں پڑھیے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کی سوجھ بوجھ کا ایک زمانے میں کیوں اتنا چرچا تھا''۔ ۳۷

''نیتی شتک'' کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بھرتری ہری ایک عاشق سے مفکر بننے کا سفر طے کر رہا ہے۔ اس کی سوچ میں پختگی اور مکمل سنجیدگی در آتی ہے۔ جو پڑھنے والے کو بھی اپنے حصار میں لے لیتی ہے:۔

''جو انسان ادب اور موسیقی وغیرہ فنون سے محروم ہے،
وہ فی الحقیقت ایک حیوان ہے
گو اس کے سینگ اور دم نہیں
اور وہ گھاس کھائے بغیر زندہ رہتا ہے''۔ ۳۸

اس مجموعے میں فکر و دانش کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ بھرتری ایک علم دوست شخص تھا، علم کی اہمیت اور جہالت کے بارے میں اس کا نظریہ ''نیتی شتک'' میں نمایاں ہے۔

''مگرمچھ کے جبڑے سے موتی نکال لینا ممکن،
متلاطم سمندر کو تیر کر عبور کرنا آسان،
غضب ناک سانپ کو سر پر پھول کی طرح رکھ لینا سہل،
پر یہ ناممکن ہے کہ جاہل کے دل میں جاگزیں کسی خیال
کو ہٹایا جا سکے''۔ ۳۹

بھرتری ہری کے دوسرے مجموعے میں اس کے خیالات عشق و جنوں سے عقل و فکر کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ یہاں اس کی سوچ میں سنجیدگی اور پختگی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ بھرتری ہری جو عشق کی آگ کے آگے عقل و دانش کو کچھ نہیں سمجھتا تھا، اس کی آنکھیں کھلیں تو اسے یقین ہو گیا کہ صاحب علم حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کر سکتا اور آخر کو اسے اپنے اندر کی آواز پر کان دھرنے پڑتے ہیں۔ اور جو لوگ زندگی کی ''اصل'' سے آگاہ ہو جاتے ہیں ان کے لیے موت کا خوف کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ لالچ، حرص و ہوس،

حسن و دولت کی چمک سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ اپنے آپ سے آگاہ ہوتے ہوئے کائنات کے ''علم'' سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنے ہونے پر یقین ہوتا ہے اور خواب اور سراب زندگی یا عارضی خوشی کے لیے صراط مستقیم سے کبھی نہیں بھٹکتے۔

سیاست دان مذمت کریں یا تحسین،
دولت رہے یا چلی جائے، موت چاہے آج آ جائے
یا ایک جُگ کے بعد، لیکن حوصلہ مند لوگ
انصاف کے راستے سے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے۔[40]

بھرتری ہری سماج کی تلخ حقیقتوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ عدم مساوات کے حوالے سے غربت اور مفلسی کو سب سے بڑا عیب قرار دیتا ہے۔ معاشرتی ناہمواریوں کے سلسلے میں اس کا مشاہدہ اور طنز کی کاٹ ملاحظہ ہو۔

''دولت ہی تمام صفات کا ملجا و ماوا ہے
جو زردار ہے، وہی عالی نسل ہے
وہی ہنر ور مرجع خلائق، فصیح الزماں
اور دیکھنے کے لائق انسان ہے
اور بے زر کا ہر ہنر اور جوہر
ایک ناقابل معافی گناہ''۔[41]

ان افکار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آج کے عہد کی باتیں ہیں۔ غربت آج بھی ایک لعنت اور طعنہ ہے۔ آج بھی دولت مند کا ہر عیب، ہر جرم دولت کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔ ان مصرعوں میں بھرتری ہری ایک ترقی پسند فنکار نظر آتا ہے۔ جو اپنے عہد کی تلخیاں اپنے فن میں سمونے کے فرض سے آشنا ہے۔ بھرتری ہری ایک حساس اور دردمند انسان تھا اور کوئی بھی حساس اور دردمند شخص زندگی کے دکھوں اور دوسروں کے آرام پر بے نیاز نہیں رہتا۔ اس نے اپنی شاعری کے ذریعے سے فکر و شعور کے وہ چراغ روشن کیے ہیں جو قلب و اذہان کو منور و معطر کرتے ہیں:۔

اندریاں (حواس) وہی، نام وہی، وہی تیز فہمی،
اور وہی خوش کلامی لیکن جائے حیرت ہے کہ صرف دولت
کے ہاتھ سے چلے جانے کے بعد وہی انسان
کچھ سے کچھ بن جاتا ہے''۔[42]

بھرتری ہری کے ان جواہر پاروں میں ہمارا ''آج'' دھڑکتا نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ موجودہ دور کا کوئی شاعر اپنے اردگرد کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ نیتی شتک میں جہاں علم و حکمت کے ہیرے موتی ہیں وہاں شاعرانہ حسن بھی نمایاں ہے:

''اور کبھی کمزوری حسن آفریں معلوم ہے!
تراشا ہوا ہیرا، فاتح جنگ، زخموں سے نڈھال بہادر،
مستی سے اترا ہوا ہاتھی، موسم خزاں کی خشک ریتلی ندی،
دوسری عید کا چاند، محبت اور خدمت سے تھکی ہوئی جوان عورت،

زیادہ خیرات سے بے زرراجہ،
ان سب کی کمزوری ہی ان کا زیور ہے''۔۴۳

ایک اور مثال دیکھیے:

''خاموشی ایک بیش بہا عطیہ ہے
جو فیاض قدرت نے انسان کو بخشا ہے،
یہ جہالت کا ڈھکنا (غلاف) ہے،
بلاشبہ عالموں کی صحبت میں نادانوں کی خاموشی
ایک لاجواب زیور ہے''۔۴۴

بھرتری ہری کے آخری اور تیسرے مجموعے ''ویراگ شتک'' میں بھرتری ہری، زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے ہونے کے راز سے آگہی کا سفر اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ حرص وہوس اور دکھوں کے گھر، اس دنیا کو خیرباد کہہ کر فطرت کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا ہے۔ وہ اندر کی خوبصورتی کو فطرت میں محسوس کر کے زندگی کی ''اصل'' سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ کائنات کے راز میں شریک ہو کر چپ سادھ لیتا ہے۔ اس کی زندگی کا آخری دور نہایت فطری انداز میں گزرا۔ گنگا کے کنارے کی ریت، اپنی بانہوں کا تکیہ، جنگلی جانوروں اور پرندوں سے دوستی، چاندنی راتیں، خاموش فضائیں، گنگناتی ہوائیں، اس کی روح میں رقص کناں رہیں اور وہ انسانوں کے لیے فطرت کے مقاصد کو گیتوں اور اشلوکوں کا روپ دیتا رہا۔ شاعری کے اس حصے میں بھرتری ہری نے علم وحکمت و دانش کے دریا بہا دیئے ہیں۔ اس نے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں زندگی کی کہانی کو حواس کے اعلیٰ معیار کے ساتھ بیان کیا۔ بھرتری ہری کے نزدیک غفلت موت سے بھی بدتر ہے۔ وہ 'وقت' کو سب سے بڑا خزانہ قرار دیتا ہے۔ وہ دنیا کی بے ثباتی کو ہر پل بیان کر کے انسان کو جھنجھوڑتا رہتا ہے۔

''ہر صبح وشام، ہماری زندگی کے گنتی کے دنوں کو
گھٹاتے رہتے ہیں۔ ہمیں دنیا کے کام دھندوں میں
لگے رہنے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وقت کب اور کیونکر گزر گیا
پیدائش، بڑھاپا، مصیبت اور موت دیکھ کر بھی انسان کو
اپنی حالت کا احساس نہیں ہوتا (معلوم یہ ہوتا ہے کہ)
دنیا غفلت کی شراب سے مخمور اپنی حقیقت سے بے خبر ہو چکی ہے''۔۴۵

بھرتری ہری کے ہاں، زندگی کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کا ''احساس'' نمایاں ہے۔ وہ آپا دھاپی کی اس دنیا سے الگ اپنی آرزو کے مطابق تنہائی کی کٹیا میں سادہ زندگی بسر کرنے کا تمنائی ہے۔ اس نے اپنی اس آرزو کو عملی جامہ پہنایا۔ وہ ''سکون'' کے معانی سے آگاہ ہے اور سکون وطمانیت ہی کو سب سے بڑی دولت قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دولت کسی دولت سے خریدی نہیں جا سکتی۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اگر سکون قلب میسر نہ ہو تو انسان کی زندگی دوزخ سے بھی بدتر بن جاتی ہے۔

بھرتری ہری فقر کی زندگی کو حیات حقیقی قرار دیتا ہے۔ اس کا نظریہ حیات دیکھیے:

''فقیر زمین کے فرش پر سو کر، اسی خواب شیریں کا مزہ لیتا ہے جو راجاؤں کو نرم خوشنما سیج پر ملتا ہے۔ فقیر کا

بازو نرم سرہانا، کھلا آسمان شامیانہ، مہکی ہوا پنکھا، اور آسمان میں جگمگاتا ہوا چاند قندیل کا کام دیتا ہے۔ وہ بیراگ کی رفیقۂ حیات کی گرم آغوش میں وہی مسرت حاصل کرتا ہے جو شہنشاہ کو اپنی ملکہ کے وصال سے ہوتی ہے''۔ ۴۶

فطرت سے ہم آہنگ و ہم رنگ ہونے والے ہر حال میں ''راضی'' رہتے ہیں۔ وہ تسلیم و رضا کا تاج سروں پر سجائے فرش پر بیٹھے عرش نشیں ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں بھرتری ہری ایک گیت میں لکھتا ہے:

''مبارک ہیں وہ لوگ جو پہاڑوں کی گپھاؤں میں
بیٹھ کر عظیم روشنی (خدا) کا دھیان کرتے ہیں
اور ان کے چہروں پر سے خوشی کے ڈھلکے ہوئے آنسو
پرندے پیتے ہیں جو بے خوف ہو کر ان کی
گود میں جا بیٹھتے ہیں''۔ ۴۷

زندگی ایک عظیم راز ہے انسان اپنے سفر پر تدبر کرے تو اپنے نقطۂ آغاز تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ دنیا تفریح گاہ نہیں۔ اس میلے میں گم ہونے والے کہیں کے نہیں رہتے۔ بھرتری ہری کے افکار لہو میں روشنی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں:

''آغاز میں ماں کے بطن میں انسان سکڑا ہوا
تکلیف کی حالت میں لٹکا رہتا ہے
عالم شباب میں اپنی محبوبہ کی مفارقت میں رنج و غم سے
ہمکنار ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں جوان اور خوبصورت
عورتوں کی پھبتیاں سہتا ہے۔
اے انسان! بتا تو سہی، کیا دنیا میں ایسی چیز
بھی ہے جو تجھے خوشی دے سکے''۔ ۴۸

اس گیت میں بھرتری ہری نے انسانی زندگی کے مختلف مدارج بیان کرتے ہوئے اسے سنجیدہ کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ دنیا میں جو لوگ اپنی 'اوقات' اپنی پرواز کا علم رکھتے ہیں۔ وہ نخوت کی گرد سے دامن بچائے رکھتے ہیں۔ بھرتری ہری کا خیال ملاحظہ کیجیے:

''جن پر حقیقت کا انکشاف ہوا اور جنہوں نے
برہم کو پہچان لیا، ان کے لیے دنیا کوئی کشش نہیں رکھتی
سمندر کے پانی میں مچھلی کے چلنے پھرنے سے کوئی
لہر پیدا نہیں ہوتی''۔ ۴۹

======

''کہیں نغمہ شادی ہے اور کہیں نوحۂ غم،
کہیں علم و ادب کے چرچے ہیں اور کہیں شرابیوں کا شور و غل،

کہیں عورتوں کے حسن و شباب کی رنگینی ہے اور کہیں
کریہہ منظر کوڑھ سے گلے ہوئے جسم!
نہ جانے یہ دنیا آب حیات سے بھری ہے یا زہر ہلاہل سے''۔۵۰

======

کاش میں کسی مقدس جنگل میں
خدا کے نام کا ورد کرتا ہوا، اپنی زندگی کے دن بتا دیتا
کاش میں ان سب کو یکساں سمجھتا..... سانپ اور گلے کا ہار،
جان لیوا دشمن اور عزیز دوست، چمکتا ہوا ہیرا اور مٹی کا ڈھیلا،
پھولوں کی سیج اور پتھر کی سخت چٹان، حقیر تنکا اور دلآویز دوشیزہ''۵۱

بھرتری ہری کے آخری دور کے گیت ہمیں زندگی کی اصل سے آگاہ کرتے ہیں۔ سچی شاعری پھولوں کی خوشبو کی طرح دل میں اتر جاتی ہے اور وہ رگ و پے میں ایک روشنی کر دیتی ہے۔ بھرتری ہری کے افکار روشنی کے مینار کی طرح رہتی دنیا تک یونہی انسان کو اس کی حقیقت سے روشناس کرتے رہیں گے۔ اور مضمون کا خاتمہ "An Anthology of World Poetry" کے مصنف کے اس اقتباس پر کرتا ہوں کہ:

''مختصر گیتوں کے کہنے میں ہندوؤں کو فوقیت حاصل ہے ان کے ہاں بندش کی چستگی، تخیل کی بلند پروازی احساسات کی گہرائی اور لطافت تمام دل پذیر ہیں۔ ایسے بہت سے گیت لکھنے والوں میں بھرتری ہری کا مقام سب سے بلند ہے''۔۵۲

حواشی.....حوالہ جات

۱۔ بھرتری ہری کے عنوان سے یہ کتاب ۱۹۴۰ء میں لکھنو اور پھر ۱۹۵۹ء میں الہ آباد (بھارت) سے شائع ہوئی۔ بھرتری ہری کے کلام کا یہ اردو ترجمہ جے کرشن چودھری نے کیا۔ اس کا دیباچہ تلوک چند محروم نے جبکہ پیش لفظ جوش ملیح آبادی نے تحریر کیا۔
۲۔ ضمیر حسین رضوی، مقالہ بعنوان IQBAL AND BHARTARIHARI پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۸۱۔۹۵
۳۔ محروم، تلوک چند دیباچہ بھرتری ہری، الہ آباد، ادارہ انیس اردو، ۱۹۱۳ء، ص ۸/۷
۴۔ جے کرشن چودھری، بھرتری ہری، ص ۱۱
۵۔ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند، لاہور، پروگریسو بکس ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۶
۶۔ بھرتری ہری شتک، لاہور، گیلانی الیکٹرک پریس، ۱۹۱۳ء، ص ۲۴
۷۔ بھرتری ہری، گورکھ ناتھ کا شاگرد نہیں تھا بلکہ متیندر ناتھ نامی فقیر کا شاگرد تھا جو گورکھ ناتھ کا بھی استاد تھا۔ (بھرتری ہری شتک ص ۳۱)
۸۔ یوسف سلیم چشتی، شرح بال جبریل، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، بار دوم
۹۔ بھرتری ہری شتک، ص ۲۴
۱۰۔ جے کرشن چوہدری نے اپنی کتاب ''بھرتری ہری'' میں ملکہ (پنگلہ) کا نام انگ سینا لکھا۔
۱۱۔ جے کرشن چودھری ''بھرتری ہری'' ص ۱۴۔۱۵
۱۲،۱۳۔ اختر، گوری شنکر لال، بھرتری ہری شتک، ص ۳۱۔۳۲

۱۴ جے کرشن چودھری ''بھرتری ہری''، ص ۱۲
۱۵ اختر، گوری شنکر لال، دیباچہ بھرتری ہری شتک، ص ۹
۱۶ ایضاً، ص ۱۸_۱۹
۱۷ بھرتری ہری، مترجم گوری شنکر لال اختر، مشمولہ بھرتری ہری شتک، ص ۳۶
۱۸ بھرتری ہری، مترجم جے کرشن چودھری مشمولہ بھرتری ہری، ص ۴۵
۱۹ بھرتری ہری، مترجم گوری شنکر لال اختر مشمولہ بھرتری ہری شتک ص ۳۷
۲۰ بھرتری ہری، مترجم جے کرشن چودھری، مشمولہ بھرتری ہری، ص ۴۷
۲۱ اقبال، علامہ محمد، بال جبریل، ابندرونی سرورق
۲۲ بھرتری ہری، مترجم گوری شنکر لال اختر مشمولہ بھرتری ہری شتک ص ۱۹۵
۲۳ بھرتری ہری، مترجم جے کرشن چودھری مشمولہ بھرتری ہری، ص ۸۱
۲۴ ایضاً، مترجم گوری شنکر لال اختر مشمولہ بھرتری ہری شتک، ص ۸۶
۲۵ ایضاً، مترجم جے کرشن چودھری، بھرتری ہری، ص ۲۷
۲۶ جوش ملیح آبادی، پیش لفظ بھرتری ہری، ص ۵_۶
۲۷ بھرتری ہری، مترجم جے کرشن چودھری مشمولہ بھرتری ہری، ص ۲۱
۲۸ ایضاً، ص ۲۲
۲۹تا۳۴ ایضاً، ص ۲۴
۳۵تا۳۷ محمد مجیب، تاریخ تمدن ہند، لاہور، پروگریسو بکس، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۷
۳۸ بھرتری ہری، ص ۴۴
۳۹ ایضاً، ص ۴۵
۴۰ ایضاً، ص ۵۰
۴۱ ایضاً، ص ۵۳
۴۲ ایضاً، ص ۵۴
۴۳ ایضاً، ص ۵۴
۴۴ ایضاً، ص ۵۴
۴۵ ایضاً، ص ۷۰
۴۶ ایضاً، ص ۸۸
۴۷ ایضاً، ص ۹۳
۴۸ ایضاً، ص ۹۵
۴۹ ایضاً، ص ۱۰۰
۵۰ ایضاً، ص ۱۰۱
۵۱ ایضاً، ص ۱۰۲
۵۲ آرتھر۔ڈبلیو۔رائیڈ Anthology of World Poetry, (Edited by M.V.Doren Casse)

پروفیسر محمد حسن الاعظمی الازہری

محمد حمزہ فاروقی

۱۹۶۲ء میں میں جب کالج میں زیر تعلیم تھا تو اس وقت عربی سیکھنے کی دھن سمائی۔ اس ضمن میں جن عجیب وغریب تجربات سے واسطہ پڑا، ان کا تذکرہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ جب جذبہ شدید اور ''خود ناشناسی'' عام ہو تو ان کا امتزاج عجب گل کھلاتا ہے۔

ان دنوں پروفیسر حسن الاعظمی بندر روڈ پر واقع اورنگزیب مارکیٹ کے چند کمروں میں عربی کا چراغ روشن کیے ہوئے تھے۔ یعنی عربک کالج قائم کیے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب روایتی انداز سے ہٹ کر ڈائریکٹ میتھڈ کے ذریعے سے عربی بولنا اور لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے اور اس ضمن میں انہوں نے بہت سے اچھوتے اور منفرد تجربات کیے تھے۔ نصابی ضرورت کے لیے خود کتابیں لکھیں اور چھپوائیں۔

اعظمی صاحب کی شخصیت دلچسپ اور باغ و بہار تھی۔ پڑھانے کا انداز بھی روش عام سے ہٹ کر تھا۔ ان کی تدریس کے ''جمہوری'' انداز میں طلبہ کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا اور وہ عربی کو پٹری سے اتار کر ادھر ادھر کی باتوں میں پیریڈ تمام کر دیتے۔ مثلاً عربی میں جملہ بنواتے ہوئے آپ اس میں طلبہ کے والدین کو شامل کر دیتے۔ جب تک ان بے چاروں کی عربی کمزور اور اخلاق مضبوط رہتا، وہ پروفیسر صاحب کے احکامات کی بے چوں و چرا تعمیل کرتے رہتے لیکن جب اخلاقی بندھن کمزور اور عربی ''مضبوط'' ہوتی تو طلبہ اپنے جملوں میں پروفیسر صاحب کے والدین یا دیگر رشتہ داروں کو داخل کر دیتے۔ آپ اس پر ہنس دیتے اور فرماتے کہ اس طرح ان کم بختوں کو صحیح عربی بولنی تو آ گئی۔

سبق کے دوران بیتے ہوئے واقعات یا وہ زمانہ جو انہوں نے مصر یا الازہر میں بسر کیا تھا، کا تذکرہ بھی جاری رہتا۔ خود تو ادھیڑ عمر کے ہونے کے باوجود غیر شادی شدہ تھے لیکن ان طلبہ کو جو اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر جانا چاہتے تھے، حسینانِ مصر کے چلتروں سے بچنے کی تلقین فرماتے لیکن اس نصیحت میں بھی ترغیب و تحریص پوشیدہ ہوتی۔ میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ مصر یا الازہر میں اعلیٰ تعلیم کے حصول سے نازنینان مصر کا کیا تعلق ہے؟ جواب میں فرمایا کہ تعلق تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتا لیکن ان کا تصور دل مرد مومن کو زندہ رکھتا ہے اور تذکرے سے دل ''پشوری'' ہو جاتا ہے۔ ویسے اعظمی صاحب کی حسینان مصر سے متعلق معلومات قصہ یوسف و زلیخا اور داستان قلوپطرہ تک محدود تھیں ورنہ عملی زندگی میں آپ بہت سادہ اور معصوم انسان تھے۔ آپ عظیم آدمی تھے۔ منافقت اور مصلحت اندیشی سے بہت دور تھے۔ جو دل میں ہوتا فوراً زبان پر آ جاتا۔

میری تاریخی معلومات اسلامی ناول نگاروں کی دین تھیں۔ اللہ جانے ان پر یہ بیش بہا معلومات کہاں سے نازل ہوئی تھیں۔ ناول کے ہیرو جذبہ جہاد اور جذبات عشق سے سرشار ہوتے اور ہیروئنیں خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم دل ہتھیلی پر رکھتی تھیں۔ ان ناولوں کا مجھ پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا۔ چنانچہ اکثر یہ شعر گنگنایا کرتا تھا:

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
محلے میں دو لڑکیاں اور بھی ہیں

''انارکلی'' ڈرامے کا دل پر بہت اثر ہوا۔ دماغ سے کام لینے کا اس زمانے میں رواج نہ تھا۔ شہزادہ سلیم کے عشق صادق اور انارکلی کی وفاداری نے تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے پہروں رلوایا۔ دلیکن ''دل آرام'' کو میں متعصب ہندو سمجھتا تھا جو دو پیار بھرے دلوں کو ملنے نہ دیتا اور لگائی بجھائی کے ذریعے ان کے عشق کی راہ میں کانٹے بچھاتا تھا۔ فلم مغل اعظم دیکھی تو اس غلط فہمی کا ازالہ ہوا اور پتا چلا کہ دلیکن دراصل مسلمان کنیز تھی، جس کا نام ''دلآرام'' نہیں دل آرام تھا۔

میں انارکلی (مدھوبالا) کے حسن اور شہزادہ سلیم (دلیپ کمار) کی مردانگی اور جرأت جس کا اظہار پردہ فلم پر ہوا تھا، بہت متاثر تھا۔ فلم سے حاصل کردہ معلومات مع ذاتی اضافہ جات کا اظہار جب میں نے عربی کلاس میں کیا تو اعظمی صاحب نے فرمایا کہ ''شہزادہ سلیم بہت نالائق تھا۔ عاشقی، معشوقی کے چکر میں پڑ کر عربی میں فیل ہو جاتا اور باپ کے خلاف بغاوت کے منصوبے بناتا تھا''۔

عربی کے امتحان میں فیل ہونے کا انکشاف میرے لیے حیرت اور صدمے کا موجب تھا کیونکہ میرے نزدیک شہزادوں کو عشق کے امتحان کے سوا کسی امتحان سے واسطہ نہ ہونا چاہیے۔ اب اس نوعیت کی عربی تدریس سے میں کچھ حاصل نہ کر سکا تو یہ میرا اپنا قصور تھا، اعظمی صاحب کا اس میں ''عمل دخل'' نہ تھا۔ ان کے دو ہی مقاصد تھے، عربی کی ترویج و اشاعت اور اتحاد اسلامی کے لیے جدوجہد۔ کراچی میں ۱۹۴۹ء میں مؤتمر اسلامی کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اعظمی صاحب اس زمانے میں مؤتمر سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اس کانفرنس کے انعقاد اور کامیابی کے لیے بھرپور کوشش کی۔ کانفرنس کے دوران عرب مندوبین کے لیے ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ اس زمانے میں لیاقت علی خان پاکستان کے وزیراعظم تھے۔ اس مؤتمر میں سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین بھی شریک ہوئے۔

اس وقت ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ وزرا اور سیاسی قائدین قومی خدمت اور ملک کو ترقی دینے کے جذبے سے سرشار تھے۔ اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں بھی بیشتر سیاست دان مخلص تھے۔ اعظمی صاحب قائدین کے نزدیک آ گئے اور انہوں نے ان حضرات کو عربی سیکھنے کی افادیت سے آگاہ کیا۔ سردار عبدالرب نشتر، فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جو مرکزی کابینہ میں وزیر تھے، اعظمی صاحب سے عربی سیکھنے لگے اور یہ سلسلہ چند ماہ تک جاری رہا۔

عربی کے سلسلے میں اعظمی صاحب کا غلو اس قدر تھا کہ انہوں نے عربی کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان بنانے کی تجویز پیش کی۔ آپ نوجوانی میں جب قاہرہ پہنچے تو چند ماہ میں مصری عربی سیکھ لی اور بلا تکلف بولنے لگے۔ اس تجربے کے بعد آپ کا یہ پختہ یقین تھا کہ چند ماہ کی تدریس کے بعد نہ صرف معمولی تعلیم یافتہ افراد بلکہ پوری قوم عربی سیکھ سکتی تھی اور اگر اتنے جتن کے باوجود بھی قوم عربی ناشناس رہتی تو یہ اس کی نااہلیت تھی۔

عربی کو قومی زبان بنانے کے لیے اسٹیٹ بنک کے گورنر زاہد حسین بھی اعظمی صاحب کے ہم خیال تھے۔ وہ تو شکر کیجیے کہ مولوی عبدالحق اور دیگر اصحاب نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔

اعظمی صاحب بہت دنوں تک مؤتمر عالم اسلامی کے پلیٹ فارم سے اتحاد اسلامی کے لیے کوشاں رہے لیکن چونکہ سیاسی آدمی نہ تھے اس لیے زیادہ کامیاب نہ تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب ایران میں وزیراعظم ڈاکٹر مصدق نے تیل کی صنعت کو قومیانا اور ایرانیوں کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہا تو ان کے خلاف سامراجی قوتیں اور شاہ سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ اعظمی صاحب نے حقائق معلوم کرنے کے لیے مؤتمر کی جانب سے انعام اللہ خاں صاحب کو ایران بھیجا۔ ایران سے واپسی پر خان صاحب نے ''ایران جاگ اٹھا'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں ڈاکٹر مصدق کی پالیسی کی تائید کی گئی تھی۔

ابتدا میں خاں صاحب اور اعظمی صاحب میں اشتراک مقاصد کی بنا پر خوب نبھی لیکن بعد میں اختلافات ابھرے اور دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں۔ انعام اللہ خاں صاحب اعلیٰ سیاسی بصیرت اور انتظامی صلاحیت رکھتے تھے اور مسلم ممالک کے حالات اور مسائل سے زیادہ واقف تھے اس لیے ان کی مؤتمر اسلامی نے فروغ پایا اور باضابطہ طور پر بین الاقوامی ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ وہ ان چند

مسلم انجمنوں میں سے ایک ہے جسے اقوام متحدہ بھی تسلیم کرتی ہے۔ اعظمی صاحب فروغ عربی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ آپ نے ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ سے قبل عربی سیکھنے پر زور دیا تھا، جب دنیا تیل کے بحران سے اور عرب دنیا تیل کے انقلاب سے ہونے والی خوش حالی سے ناآشنا تھی۔ آپ عربی کو عالم اسلام کی اتحاد و یگانگت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔

اعظمی صاحب کا آبائی وطن تو اعظم گڑھ تھا لیکن آپ نے زندگی کا خاصا حصہ حیدر آباد دکن اور لاہور میں گزارا تھا۔ جامعہ ازہر سے آپ نے عربی میں ڈاکٹریٹ کیا تھا اور کچھ عرصے تک قاہرہ میں مصریوں کو اردو پڑھاتی تھی۔ آپ نے اردو اور عربی میں دو سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کی تھیں۔ انہوں نے ایک عربی اردو لغت بھی مرتب کی تھی۔ ان کے ایک عزیز کی لارنس روڈ پر چڑیا گھر کے نزدیک اعظمی بک ڈپو کے نام سے کتابوں کی دکان تھی۔ اعظمی صاحب کی بیشتر کتابوں کی ترسیل و اشاعت کا مرکز یہ دکان تھی۔

اعظمی صاحب نے نصابی ضرورت کے تحت قرآنی قصص آسان عربی میں لکھے تھے۔ ان کا مذہب کا مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا لیکن وہ کبھی مذہبی مباحث یا فرقہ واریت کے جھگڑوں میں نہ پڑے تھے۔ سچ پوچھیے تو ان کا مذہب عربی زبان تھا۔ وہ طلبہ سے بہت معمولی فیس لیتے تھے۔ ان کی شفقت اور خلوص کو دیکھتے ہوئے نالائق طالب علم بھی طوعاً و کرہاً عربی سیکھ لیتا تھا۔ ایک صاحب نے تو آپ کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی تھی اور کراچی میں رہتے ہوئے جامعہ ازہر سے ڈگری لی تھی۔

میں جب ان سے ملا اور ان سے عربی پڑھی تو ان کو بہت سادہ وضع قطع میں پایا۔ ان کا جسم بھاری، رنگت گندمی اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ عموماً قمیص، پتلون یا بش شرٹ میں ملبوس ہوتے۔ کسی تقریب میں شرکت کے وقت شیروانی اور پاجامے کو زحمت دی جاتی۔ اعظمی صاحب جیسے خود ''استری'' سے بے نیاز رہے، ویسے ہی ان کے کپڑے بھی استری سے بے نیاز رہتے تھے۔ دعوتوں میں کبھی اکیلے نہ جاتے بلکہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کے ساتھ شریک ہوتے۔ ان کے احباب ہمیشہ ان کے استقبال کے لیے تیار رہتے لیکن کبھی اگر ہجوم دوستاں جلوس کی شکل اختیار کر لیتا تو میزبانوں کی پریشانی دیکھنے کے لائق ہوتی۔

عربی سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ آپ بعض اردو الفاظ جن کی اصل عربی تھی، کا مروجہ مفہوم قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے بلکہ عربی معنی پر زور دیتے تھے۔ مثلاً ''انتقال کرنا'' آپ کے نزدیک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا تھا۔ اسی طرح ''نیک ہونا'' ان کے نزدیک سخت معیوب بات تھی۔ وہ ''نیک'' کا رشتہ ''ناک'' سے جوڑتے تھے۔ ان کی باتیں سن کر لوگ ''انتقال کرنے'' سے ڈرتے نہ تھے اور ''نیک چلن'' اختیار نہ کرتے تھے، حالانکہ اردو میں ''نیک'' فارسی سے آیا تھا۔

۱۹۶۱ء میں دارالحکومت کراچی سے ''انتقال'' کر چکا تھا۔ اعظمی صاحب اس ''انتقال پر ملال'' کے مخالف تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ کراچی کو قائد اعظم نے بطور دارالحکومت منتخب کیا تھا۔ بنگالی بھی اس پر رضامند تھے لیکن اسلام آباد کے انتخاب سے بنگالیوں کو اجنبیت کا احساس ہوگا۔ وہاں کی آب و ہوا ان کے لیے ناموافق ہوگی۔ اس طرح ملک کے ان دونوں حصوں میں بیگانگی بڑھے گی۔

میں چند ماہ تک اعظمی صاحب کا شاگرد رہا، پھر مکروہات زمانہ نے عربی سیکھنے کے جذبے کو سلا دیا۔ برسوں بعد ۱۹۶۶ء میں آپ چند مصری دوستوں کے ساتھ کراچی یونیورسٹی تشریف لائے تو میں نے آپ کا استقبال کیا اور اپنے ساتھیوں سے آپ کا تعارف کرایا۔ تعارف کے دوران میں نے عرض کیا کہ پروفیسر صاحب نے دو سو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ نے فوراً میری تصحیح کی اور کتابوں کی اصل تعداد بتائی۔ اس واقعہ کے بعد آپ سے ملنے کے مواقع نہیں ملے۔ ان کی علمی خدمات اور عربی زبان و ادب سے لگاؤ قابل قدر تھا۔

عشق کتاب

اسلم کمال

سیالکوٹ شہر سے کوئی دو میل کے فاصلے پر شمال مغرب میں گوہد پور، مراد پور اور چٹی شیخاں نام کے دیہات ہیں۔ ان تینوں کے درمیان بننے والی تکون کے اندر کور پور نام کا ایک گاؤں ہے۔ آج سے ساٹھ سال قبل یہ چاروں گاؤں ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر اپنی اپنی علیحدہ حد بندیوں کے ساتھ آباد تھے۔ گوہد پور، کور پور اور چٹی شیخاں کو کلووال روڈ مراد پور سے جدا کرتی تھی۔ جبکہ چٹی شیخاں کو ان سب سے علیحدہ نالہ پلکھو کرتا اور مراد پور اور گوہد پور کو کور پور اور چٹی شیخاں سے علیحدہ ڈیفنس روڈ کر دیتی تھی، لیکن آج کی صورت حال میں یہ فرق کرنا ناممکن ہو گیا ہے کہ یہ تینوں دیہات آپس میں کہاں ملتے اور کہاں جدا ہوتے ہیں؟

اس وقت کور پور کے مشرق میں قدرے نشیب میں پانی کا ایک جوہڑ تھا۔ یہ ڈھاب کہلاتا تھا۔ اس کے پانی کی تہ میں مٹی چکنی تھی اور گاؤں کی سلیقہ مند عورتیں اس مٹی سے اپنے گھروں کی لیپا پوتی کرتی تھیں۔ مغرب میں شہداوالی خانقاہ کے دو اطراف میں ایک جوہڑ تھا جس کا پانی کالا سیاہ تھا اور اس پانی کو گہرے سبز رنگ کے پتوں اور کاسنی پھولوں والے ایک آبی پودے کی آنکھوں کو طراوت بخشنے والی بہتات سارا سال ڈھانپے رکھتی تھی۔ اس میں گاؤں کے وہ نوجوان جو بے روزگار ہوتے تھے، کبھی کبھی کانٹے یا جال سے مچھلیاں پکڑتے نظر آتے تھے۔ کور پور کے جنوب میں ایک اور چھپڑ تھا جس کا پانی نہ زیادہ صاف اور نہ بہت زیادہ گدلا ہوتا تھا۔ یہ فقیراں والا چھپڑ کہلاتا تھا۔ اس میں عموماً لوگ مویشیوں کو پانی پلاتے اور نہلاتے نظر آتے تھے۔ اس چھپڑ کے مغرب میں گاؤں کا قبرستان ہے جس کے لیے مختص جگہ اس وقت اتنی زیادہ تھی کہ درمیان میں قبریں اور اطراف میں میدان تھے۔ ان قبروں میں بیری کے درخت تھے جن پر بڑے میٹھے بیر لگتے تھے اور ان قبروں کی دیکھ بھال کے لیے آمدن کا ایک ذریعہ بھی تھے۔ قبرستان کے میدانوں میں اس گاؤں کے لڑکے گلی ڈنڈا اور فٹ بال کھیلتے تھے۔ پاس سے کلووال روڈ گزرتی تھی، جو اس زمانے میں دریائے چناب پر مرالہ ہیڈ ورکس کو جانے کے لیے واحد راستہ تھا۔ اس گاؤں کے لوگ سادہ اور ان پڑھ تھے۔ کیونکہ تعلیم کی روشنی کی اکا دکا کرنیں ہی ابھی تک بمشکل تمام ان دیہات تک پہنچ پائی تھیں۔ اس گاؤں کے کچھ لوگ شہر سیالکوٹ میں محنت مزدوری کرنے جاتے، کچھ سیالکوٹ چھاؤنی میں مالی کا کام کرتے، زیادہ تر لوگوں کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی زمینداری تھی جس سے وہ اپنا پیٹ پالتے تھے۔

کور پور میں ایک گھر ایسا تھا جس کے پاس زمین کا کوئی ٹکڑا نہ تھا۔ اس گھر کا سربراہ چوہدری قاسم علی بن حسن محمد بن عمر بخش تھا۔ چوہدری قاسم علی کا ایک بیٹا تھا جس کا نام مولوی محمد شفیع تھا۔ وہ پرائمری پاس تھا اور سیالکوٹ شہر میں کھیلوں کا سامان تیار کرنے والی ایک فیکٹری میں منشی تھا۔ مولوی اس لیے کہلایا کہ گاؤں بھر میں لوگوں کے خط لکھتا، ان کے نام آئے ہوئے خطوط پڑھ کر سناتا، بیاہ شادیوں کے بھی کھاتے پُر کرنے کے علاوہ شہر سے روزانہ کی تازہ خبریں لانا یہ وہ امور تھے جو وہ رضا کارانہ طور پر سرانجام دیتا تھا اور انہی کے باوصف گاؤں کے مرد و زن اور پیر و جواں اس کے لیے اپنے دلوں میں خاص عزت و احترام رکھتے

تھے۔ عشا کی نماز کے بعد چوہدری قاسم علی کے گھر کوئی چائے بنتی۔ اس گاؤں کے واحد حاجی جن کا نام چراغ دین تھا اور حاجی چراغ دین کہلاتے تھے اور چوہدری قاسم علی کے کزن تھے، ان کی صدارت میں ایک محفل جما کرتی تھی جس میں مولوی محمد شفیع شہر میں گردش کرتی تازہ خبریں سناتے۔ جو عموماً مسلم لیگ، کانگرس اور احرار کی سرگرمیوں کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔ مولوی محمد شفیع کا بڑا بیٹا عبدالعزیز لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج سے بی اے بی ٹی کر رہا تھا۔ اس کے خطوط میں بھی لاہور کی سیاسی فضا کے بارے میں کوئی نہ کوئی اہم خبر ہوا کرتی تھی۔ اس کا خط اس کا چھوٹا بھائی محمد صدیق پڑھ کر سناتا۔ چائے کا دور چلتا۔ اس کے بعد کوئی سیاسی خبر، کوئی دینی مسئلہ یا گاؤں کا کوئی حل طلب معاملہ زیر بحث آتا۔ حاجی چراغ دین، چوہدری قاسم علی اور مولوی محمد شفیع اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق جو حل پیش کرتے، لوگ اسے صدق دل سے تسلیم کر لیا کرتے تھے۔ اس محفل میں جس کا جی چاہتا آ سکتا تھا اور بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ کئی لوگ محض چائے کی پیالی پینے چلے آتے تھے۔

کور پور میں اکثر گھر مٹی گارے کے بنے ہوئے تھے۔ چوہدری قاسم علی کا گھر بھی گارے کا بنا ہوا تھا۔ اس میں پکی اینٹ کے دو کمروں کا اضافہ مولوی محمد شفیع نے کیا تھا۔ ایک کمرے کو بیٹھک بنایا گیا تھا۔ روزانہ رات کی محفل اس کمرے میں جمتی تھی۔ اس بیٹھک میں دو بڑی چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ جن پر سفید چادریں پڑی ہوتیں۔ باہر کی دیوار کے ساتھ والی چارپائی پر حاجی چراغ دین دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ ان کے پاس چوہدری قاسم علی اور ان کا بیٹا مولوی محمد شفیع بیٹھتے اور مولوی محمد شفیع کا بیٹا محمد صدیق مٹی کے دیئے کی روشنی میں کوئی اخبار رسالہ کتاب یا خط وغیرہ جو اسے پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا وہ پڑھا کرتا۔ اس کے بیٹھنے کے لیے ایک نیچی کرسی تھی۔ کرسی کی پشت پر دیوار میں ایک الماری تھی جس میں بہت ساری کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ علمی، ادبی، دینی یہ کتابیں مولوی محمد شفیع اور اس کے بڑے بیٹے عبدالعزیز نے جمع کر رکھی تھیں۔ کتابوں والی یہ الماری اکثر گاؤں کے لوگ کبھی کبھی بڑے اشتیاق سے دیکھتے اور ان کو الماری کھول کر جب کتابیں نظر آتیں تو وہ حیرت آمیز خوشی کا اظہار کرتے۔ چنانچہ اس گھر کے علاوہ پورے کور پور گاؤں میں شاذ ہی کسی گھر میں کوئی کتاب تھی۔ البتہ قرآن پاک ہر گھر میں موجود تھا۔ جو گاؤں کے اکثر مرد اپنے بچپن میں حاجی چراغ دین سے اور عورتیں مولوی محمد شفیع کی بیوی ریشم بی بی سے پڑھا کرتی تھیں۔

مولوی محمد شفیع اور ریشم بی بی کی اولاد میں ایک بیٹی سلیمہ بی بی اور پانچ بیٹے جن کے نام علی الترتیب عبدالعزیز، محمد صدیق، محمد اکرم، محمد اسلم اور محمد ارشد تھے۔ اس داستان کا راوی محمد اسلم ہے۔

محمد اسلم تین چار سال کا تھا۔ اس زمانے میں پہلی جنگ عظیم کے زخموں سے چور چور انسان دوسری جنگ عظیم لڑ رہا تھا اور غلام ہندوستان میں انگریز کی فوج میں اس علاقے کے لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ چنانچہ لڑائی کا براہ راست اس علاقے سے کوئی تعلق ایسا گہرا نہ تھا، البتہ سیالکوٹ چھاؤنی کے حوالے سے جنگ کی کوئی خبر مقامی لب ولہجہ میں اس علاقے کی فضا میں حیرت ہی پیدا کرتی، ڈر خوف والی بات کوئی نہیں تھی۔ کلووال روڈ پر کوئی فوجی گاڑی یا موٹر سائیکل جسے ''پھٹ پھٹ'' کہا جاتا تھا، اس کی آواز سن کر انہیں عجوبے کے طور پر دیکھنے کے لیے لوگ سڑک کی طرف بھاگ پڑتے تھے۔ جنگ عظیم ہو رہی تھی لیکن کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ البتہ یک دم طاعون کی وبا پھوٹ نکلنے سے گھروں پر گھر خالی ہونے لگے تو اس علاقے کی فضا میں سوگ بھر گیا اور سہمے سہمے ماحول میں یہ وبا کی آفت سب کے فہم سے بالا تھی اور وہ ایک دوسرے کو بے چارگی اور بے بسی سے دیکھتے مگر کچھ نہ کر پاتے۔ جو مر جاتا اسے دفنا کر ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کوئی تازہ قبر کھودنے لگتے تھے۔

مولوی محمد شفیع کا جنازہ جب اٹھا تو اس کا بیٹا اسلم، اس داستان کا راوی چند قدم تک جنازے کے ساتھ اوروں کی دیکھا

دیکھی چلا۔ پھر رک گیا اور واپس گھر لوٹ آیا۔ اس نے بیٹھک کی الماری کھولی جو کتاب اس کے ہاتھ پہلے لگی وہ نکالی اور گھر کی چھت پر پڑوس میں اگے ہوئے لسوڑے کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر ورق گردانی کرنے لگا۔ اگرچہ اس کتاب کے کسی حرف یا لفظ سے ابھی تک اس کی کوئی شناسائی نہ تھی۔ وہ سکول میں داخلہ لینے کی عمر کو ابھی نہیں پہنچا تھا۔ لیکن کتاب کے اوراق میں اس کے لیے عجیب اپنائیت تھی ..... دفعتاً اس نے اپنے کاندھے پر اپنے برادر بزرگ عبدالعزیز کے ہاتھ کی شفقت محسوس کی۔ اس نے کتاب بند کر کے اسے اپنے سینے پر دل کے اوپر رکھ لیا اور اپنے بھائی کے سامنے ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ برادر بزرگ نے اسے محبت سے تھپتھپایا اور کہا۔ اسلم یہ کتابیں جب تم پڑھنے کے قابل ہو جاؤ گے تو جانو گے کہ کتاب سے بہتر کوئی ساتھی نہیں ہے..... اس دن کے بعد بیٹھک میں الماری اور الماری میں کتابیں اسے گھر کی ہر شے سے زیادہ اچھی لگنے لگیں۔ وہ دن میں کئی بار الماری کھولا کرتا۔ جو کتاب اسے کسی بھی انداز سے اچھی لگتی۔ الماری کے سامنے کھڑے کھڑے وہ اس کی ورق گردانی میں ایک لطف محسوس کیا کرتا۔ جیسے یہ ورق گردانی کی ہوا کوئی ایسی زبان تھی جو اسے کوئی قصہ یا کہانی سنا کے خوش کر دیا کرتی تھی۔ وہ گاؤں کے سرکاری پرائمری سکول کی دوسری جماعت میں تھا۔ جب اس کو اپنے بھائیوں سے سن سن کر بال جبریل کی ''ساقی نامہ'' پوری کی پوری زبانی یاد ہو گئی تھی۔ اسے ایک دن یہ نظم اکیلے میں اونچے اونچے پڑھتے سن کر بڑے بھائیوں نے اس کے ہاتھ میں بال جبریل دے کر کہا لو یہ کتاب اس کے اندر سے پڑھ کر یہی نظم سناؤ۔ اس نے ایک لمبی سی نظم نکال کر پڑھنا شروع کیا:

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار

بڑے بھائیوں کو اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے دیکھ کر اس نے وجہ پوچھی تو انہوں نے اسے شاباش دینے کے بعد بتایا کہ نظم تو ساقی نامہ پڑھ رہے ہو لیکن کتاب میں تمہاری انگلی تو مسجد قرطبہ پر چل رہی ہے۔ اسلم نے جواب میں بڑی تمکنت سے کہا۔ میں یہ نظم ساری کتابوں میں پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ محمد اسلم کی پہلی فوٹو جو اب اس کے کسی رشتے دار کے پاس اگر ہے تو وہ بیٹھک میں کتابوں والی الماری کے سامنے کی ہے۔ اس کے بچپن کی دوسری فوٹو اس کی تیسری جماعت کی ہے کوہاٹ چھاؤنی کے ایک گھر میں اپنی بڑی بھابھی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس نے سینے پر دل کے اوپر جو کتاب لگا رکھی ہے اس کتاب پر ''آیات ونغمات'' اور نیچے جوش ملیح آبادی کے الفاظ صاف پڑھے جاتے ہیں۔

محمد اسلم کو اس کے بھائی جان (عبدالعزیز) نے لاہور کے کشمیری بازار سے پہلی کتاب جو خرید کر دی تھی وہ حفیظ جالندھری کی بچوں کے لیے نظموں کی کتاب ہے۔ اسلم کے بھائی جان نے جب وہ چوتھی جماعت میں تھا، اپنے نام اور اسلم کے نام کے ساتھ ''کمال'' تخلص کے طور پر لگایا۔ اس طرح وہ دونوں عبدالعزیز کمال اور اسلم کمال ہو گئے۔ اسلم کمال نے زندگی میں سب سے پہلے جس شاعر کو دیکھا وہ حفیظ جالندھری ہیں۔

امریکہ نے ایٹم بم بنا لیا۔ اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا کر دوسری جنگ عظیم جیت لی۔ اس جنگ کے بعد جب مصوری اپنا عالمگیر ایزل کھولتی ہے تو اس کا پایہ ماضی روم میں، پایہ حال لندن میں اور پایہ فردا پیرس میں نظر آتا ہے۔ اسلم کمال اس ایزل کے سامنے آنے کے لیے ابھی کتاب پڑھتا تھا اور کتاب میں لکھا تھا۔

سلواڈور ڈالی ایک سپینش پینٹر ہے جو آغاز میں جواہرات کا ڈیزائنر تھا۔ تھیٹر کے سیٹ پینٹ کرنے اور کتابوں کی تشریحی مصوری میں بے مثال تھا۔ ڈالی بہت اچھا ادیب بھی تھا مگر اپنے اسالیب مصوری کے بارے میں آئے دن غیر ذمہ دارانہ بیانات

دے کر اپنے لیے سامان رسوائی پیدا کرنے کا بھی بڑا شوقین ہے۔ ''پرسسٹنس آف میموری'' اس کی ایک بے مثال تخلیق ہے۔ جس میں وقت بتانے والی گھڑیاں جو تین مختلف سطحوں پر پڑی ہیں، دراصل تین مختلف زمانوں میں ہنوز کسی نادیدہ لیکن زیادہ حقیقی زمانے کی آتش انتظار میں پگھل کر تڑ مڑ گئی ہیں۔ ڈالی اپنی پینٹنگز کو ہاتھ سے پینٹ کیے ہوئے اپنے خوابوں کی فوٹو گرافس کہتا ہے۔

یہ ہنری ماتیسی ہے۔ یہ ایک فرانسیسی پینٹر ہے اور بے مثال کلرسٹ ہے۔ کتابوں کے بے شمار سرورق اس نے تخلیق کیے۔ اس نے قانون پڑھا اور ایک وکیل کے کلرک کے طور پر کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۰۵ء میں ایسے مصوروں کے ایک گروپ کے لیڈر کے طور پر وہ لوگوں کی طرف سے پہلی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جن کو عرف عام میں ''فاوز'' یعنی وحشی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کینوس پر خالص رنگ اور بے تکلف فارم کے بے ساختہ پھیلاؤ کے علمبردار تھے۔ کیوب ازم کی آمد سے پہلے ماتیسی پیرس کا سب سے بارسوخ پینٹر شمار ہوتا تھا۔ یہی نہیں وہ بیسویں صدی کا ایک اہم مصور ہے، بلکہ فارم کو لفظ کی گرفت سے آزادی دلانے کے حوالے سے تاریخ مصوری کا وہ بے حد اہم نام ہے۔ مشرقی لونڈیوں باندیوں اور داشتاؤں کے غمزہ وعشوہ اس کے پسندیدہ موضوعات بھی تھے۔ ۱۹۵۱ء میں اس نے وینس کے ایک چیپل کے اندرون کو بھی پینٹ کیا۔

عالمی شہرت یافتہ پابلو پکاسو ایک سپینش پینٹر ہے جو اپنی زندگی میں ہی تاریخ مصوری کی ایک اہم روایت کے مرتبے پر فائز ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں ''گیورنیکا'' نام کے ایک قصبے کو فرانکو کے حلیف جرمن بمباروں نے جس بے دردی سے برباد کر دیا تھا۔ اس کے خلاف احتجاج کے طور پر پکاسو نے ''گیورنیکا'' کے نام سے ایک بے مثال میورل پینٹ کیا اور اس تخلیق کو اس نے صرف بلیک، وائٹ اور گرے میں مکمل کیا۔ اس نے باقی سارے رنگ اس لیے نظر انداز کر دیے کہ اس کے خیال میں ان رنگوں کی موجودگی سے تصویر کی روح یعنی احتجاج نظر انداز ہو جاتا ہے۔ اس نے یہ میورل پینٹ کر کے میوزیم آف ماڈرن آرٹ نیویارک کو مستعار دے دیا تھا۔ اس تصویر میں وحشت و بربریت کا سانڈ اور ایثار و قربانی کا گھوڑا بھی ہے۔ بقول پکاسو یہ تصویر خوف و ہراس کے اس ماحول کا بیانیہ ہے جو لفظ کی رسائی سے باہر ہے۔ پکاسو کی تصویریں سرورق کے طور پر دنیا میں سب سے زیادہ کتابوں پر شائع ہوئی ہیں اور نیوز ویک کے اندازے کے مطابق یہ بیس سے پچیس ہزار کے درمیان ہیں۔ پکاسو جہاں ضروری سمجھتا تھا جیومیٹری بکس کے اوزاروں کا استعمال کر لیتا تھا۔

یہ مارک شیگال روسی نژاد پینٹر ہے۔ وہ اپنے تخلیقی وفور کے اظہار کے لیے اپنے روسی نژاد اور اپنی یہودی مذہبیت کے لیے عہد نامہ قدیم کا خاص طور پر مرہون احسان ہے۔ وہ اپنے گرد و نواح کی فوک یہودی کہانیوں کو اپنی زندگی کے واقعات پر منطبق کر کے اپنے اسلوب اظہار میں کشف و کرامات کا تاثر پیدا کرتا ہے۔

ویسلی کنڈنسکائی ایک روسی پینٹر ہے۔ ماسکو میں پیدا ہوا اور عام طور پر اسی کو تجریدیت کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے قانون پڑھا اور بعد میں میونخ میں آرٹ کی تعلیم پائی۔ ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ دوستی کا بہت شائق تھا اور بہت سارے مصوری کے مسائل ان کے ساتھ زیر بحث لایا کرتا تھا۔ بے شمار کتابوں کے سرورق اس نے بنائے۔ تکونیں، چار دیواریاں، کثیر الاضلاع، دائرے اور قوسیں، زاویے اور خطوط مستقیم بنانے کے لیے وہ رولر اور پرکار کا آزادانہ استعمال کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے فن میں فکر سے زیادہ کشف کا احساس پایا جاتا ہے۔

پیٹ موندریان ایک ڈچ پینٹر ہے۔ خالص تجرید اور اس کے فروغ کا سب سے بڑا علمبردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ صرف ابتدائی رنگ استعمال کرتا تھا یا غیر رنگوں میں صرف بلیک، وائٹ اور کبھی کہیں پر گرے۔ اس کے اس اسلوب سے خاص طور پر

تعمیراتی تزئین و آرائش اور کتابوں کے سرورق ڈیزائن میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی۔ موندریان نے جدول کش اور سیٹ سکوائر کا استعمال آزادانہ کیا ہے۔

جیکسن پولاک ایک امریکن پینٹر ہے۔ کمرشل آرٹسٹ کے طور پر اس نے کتابوں کے سرورق اور تشریحی مصوری سے اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد اس کے فن پر پکاسو، موندریان، میرو اور میسن کے اثرات غالب ہیں۔ وہ امریکن ابسٹریکٹ ایکسپریشنزم یا ایکشن پینٹنگ کا مرکزی مصور شمار کیا جاتا ہے۔

ایڈورڈ منک ناروجیئن پینٹر ہے اور ایکسپریشنزم کی صف اول کا مصور شمار ہوتا ہے۔ انسان کا احساس تنہائی زندگی کے ہر موڑ پر اور اپنی بے ثباتی کا ایسا خوف جسے محبت کی انتہائی سرخوشی بھی محو نہیں کر سکتی ہے اور اسی طرح زندگی کی محرومیوں سے پھوٹنے والے ایسے دوسرے غمناک حوالے ایڈورڈ منک کے پسندیدہ موضوعات فن ہیں۔

یہ جارج براک ہے جس نے پکاسو کے ساتھ مل کر ایک نئی بصری دنیا دریافت کرنی چاہی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ اپنی معروضی دنیا میں لوٹ آیا جس کے تصویری بیان پر وہ مکعبیاتی اشکال کا ایک پردہ سا تان دیتا ہے۔ وہ رولر اور کمپاس کا استعمال جہاں چاہتا ہے ضرور کرتا ہے۔

انڈریو وائتھ ایک امریکن پینٹر ہے۔ کتابوں کے سرورق اس نے بہت تخلیق کیے۔ وہ اشیا کو پینٹ کرتے ہوئے آخری تفصیل تک جاتا ہے۔ لیکن فوٹوگراف اور پینٹنگ میں فنی فرق قائم رکھنے پر اسے قدرت حاصل ہے۔ ''ہیلگا پکچرز'' اس کا ایک مرقع فن تمام کا تمام ہیلگا کے نیوڈز پر مشتمل ہے۔ معذور کرسٹینا کے روپ میں جنگ عظیم دوئم کی معذور اور اپاہج انسانیت کو اس نے اپنی اس دنیا کے کسی بہتر تصور کی طرف رینگتے دکھایا ہے۔

جنگ کے زخموں سے چور چور انسانیت اس دنیا میں کسی بہتر دنیا کے تصور کی تلاش میں ایک پینٹر کے سٹوڈیو میں جھانکتی ہے۔ ایزل نظر آتا ہے اور ایزل پر سے لڑھک کر گرا ہوا ایک کینوس دکھائی دیتا ہے۔ کینوس پر جنگ کے دھوئیں کی کالک، انسانی خون کے دھبوں کا موزیک اور گرد و غبار کے چمکتے ذرات کا ٹیکسچر نمایاں ہے۔ جس پر بندوق کی گولیاں، گولیوں کے خول گلیو سے جا بجا جمائے گئے ہیں۔ ایک آدھے بسکٹ کے دو ٹکڑے آمنے سامنے چسپاں ہیں۔ ان کے پاس ایک بغیر نگینے کے انگوٹھی، ایک چوڑی کے دو ٹکڑے، ایک زنانہ پھٹی ہوئی جراب، ڈبل روٹی کے دو توسوں کے درمیان میں رکھ کر گلیو کی گہری تہ سے کینوس کی سطح پر جمے ہوئے ہیں۔ ایک ریسٹ واچ کا ٹوٹا ہوا سٹریپ، ایک حسینہ کا پھٹا ہوا فوٹو، ایک گریٹنگ کارڈ کا ٹکڑا اور ایک محبت نامے کے کچھ پرزے، ایک عینک کا فریم، ایک فونٹین پن جس کی نب نہیں ہے اور ایک واٹر کلر برش جس کے بال جھڑ چکے ہیں ان کو آپس میں گلیو سے جوڑ کر پھر ان کو کینوس پر جما دیا گیا ہے۔ ان کے قریب چائے کا مڑا ہوا چمچہ ایک ٹوٹے ہوئے کپ میں جوڑ کر پلیٹ کے دو ٹکڑوں پر ایک شیونگ بلیڈ ایک پچکی ہوئی ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کو پالش کی ڈبیا میں رکھ کر ان کو بوٹ کے ایک تسمے میں باندھ کر اوپر ماچس کی تیلیاں جمانے کے بعد اس کو کمپوزیشن کی سطح پر جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ساری اشیا اوپر نیچے اور دائیں بائیں ایک دوسرے کے قریب قریب بھی اور ایک دوسرے سے دور دور بھی، ایک ایسی ترتیب میں بظاہر پڑی ہیں کہ اس ترتیب کے اندر سے ایک بے ترتیبی بھی جھانکتی نظر آتی ہے۔ ایزل سے ذرا آگے دیوار کے ساتھ ایک سٹول ہے جس کی دو ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور ان کی جگہ دو اینٹیں کھڑی کر کے سٹول کو کھڑا کیا گیا ہے۔ سٹول پر ٹوٹی ہوئی ایک ایش ٹرے میں بجھا ہوا سگریٹ کا ایک ٹوٹا پڑا ہے۔ یہ سٹول شاید سٹر کے لیے ہے جو غالباً زخمی ہے اور قریب کے کسی ہسپتال سے مرہم پٹی کروانے گیا ہے۔ ایزل کے عقب میں ذرا

اندھیرے میں لکڑی کی بنی ہوئی دو ٹانگیں اور دو بازو پڑے ہیں اور ان کے درمیان فرش پر پینٹر جس کی دونوں ٹانگیں اور دونوں بازو کٹے ہوئے ہیں پیٹھ کے بل ایک کاکروچ کی طرح سنبھلنے کی مسلسل کوشش کرتے کرتے اب تھک ہار کر نیم بے ہوشی میں بڑبڑا رہا ہے۔ اس سٹوڈیو میں کوئی حقیقت اب سالم و ثابت نہیں بچی یہاں اب صرف حقائق کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔

کتاب کے اوراق پھڑ پھڑاتے ہیں اور اس دنیا کے نقشے پر کسی بہتر دنیا کی تلاش میں پاکستان معرض وجود میں آ چکا ہے۔ اس نو آزاد ملک کے غیر آزاد نصاب تعلیم کی پرائمری پاس کر کے اسلم کمال اقبال میموریل ہائی سکول گوہد پور مراد پور میں داخلہ لے چکا ہے۔ انہی دنوں اس سکول کا مین گیٹ نیا نیا تعمیر ہوا۔ پلستر ہونے کے بعد اس کی پیشانی پر ماسٹر فاروقی صاحب نے دو پنسلیں جوڑ کر ''اقبال میموریل ہائی سکول گوہد پور، مراد پور'' لکھا اور ڈرائنگ ماسٹر محمد اسحاق قریشی المعروف پی ٹی صاحب نے اس میں کالا رنگ بھرا تو یہ سارا عمل اپنے اندر اسلم کمال کے لیے بڑی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے تھا۔ اس سکول کا ڈرائنگ روم (کمرہ ڈرائنگ کلاس) خاص طور پر قابل دید تھا۔ نہ صرف سکول کے طالب علم بلکہ اکثر راہگیر بھی اس کی کھڑکیوں اور دروازوں کی درزوں سے اندر آویزاں محمد اسحاق قریشی صاحب کے ہاتھ سے بنی ہوئی تاج محل اور شاہی مسجد دہلی اور دوسرے مقامات کی تصویریں دیکھتے نظر آتے تھے۔ اسحاق صاحب ایک بہت اچھے آرٹسٹ ہی نہیں تھے وہ تربیت یافتہ پی ٹی ماسٹر، ہینڈ ماسٹر ہونے کے علاوہ ہاکی، فٹ بال، والی بال کے اعلیٰ کھلاڑی بھی تھے۔ وہ نہایت مہذب، بہت خوش لباس اور خوش خصال ایک ایسے ان تھک استاد اور مخلص و شفیق انسان تھے جو اس علاقے میں تہذیب و ثقافت کے بھی بلاشبہ ایک زبردست علمبردار تھے۔

چھٹی جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک مضمون بعنوان ''سقراط'' تھا۔ اردو کے ماسٹر غلام حسین کوندا صاحب نے یہ مضمون پڑھاتے ہوئے فرمایا کہ چوہدری محمد اکبر جو اس سکول کے بانیوں میں سے اور پہلے ہیڈ ماسٹر بھی تھے، انہوں نے ایک کتاب ''درس حیات'' لکھی ہے۔ اس کتاب میں سے یہ مضمون منتخب کر کے نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا تھا۔ چوہدری محمد اکبر درحقیقت اس علاقے کے سرسید تھے۔ میرے بھائی جان کے استاد تھے اور اس حوالے سے مجھے ان کی بے پایاں شفقت حاصل تھی۔ ان کے اس مضمون ''سقراط'' کو پڑھ کر اور ان کی کتاب ''درس حیات'' کا ذکر سن کر میرے دل میں کتاب لکھنے کا خیال پہلے پہل پیدا ہوا تھا۔ کتابیں لکھنے والوں کو ادیب، تصویریں بنانے والوں کو مصور اور خوش خط لکھنے والوں کو خطاط کہا جاتا ہے، یہ ابھی مجھے معلوم نہ ہوا تھا۔ میں چوہدری محمد اکبر کا یہ مضمون ''سقراط'' بار بار پڑھا کرتا اور ہر بار اس کے معانی اور مفہوم خود بخود پہلے سے زیادہ میری سمجھ میں آ جاتے تھے۔ سقراط کی جو تصویر میرے ذہن میں ابھرتی تھی وہ وہ ہو بہو چوہدری محمد اکبر جیسی ہوتی تھی۔ اپنے بھائی جان سے مجھے عشق تھا اور ڈرائنگ ماسٹر محمد اسحاق قریشی میرے آئیڈیل تھے۔

ڈرائنگ ماسٹر المعروف پی ٹی صاحب نے ان دنوں ایک نئی تصویر بنا کر ڈرائنگ روم میں لگائی تھی۔ اس تصویر کے بظاہر دو حصے تھے ایک حصے میں ایک شاہی محل کا گنبد تھا جس پر کبوتر بیٹھے تھے اور دوسرے حصے میں ایک سنگلاخ چٹان پر ایک بارعب عقاب بیٹھا تھا۔ اس تصویر کے نیچے ماسٹر فاروقی صاحب نے جلی خط کی قلم سے یہ شعر لکھا تھا:

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اسلم کمال اس تصویر کو بہت شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ اپنی افتاد طبع لگن اور ڈرائنگ ماسٹر کے سایہ شفقت میں وہ آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایک پینٹر کے طور پر اپنے علاقے میں کافی مشہور ہو چکا تھا۔

اس زمانے میں اقبال میموریل ہائی سکول کی لائبریری میں دہلی سے بچوں کے لیے مشہور ماہوار رسالہ ''کھلونا'' نظر آنے لگا۔ جسے دیکھ کر اس سکول کے طلبا کو شاید پہلی بار پتہ چلا کہ اپنے نصاب کی کتب کے علاوہ بھی کچھ پڑھنے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس 'کھلونا' کو ہر طالب علم پڑھنا چاہتا تھا لیکن میں ادب لطیف، سویرا، نیرنگ خیال، ادبی دنیا اور نقوش پڑھا کرتا تھا۔ ان کے شمارے میرے بھائی جان کوہاٹ سے آتے تو میرے لیے اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ سیالکوٹ کے ریلوے روڈ پر ملک اینڈ سنز کے بک اسٹال پر کھڑے کھڑے دوسروں سے نظریں بچا کر فلمی رسالہ ''شمع'' دہلی بہانے بہانے سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا ٹائیٹل اور بیک ٹائیٹل اندر جیت کی تخلیق ہوتا تھا۔ اندر غزلوں، نظموں اور افسانوں کی مصوری صدیقی کے موقلم سے ہوتی تھی۔

مولانا حامد علی خان کے ماہوار رسالے ''الحمرا'' میں بھائی جان کا مضمون ''اقبال اور بابا گرامی'' شائع ہوا۔ انہوں نے ایک پرچہ ہمارے سکول کو بھجوایا تھا۔ یہاں پر ایک استاد نے اس مضمون کو پڑھا۔ مضمون تو بھائی جان نے لکھا تھا مگر نجانے مجھے کیوں یوں لگتا تھا کہ جیسے تمام اساتذہ کی آنکھ کا تارا میں بن گیا ہوں۔ بھائی جان ان دنوں ایئر فورس میں ایجوکیشن انسٹرکٹر تھے اور کوہاٹ میں تعینات تھے۔ انہوں نے دوران ملازمت ایم اے انگلش کیا پھر ایم اے فلسفہ میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی اور میری زندگی بھی بنانے والے وہی ہیں۔

مولانا حامد علی خان نے ''الحمرا'' کے آخری چند صفحات بچوں کے لیے مختص کر دیے تھے۔ ان صفحات میں ''رنگ بھرو'' اور ''کہانی لکھو'' کے مقابلے میں نے جیتے اور اپنے ہم جولیوں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ یہ ''کارنامے'' کرنے والا میں انہی کا ساتھی ہوں، ان دنوں اپنا نام محمد اسلم کمال کور پوری لکھا کرتا تھا۔

۱۹۵۶ء میں راقم دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ''دردل کشا'' اور ''سلسلۂ روز و شب'' کے مصنف اور پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ شیخ منظور الٰہی ان دنوں سیالکوٹ کے ڈی سی تھے۔ ہمارے سکول کے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات و اسناد میں مہمان خصوصی تھے۔ مضافاتی علاقے کے ایک ہائی سکول پر ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی ہیبت کے ماحول میں اسلم کمال کی صرف چند لکیروں میں ڈی سی کی مشابہت خدا جانے کیسے اتر آئی کہ ڈی سی نے مبلغ -/100 روپے انعام دیا اور انعامات تقسیم کرتے ہوئے چھتیس انعامات کی بوری ہمارے سر پر رکھتے ہوئے مشفقانہ پیش کش کی ''یہ بوری میں اٹھا کر تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں؟'' اسلم کمال اتنے سارے انعامات کی بوری اٹھا کر نہ صرف اپنے گھر تک لے گیا بلکہ اس سال اس نے میٹرک کا امتحان بھی تھرڈ ڈویژن میں پاس کر لیا اور گورنمنٹ کالج کوہاٹ نے اسے فرسٹ ایئر میں داخلہ دینے میں قطعاً کوئی پیش و پس نہ کی۔ شاید اس لیے کہ داخلہ لینے جانے سے دو دن پہلے اس نے بریگیڈ گراؤنڈ کوہاٹ میں کرکٹ کا ایک ہی میچ کھیل کر پورے کوہاٹ میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ لیکن فرسٹ ایئر کا امتحان سر پر آیا تو اسلم کمال کو ٹائیفائڈ بخار نے آلیا۔ اس وقت کلوروما ئی سین ایجاد ہو چکی تھی مگر ابھی کمبائنڈ ملٹری ہسپتال کوہاٹ نہ پہنچ پائی تھی۔ چنانچہ بہترین علاج کے باوجود کرکٹر اسلم کمال زندگی اور موت میں بونڈری لائن کے اتنا قریب چلا گیا کہ عالم بے ہوشی میں اس نے اپنے بھائی جان کو آخری وصیت بھی کر ڈالی۔ ''بھائی جان! کنگ گیٹ کوہاٹ کے پہلو میں جو بک سٹال ہے وہاں سے میں نے ''لیل و نہار'' ادھار لے رکھا ہے اس کی قیمت ادا کر دی جائے''۔

ایک نئے نئے معرض وجود میں آئے ہوئے ملک پاکستان کا تمدنی ذوق جمال اپنے تہذیبی سرچشموں کی تعبیر نو کرنے کے لیے اپنا ایزل کھول کر اس پر کینوس کو آئینہ نما کر کے اس میں مصوری کے عالمی منظر نامے کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس میں اسے ہنری ماتیسی کے آزاد رنگ موندریان کی عمودی اور افقی لکیروں کے جنگلے، کنڈنسکائی کی کشفی اشکال، پال کلی اور جان میرو کی لکیری

فنائیت، براک اور پکاسو کا کیوب ازم، پرکار، مسطر اور ریلزم اور ابسٹریکٹ ایکسپریشنزم ایک دوسرے کی چاہتوں اور محبتوں میں
لطان ایک ایسے کولاژ میں دکھائی دیتے ہیں جو آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بکھر رہا ہے اور ٹکڑے ذی روح ہو کر عربی
روف ابجد میں بدل کر ایک دوسرے کے قریب آ گے پیچھے ہو کر الفاظ بننے لگتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں اسلم کمال کراچی پہنچ گیا۔ اس کے بستر بند میں کرکٹ کا بیٹ لپٹا ہوا تھا اور روح پر مصوری کی دھند چھائی
وتی تھی۔ جب کہ دل و دماغ پر ان دونوں یعنی مصوری اور کرکٹ کے راستے میں پہلی ضرورت کے طور پر نوکری کھڑی تھی جس کی
لاش میں کراچی کی سڑکیں اور اسلم کمال کے قدم تھے۔ کرکٹ یا مصوری دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی رشتہ توڑنا مشکل تھا۔
ہ کینوس کی طرف دیکھتا تو وہ پھیل کر کرکٹ کی گراؤنڈ بن جاتا اور کرکٹ کی گراؤنڈ میں ہوتا تو وہ سکڑ کر کینوس میں سمٹ آتی تھی۔
نٹر پارک میں ایک شام نیٹ پریکٹس کے بعد وہ پاکستانی چوک آیا اس نے وہاں کھانا کھایا۔ وہاں سے وہ اپنا بیٹ لیے بیدل
جانے کتنی دیر چلنے کے بعد کیماڑی پہنچا اور پاکستان نیوی کی ایک لانچ میں منوڑا اترکر سی سائٹ پر چلا گیا تو رات چاند کی چودھویں
ور سامنے سمندر تھا جو جوش جنوں میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ مصور اسلم کمال کو ایسے لگا جیسے یہ سمندر ابھی ابھی ذرا پہلے اس کے اندر
ٹھیں مار رہا ہے اب اس کا سینہ پھاڑ کر باہر نکل کر بیکراں ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا بیٹ اٹھایا اور اس کے بلیڈ پر بوسہ دیا اور پوری
وت سے اسے سمندر میں پھینک دیا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں لے کر سمندر کے رخ ریت پر کمر کے بل دراز ہو گیا۔ سمندر کی لہریں
ں کے سر پر سے گزرنے لگیں..... !تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ محسوس کیا اور دیکھا کہ اس کا بیٹ ایک ضدی بچے کی طرح واپس
ٹ کر اس کے پاؤں چھو رہا تھا۔ اس نے بیٹ ہاتھوں میں اٹھا لیا اور کتنی ہی دیر اسے اپنی خالی خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر
س نے اسے دوبارہ پورے زور سے سمندر میں پھینک دیا اور لکڑی کا ایک نوک دار ٹکڑا لے کر اسے موقلم کی طرح پکڑ کر ساحل پر
چھی ہوئی نرم نرم اور ہموار ریت پر نقش بنانے لگا۔ لہر آتی اور نقش چاٹ جاتی۔ وہ پھر تیزی سے نقش بناتا۔ لہر آتی اور نقش چاٹ
تی۔ یہ نقش گری تھی یا دکنوں کے درمیان دوڑیں تھیں۔ وہ خوابوں کی تعبیر کر رہا تھا یا مستقبل کے نام کچھ تحریر کر رہا تھا؟ وہ کرکٹ کی
راؤنڈ میں نیچری مکمل کر رہا تھا یا کینوس کے بے نشاں پر کوئی جہاں تصویر کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ وہ کب تک کرتا رہا اور کب تھک ہار
کر سو گیا، سمندر جانتا ہوگا۔ اسے سورج کی شعاعوں نے جگایا تو دن چڑھ آیا تھا۔ اس کے تن پر لباس ابھی تھوڑا تھوڑا گیلا تھا۔ اس
نے جوتے اتارے ان کے اندر کا پانی باہر انڈیلا۔ وہ یہاں ساحل سمندر پر کیا لے کے آیا اور یہاں سے اب کیا ساتھ لے کر جا رہا
ا۔ سمندر جانتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اداس۔ وہ دن گیا اور آج کا دن آیا۔ مسرت کہاں یک دم اداسی میں اور اداسی کہاں اچانک
سرت میں بدلتی ہے، وہ اس میں کبھی کوئی لکیر نہیں کھینچ سکا۔ ایک سیدھی لکیر کی طرح بندر روڈ پر ٹاور سے سیدھی پولو گراؤنڈ تک
یکلوڈ روڈ آج ابراہیم اسماعیل چندریگر روڈ کہلاتی ہے۔ اس پر بمبئی ہوٹل کے بالمقابل ایک ''دلکشا بلڈنگ'' آج بھی ویسی کی ویسی
قع ہے۔ یہاں عبدالسلام کیف مصور کی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی تھی۔ اسلم کمال کو یہاں کمرشل آرٹ کا ایک سکالرشپ مل گیا۔
ند ماہ بعد ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے زیر اہتمام کمرشل ڈیزائنگ کے ایک مقابلے میں اسلم کمال کو فرسٹ پرائز کا حقدار
رار دیا گیا، گویا کراچی کے سمندر جیسے بڑے دل نے اس کے ہاتھ سے بیٹ لے کر کمرشل آرٹ کی ڈگری تھما دی تھی۔

کراچی میں اسلم کمال ایک فرانسیسی فارماسوٹیکل کمپنی کے کچھ بروشر اور تازہ تازہ تعمیر شدہ نہایت جدید سینما بمبینو کا لوگو
کرا لاہور چلا آیا اور نقوش پریس میں واقع نقوش کے دفتر میں محمد طفیل سے جا ملا۔ دونوں میں ایک دلچسپ اور طویل مکالمہ ہوا اور
ند دنوں بعد اسلم کمال نے اپنی زندگی کا پہلا سرورق ''نقوش'' کے لیے تخلیق کیا۔ یہ سرورق چھپ کر جب بازار میں آیا تو اسلم

کمال کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے نقوش اردو ادب کا ایک رسالہ نہیں بلکہ نقوش اردو ادب کا لاہور ہے اور نقوش کا گرد پوش بنا کر دراصل اس نے وہ لباس پہن لیا ہے جو اردو ادب کے لاہور کا امتیازی لباس ہے۔ آج اسے اسی طرح کی مسرت پھر محسوس ہو رہی تھی جیسے ایک بار تیسری جماعت میں اسے محسوس ہوئی تھی۔ جب اس کے بھائی جان نے ایک صبح سویرے اسے باٹا کے جوتے پہنائے، نیوی بلیو نیکر پہنائی، سفید قمیص پہنائی اور قمیص کے بازو اوپر رول کر کے بیٹھک میں کتابوں والی الماری کے سامنے اس کے بالوں میں کنگھی کی اور وہ اپنے بھائی جان کے ساتھ ریل گاڑی میں بیٹھ کر پہلی بار لاہور آیا تھا۔

نقوش کے دوسرے سرورق پر مجھے زندگی میں جو پہلی داد ملی، وہ مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی طرف سے تھی۔ انہوں نے اپنے ایک خط بنام سید قاسم محمود میں مصور اسلم کمال کو رنگ اور خط کا مبلغ لکھا ہے۔ سید صاحب نے یہ خط مصور اسلم کمال کو دکھایا تو وہ سرخوشی میں اپنی کائنات کے خاکداں سے اڑ کر اپنے آسمان کے ستاروں میں چلنے لگا جیسے اس کے سر پر امکانات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے مرقع فن ''عمل چغتائی'' پر ماہنامہ کتاب نے تبصروں پر مشتمل ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اس کا سرورق چغتائی کا ایک فن پارہ تھا۔ جب چغتائی صاحب نے سید قاسم محمود سے پوچھا کہ یہ سرورق آپ نے مجھ سے کب بنوا لیا تھا؟ سید صاحب نے جواب دیا۔ یہ آپ سے نہیں بنوایا بلکہ ایک ابھرتے ہوئے فن کار اسلم کمال نے آپ کی خدمت میں آپ کے انداز میں ایک مصورانہ خراج پیش کیا ہے۔ جس طرح شاعر اپنے بزرگ شاعروں کو منظوم خراج پیش کرتے ہیں۔

بہت ساری داد اور بے شمار شاباش حاصل کرنے کے بعد، کتنے سارے انعامات اور بہت سارے اعزازات پانے کے بعد اب جب کہ بچپن گیا، شباب گیا اور بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے، تو ایک دن اقبال میموریل ہائی سکول جو اب ہائر سیکنڈری سکول ہے، کے پاس سے ایک راہگیر کی طرح گزرتے ہوئے اس کے ڈرائنگ روم کے دروازے کی درازوں سے اندر جھانکا تو دیواریں وہی تھیں، فرش اور چھت بھی وہی تھے مگر ان میں وہ جو ایک شخص کے وجود سے رونق اور رعنائی تھی، یہاں سے کوچ کر چکی تھی۔ سکول کے جنوب میں ایک وسیع قبرستان ہے۔ میری نگاہ سوالیہ انداز میں ادھر کو اٹھی اور قدم بے تابانہ ادھر کو بڑھے ایک کچی قبر کے کتبے پر لکھا ہے ''حاجی محمد اسحاق قریشی ڈرائنگ ماسٹر'' میں نے سلام عرض کیا، خاک مرقد پیشانی پر لگائی۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ماحول دھندلا گیا اور کب اس دھندلکے میں سے کوئی راستہ نکلا اور میں کب لاہور کینٹ میں کیولری گراؤنڈ کے قبرستان کے جنوبی کونے میں اس قبر کے پہلو میں پہنچ گیا جس کے کتبے پر لکھا ہے ''پروفیسر عبدالعزیز کمال'' میں دل تھام کر قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ السلام علیکم بھائی جان۔ بھائی جان میں اب بھی بہت چھوٹا سا ہوں۔ اس بڑی دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں:

یہ گنبد مینائی، یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

پروفیسر عبدالعزیز کمال کی قبر سے چند قبریں پیچھے ایک پختہ قبر کے کتبے پر نظر پڑی۔ اس پر لکھا ہے ''نسیم حفیظ قاضی'' یہ قبروں کے کتبوں کی بھی عجیب کہانی ہے اس ایک قطرۂ خون کی زبانی جو دل سے ٹپک کر آنکھ میں اٹک گیا ہے۔ ایک دبلی پتلی، سہمی سہمی، دبی دبی اور دھیمی دھیمی سی سائے جیسی اس قبر سے ایک گمان کی صورت نکلتی ہے اور یقین کی پرچھائیں کی طرح میرے آگے آگے چلتی ہے اور ہم ریلوے لائن عبور کر کے گلبرگ کے قبرستان میں ایک قبر کے قریب رک جاتے ہیں، کتبے پر لکھا ہے۔ ''بشیر احمد قریشی''۔ المعروف بی اے قریشی پنجاب کے سابق چیف سیکرٹری اور لاہور عجائب گھر کے تاحیات چیئرمین۔ رب کریم ان کو اپنے

جوارِ رحمت میں رکھے۔ وہ میرے ایک ایسے ناقابلِ فراموش محسن ہیں جنہیں یہ کہ میں مصور ہوں خطاط ہوں، اس کے سوا میرے بارے میں کچھ اور معلوم نہ تھا اور انہوں نے اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی جبکہ وہ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے اور ہر ضرورت پوری کرتے تھے جہاں تک ان کے بس میں ہوتا تھا۔

یہاں سے میں مس نسیم حفیظ قاضی کی پرچھائیں کے پیچھے پیچھے الحمرا آرٹس کونسل آ گیا۔ آج سے تینتالیس برس قبل میں نے الحمرا آرٹس کونسل میں مصوری کی شام کی کلاس جوائن کی تو دو ماہ بعد مس قاضی نے اشارے سے مجھے بلا کر سینئر آرٹسٹوں سے متعارف کروایا اور فرمایا۔ ''تم ان کے ساتھ مل کر اسکیچنگ کیا کرو۔ ہم آخر تک جو کچھ سکھاتے ہیں وہ تمہیں آتا ہے''۔ اس گروپ میں خالد لطیف، منان عزمی، ظہیر محمود رومی اور جاوید بٹ نمایاں تھے۔ یہ محفل جہاں ہوتی تھی وہ ٹین کی گیلری کا ایک کونہ تھا جو سٹور کے طور پر علیحدہ کیا ہوا تھا، لیکن آرٹسٹوں کے اس گروپ نے اس کا بہتر استعمال کرتے ہوئے اسے سٹوڈیو 4 کا نام دے رکھا تھا۔ اسی ٹین کی گیلری میں جب ''سقوطِ ڈھاکہ کی بازگشت'' کے عنوان سے میری پینٹنگز کی نمائش ہوئی تو ان میں دروازے کا موٹف مرکزی تھا۔ میڈم قاضی نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''تم نے خود اپنے لیے دروازہ کھولا ہے۔ تم اپنے لیے اپنا رستہ بھی خود بنا لو گے۔ مجھے تم سے یہی امید ہے''۔

قیامِ پاکستان کے بعد الحمرا آرٹس کونسل ایک پرانے رہائشی بنگلے میں قائم کی گئی تھی اور اس کے ایک وسیع لان میں تصاویر کی نمائش کے لیے ٹین کی عارضی گیلری بنائی گئی تھی۔ آج اس جگہ پر ایک جدید اور خوشنما عمارت ہے۔ عین وہاں پر جہاں وہ پرانی ٹین کی گیلری تھی آج مال روڈ کو ایجرٹن روڈ سے ملانے والی سڑک گزرتی ہے۔ اس سڑک پر لگے کارپوریشن کے بورڈ پر ''خیابان ایوان اقبال'' لکھا ہے۔ سڑک کا یہ نام مکرمی مجید نظامی نے تجویز فرمایا، اس نام کا اس کا یہ بورڈ لگوانے کا انتظام سابق میئر لاہور خواجہ حسان نے میرے کہنے پر کیا۔ اس سڑک پر جہاں الحمرا آرٹس کونسل ختم ہوتی ہے اس سے آگے اسٹاک ایکسچینج کی بلڈنگ کے آگے ایوان اقبال کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ ایوان اقبال کے خیابان ایوان اقبال، ایجرٹن روڈ اور لنک کشمیر روڈ پر جو گیٹ ہیں ان پر ''حظ کمال'' میں ''ایوان اقبال'' کے الفاظ کو پتھر میں کھود کر نصب کیا گیا ہے۔ اس ایوان اقبال میں ایک شاندار کانفرنس ہال ہے جس کی تین اطراف میں ایک آرٹ گیلری ہے جس میں کلام اقبال پر مبنی تصاویر آویزاں ہیں۔ اس گیلری کا باقاعدہ افتتاح ۲ دسمبر ۲۰۰۰ء کو صدر پاکستان نے فرمایا تھا۔ مصور میں ہوں۔ میرا نام اسلم کمال ہے اور میں اس گیلری کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں اکسٹھ برس کا ہو چکا ہوں۔ پروین کمال کا خاوند، عظمیٰ کمال، ولید کمال اور فہیم کمال کا والد ہوں۔ اسلم کمال اوسلو میں، لاہور سے چین تک، گمشدہ۔ قلم موقلم، کسب کمال اور اسلامی خطاطی۔ ایک تعارف کا مصنف ہوں۔ میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ ہے۔ اس چشمے کے شیشے صاف کر کے اس ایوان اقبال کی پرشکوہ عمارت کو اپنی آنکھوں میں بھر کر اس پر دھیان جماتا ہوں۔ ایوان اقبال کی عمارت ٹرانسپیرنٹ ہو جاتی ہے اور میں اس میں سے گزر کر اقبال میموریل ہائی سکول گوہد پور مراد پور پہنچ جاتا ہوں۔ جہاں ڈرائنگ ماسٹر محمد اسحاق قریشی نے قصر شاہی کے گنبد پر کبوتر اور سنگلاخ چٹان پر شاہین پینٹ کیا تھا۔ میں اس تصویر کو بار بار دیکھا کرتا تھا یہاں تک یہ تصویر میرے اندرون کی دیواروں پر منتقل ہو گئی۔ پھر اس گنبد سے میرے جذبوں کے کبوتر اڑتے ہیں اور میرے اندرون کے آسمان پر اڑانیں بھرتے اور یہ شاہین کہیں میرے ہی اندر کے کسی غیب سے نکل کر دو چار کبوتر شکار کر کے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کبوتر اور شاہین کا یہ رزمیہ اپنے تن کے پنجرے میں لے کر زندگی کے المیے اور زندگی کے طربیے دونوں میں سے اب تک گزر رہا ہوں۔ میں نے زندگی کے پہلے بیس برس کھیل کے میدانوں میں اور بعد کے چالیس برس

تہذیب وفن کی وادیوں میں بسر کیے ہیں۔ کرکٹ سے اپنا تعلق بہت غور وفکر کے بعد توڑا اور ترک تعلق کی باقاعدہ تقریب میں نے برسر ساحل سمندر برپا کی۔ اس کائنات میں رہتے ہوئے انسان اپنی بھی کائنات میں رہتا ہے۔ اس کی اپنی کائنات میں بھی ایک خاکداں، ایک سمندر اور ایک آسمان ہوتا ہے۔ انسان اپنی خارجی کائنات میں تنہا ہے اور اپنے اندر کی کائنات میں اکیلا ہوتے ہوئے بھی تنہا نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو اس کی اپنی کائنات کا سمندر اس کے سر پر ٹھائیں مارنے لگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے تو اس کا آسمان اس کے قدموں میں بچھ جاتا ہے اور وہ ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں تک کبھی ستاروں پر اور کبھی سیاروں پر دھومیں مچاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے خاکداں میں بادبان تلاش کر لیتا ہے اور سراب اندر سراب تیر کر ان دیکھے ان ساحلوں پر جا اترتا ہے جو کہیں موجود نہیں ہوتے لیکن حقیقت سے بڑھ کر حقیقی ہوتے ہیں۔

اورینٹ لٹریری کے نام سے ایک انگریزی رسالہ اکرام اعظم اور کپتان صغیر (جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ پر شہید ہوئے) نے راولپنڈی سے نکالا تھا۔ اس کا سرورق میں نے تخلیق کیا تھا۔ اس کے بارے میں ایک امریکی نقاد نے حیرت کا اظہار کیا کہ اتنا اچھا اور بامعنی سرورق کہاں سے حاصل کر لیا۔ مکرم ومحترم احمد ندیم قاسمی صاحب نے کسی کتاب پر میرا سرورق دیکھا اور مجھے بذریعہ خط داد بھیجی۔ حالانکہ اس وقت مجھے ان سے شرف نیاز بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ صاحب 'آواز دوست' جناب مختار مسعود نے ایک تقریر میں کہا کہ اب اردو ادب کی وہ کتاب جس پر اسلم کمال کا سرورق نہ ہو کچھ بے لباس سی نظر آتی ہے۔ جرمنی سے مجھے ابن انشا مرحوم نے لکھا کہ یہاں کتابوں کے عالمی میلے میں تمہارے سرورقوں کی وجہ سے پاکستانی کتابیں منفرد نظر آتی ہیں۔ شعبہ فائن آرٹ پنجاب یونیورسٹی کی سابق چیئر پرسن اور مشہور مصورہ مسز اینا مولکا احمد کہا کرتی تھیں کہ وہ میرے سرورق والی کتابیں طالب علموں کو دکھا کر ڈیزائن میں مغربی جدید مصوری کے اثرات پر لیکچر دیا کرتی تھیں۔

پھر ایک دادا ایسی بھی آئی جس کی میں نے کبھی تمنا نہیں کی تھی۔ یحییٰ خان نے مارشل لاء لگا کر قوم کے نام تقریر میں فرمایا کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہے، ۱۹۶۲ء کا آئین زندہ ہے اور سیاسی آزادی بھی ہے۔ اس بوالعجبی پر میں نے ''اردو ڈائجسٹ'' کے لیے سرورق پر ٹریفک سگنلز کے تینوں اشارے روشن دکھا دیے۔ مصطفیٰ زیدی مرحوم کہنے لگے ''نہ جانے یہ تمہارے تینوں روشن اشاروں والا سرورق دیکھ کر میرا دل کیوں بجھنے لگتا ہے''۔ چنانچہ یحییٰ خان کی بدحواسی اور ناعاقبت اندیشی کی پیدا کردہ فضا میں سقوط مشرقی پاکستان کا حادثہ رونما ہوا۔ اس سرورق میں پیشین گوئی کا یہ پہلو ایسا تھا کہ اس کے بعد میں نے سرورق پر کسی داد کی خواہش دل سے ہمیشہ کے لیے نکال دی اور ۱۹۷۵ء کے بعد میں نے سرورق پر اپنا نام لکھنا ترک کر دیا۔

سرورق کی ڈیزائننگ میرے لیے ایک محض کمرشل جاب کبھی نہیں رہا۔ مجھے بجا طور پر فخر ہے کہ میں نے عہد بہ عہد نئی تخلیقی توانائی سے آشنا کر کے اسے کرافٹ سے کری ایشن کی طرف گامزن رکھا ہے۔ اور کتاب کے عشق میں کتاب کو میں نے مکمل ایک سرورق دیا۔ جس میں خطاطی سے لے کر رنگوں خطوں اور تصویری قدروں کے حسن توازن تک میری انفرادیت آپ اپنا تعارف چلی آئی ہے۔ بیسویں صدی کے عالمی آرٹ کے صورت گر تمام نمائندہ مصوروں نے کتاب سے محبت کی، ادیبوں سے محبت کی اور کتابوں کے سرورق کی ڈیزائننگ اور تشریحی مصوری میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ انہوں نے اسے دوسرے یا تیسرے درجے یا محض ایک کمرشل جاب کبھی شمار نہیں کیا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں محض فیشن کے طور پر ہر وہ مصور جو چند مربع میلوں میں کوئی سماجی، سیاسی یا اقتصادی برتری پانے میں کامیاب ہوا اس نے اپنی بے ہنری کو چھپانے کے لیے سرورق کو آرٹ سے باہر کی چیز گردانا ہے۔ مجھے سرورق سے محبت اور سرورق کو مجھ سے محبت ہے۔ میں اسی کی بدولت گزشتہ صدی کے آخری

چالیس برسوں میں پاکستان میں پروان چڑھنے والی علمی اور ادبی دانش کے ارتقا کا شاہد ہوں۔ میں نے ان گنت ناولوں کے سرورق بنائے، میں نے افسانوں کے لاتعداد مجموعوں کے سرورق بنائے، میں نے شاعری کی بے حساب کتابوں کے سرورق بنائے اور اردو ادب کی تاریخ اور تنقید کی کتابوں کے بے شمار سرورق بنائے اور متن کے اعتبار سے ناول، افسانہ، تنقید، غزل، نظم، نعت، مرثیہ اور تاریخ کے سرورقوں میں امتیاز ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ سرورق کا ڈیزائن مجھے عہد بہ عہد حریص لذت تخلیق بناتا چلا آیا ہے۔ کتاب کے سرورق کا محض چند مربع انچ رقبہ دل عاشق کی طرح پھیلے تو میرے تخلیقی تجربات کی لیبارٹری ہے اور سمٹے تو ایک آئینہ ہے۔ جس میں اپنے فنی خدوخال میں سنوارتا چلا آ رہا ہوں۔ یہ سرورق ایک چوکھٹا ہے ایک فریم ہے اور میرے تجربہ وجدان کی کھڑکی ہے جس میں سے میں مشاہدۂ کائنات کرتا ہوں۔

پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے مطابق میں نے گزشتہ صدی کے اختتام تک ۱۸ ہزار سے زیادہ سرورق تخلیق کیے ہیں۔ جو غالباً ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر ہر کتاب ایک کھڑکی ہے تو اٹھارہ ہزار کتابوں کے مصنف اس کھڑکی میں سے جھانکتے ہوں گے۔ اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے کانفرنس ہال میں ''پاکستان کی تخلیقی کائنات'' اسی سرورق کی کھڑکی اور مصنف کے خیال کی تصویری صورت ہے اور برادرم افتخار عارف کا مسلسل تعاون اگر مجھے حاصل نہ رہتا اور برادرم فخر زماں اس کے لیے کل وسائل فراہم نہ کرتے تو شاید یہ تصویری منصوبہ محض ایک خیال سے آگے نہ بڑھ سکتا۔ ''پاکستان کی تخلیقی کائنات'' پینٹ کر کے میں نے پانچ سو پچاس پاکستانی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے خدوخال آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیے ہیں۔ اس میں قومی زبان اردو کے علاوہ تمام علاقائی زبانوں، یعنی پشتو، ہندکو، پنجابی، سرائیکی، سندھی، براہوی اور بلوچی کے نمائندہ لکھنے والے شامل ہیں۔ ''پاکستان کی تخلیقی کائنات'' پاکستان کی قومی یک جہتی کی مظہر اور مصوری میں پاکستانی ادب کی اب تک سب سے گراں قدر خدمت ہے۔ جب یہ منصوبہ مکمل ہوا تو ''دی مسلم اسلام آباد'' نے لکھا کہ صرف دو پاکستانی ادیب ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اسلم کمال نے نہ جانے کس طرح ۵۵۰ ادیب ایک چھت کے نیچے جمع کر دیے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے اس تصویری منصوبے کو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کرنے کی سفارش کی۔

''پاکستان کی تخلیقی کائنات'' کے عنوان سے یہ تصویری منصوبہ سات میورلز پر مشتمل ہے۔ ہر ایک میورل کو ایک کہکشاں شمار کرتے ہوئے یہ کائنات سات میورلز یعنی سات کہکشاؤں پر مشتمل ہے۔ مجھے بے حد تسلی اس بات کی ہے کہ میرے اندر کی کائنات میں جو کہکشائیں ہیں ان میں سے سات کہکشائیں اکادمی ادبیات پاکستان کی دیواروں پر سجا کر ان میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی ماورائی رہائش کا انتظام کر دیا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ پاکستان کے دو شہروں میں دو قومی عمارات کے اندر میرے عشق کتاب کی مظہر دو آرٹ گیلریاں قائم ہو چکی ہیں۔

مجھے کتاب لکھنے والوں کے چہروں میں خاص دلچسپی ہے۔ مجھے ان کے خدوخال سے بے نشاں کاغذوں کو باتصویر کرنے کا پہلے دن سے بہت شوق ہے۔ چنانچہ میں نے ان گنت ادیبوں کے خاکے بنائے ہیں۔ خاکہ (Sketch) شخصیت کی اجمالی شباہت کو کہتے ہیں۔ جس میں خاکہ نگار (مصور) کم سے کم لکیروں میں شبیہ (Portrait) کی بنیادی شناخت نگاری کرتا ہے۔ ایک دفعہ محمد طفیل مدیر نقوش نے مجھے علامہ نیاز فتح پوری کا خاکہ نقوش کے لیے بنانے کو کہا۔ میں نے علامہ صاحب کے چہرے پر موٹی اور مضبوط لائنوں سے ان کے خدوخال بنائے۔ آنکھوں پر موٹے فریم کی عینک جمائی اور اپنے ہنر کی سادگی یہ دکھائی کہ علامہ صاحب کی آنکھیں نہ بنا کر بھی مشابہت سو فیصد برقرار رکھی۔ مگر اہل نظر نے اس سادگی میں پرکاری ڈھونڈ ہی لی اور طنز کے تیر تلاش

کر لیے۔ یہاں تک کہ خود علامہ نیاز فتح پوری نے مدیر نقوش کو تحسین کا خط لکھا جسے پڑھ کر میرے دل میں علامہ صاحب کے لیے عزت اور زیادہ بڑھ گئی۔

طنز و مزاح انسانی مزاج کا حصہ ہے۔ طنز و مزاح محبت اور نفرت کے جذبوں کا رخ انتہا پسندی کی بجائے اعتدال کی جانب موڑ دیتے ہیں۔ تصویری صورت میں طنز و مزاح جلوہ گر ہو تو وہ تصویر کارٹون یا کیری کچر کہلاتی ہے۔ کارٹون میں شریر اور مسکراتی ہوئی ڈرائنگ طنزیہ اور مزاحیہ معنی آفرینی کرتی ہے۔ کارٹون ایک قہقہہ ہے، جب کہ کیری کچر میں جسمانی امتیازات میں مزاحیہ یا طنزیہ تصرف کر کے معنی آفرینی کی جاتی ہے۔ کیری کچر ایک رمزیہ مسکراہٹ ہے۔ کارٹون کی طرف میں نے توجہ نہیں دی۔ کیونکہ اس میں دلآزاری کا احتمال رہتا ہے۔ ویسے میرا اپنا مسلکہ یہ ہے کہ میں صرف دھیمے لہجے میں بات کرتا ہوں اور زیر لب مسکراہٹ کو ہی نعمت رب جلیل شمار کرتا ہوں۔ میں اونچا نہیں بول سکتا اور قہقہہ بلند کروں تو احتجاج میں آنکھ پرنم ہو جاتی ہے۔ آنکھ کے اس فعل سے مجھے اپنے جسم کے کسی عضو کے مبتلائے درد ہونے کا احساس ہوتا ہے اور اعلیٰ ترین درد تو دردِ دل ہے اگر یہ دولت حاصل ہے تو اس کی نگہبانی ہونی چاہیے۔..... چنانچہ میں نے کارٹون سے گریز کیا اور کیری کچر میں نے توہین و تحقیر سے پاک معصوم مزاح اور طعن و تشنیع سے آزاد طنز کو ہمیشہ اپنے موقلم ہدف ٹھہرایا ہے۔

چنانچہ ''ماہ نو'' کے لیے میں نے کئی برس تک کیری کچر زبنائے۔ یہ سلسلہ کشور ناہید کے دورِ ادارت میں شروع ہوا۔ بلکہ کشور جب ماہ نو کو ایک کامیاب ماہنامہ بنانے کے لیے دن رات غور و فکر کر رہی تھی اور اس کے لیے نت نئی دلکشیاں متعارف کروا رہی تھی، یہ کیری کچر کا خیال اس کے ذہن میں ہی پہلے پہل پیدا ہوا تھا، لیکن یہ جو مشہور ہے کہ سرکاری نوکری کسی کی جورو نہیں ہوتی لیکن داشتہ ہر کسی کی بن جاتی ہے، ایک اور خاتون کو جب مدیرہ بنا دیا گیا تو اس بے چاری نے کیری کچر کی مقبولیت سے گھبرا کر یہ سلسلہ مختلف بہانوں سے ختم کر دیا۔

'ماہ نو' کے لیے جو کیری کچر میں نے بنائے ان میں خواتین اور حضرات دونوں شامل تھے۔ ان کیری کچرز میں طنز و مزاح اور تحسین و تعریف کے لیے جو علامات میں نے استعمال کیں وہ سب کی سب بالالتزام کتاب سے متعلق تھیں۔ یعنی کتاب، کتابوں کے انبار، کتاب کے اوراق، قلم، دوات، کاغذ، کلپ، پن، مسطر، پرکار، پیپر ویٹ، حرف، لفظ وغیرہ اور کتاب کی برکات کی علامت کے طور پر پھول، خوشبو، چاند، ستارہ، سورج، درخت، پتے، چڑیا، بلبل، غزال، غزالی آنکھیں، پری چہرہ اور پری پیکر وغیرہ وغیرہ۔ ہر ایک کیری کچر پر بے حد داد وصول پائی۔ لیکن بے حد احتیاط کے باوجود اور کسی بھی طرح کی دل آزاری سے ممکنہ حد تک پرہیز و گریز کے باوصف بھی اختلاف کے پہلو نکل آئے۔ قتیل شفائی مرحوم کو اپنا کیری کچر پسند نہ آیا۔ ہم نے دوسرا بنا دیا وہ خوش ہوئے ہمارا خدا خوش ہوا۔ ساقی فاروقی کی طرف سے خط میں کشور کے لیے پیار اور ہمارے لیے گالی آئی۔ شان الحق حقی صاحب نے برا مانا۔ یہ مجھے کسی سے معلوم ہوا۔ مرتضیٰ برلاس نے شکوہ کیا کہ میرا موقلم ان کے حسن و جمال کو کاغذ پر اتارنے میں ناکام رہا ہے۔ ایک عجیب اتفاق جس سے خود میرا دل لہو ہو گیا تھا وہ یہ کہ مرحوم رئیس امروہی کی زندگی میں ان کا کیری کچر بنایا اور روزنامہ جنگ کے ساتھ ان کی طویل رفاقت کی بنا پر میں نے جنگ اخبار کا ایک حصہ پیرہن کے طور پر کاٹ کر ان کے پیکر پر چسپاں کر دیا۔ انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ کسی شقی القلب کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ ایک دن اتفاقاً ان کا کیری کچر میرے سامنے آیا۔ انجانے میں اخبار کا وہ حصہ جو کیری کچر میں ان کے پیرہن کے طور پر میں نے کاٹ کر چپکایا تھا اس پر ذرا غور کیا تو دیکھا کہ اخبار کے اس حصے پر راولپنڈی میں لیاقت علی خان کی گولی سے شہادت کا واقعہ لکھا تھا۔ میں حیرت سے بت بن گیا۔ یوں لگا جیسے

سنسناتی گولی کتاب میں سے گزر گئی تھی۔ کتاب جس سے مجھے عشق ہے اور کتاب، جس کو لکھنے کا خیال میرے ذہن میں میری عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا آ رہا تھا۔ گولی یقیناً بندوق سے نکل کر اپنے ہدف کی طرف جاتی ہوگی۔ مگر گولی چلنے کی بات چل نکلے تو انسان بھولی بسری یادوں کے راستے پر چل نکلتا ہے۔

مشہور شاعر اور ماہر تعلیم جناب شوکت واسطی گورنمنٹ کالج کوہاٹ میں ہمارے وائس پرنسپل تھے۔ انہوں نے بلا کا حافظہ پایا اور انتہائی شفقت اپنے شاگردوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ جب ہم ذرا نامور مصور ہو گئے تو اس وقت وہ گورنمنٹ کالج نوشہرہ میں پرنسپل تھے۔ ہمیں بچوں کی مصوری کے مقابلے میں ایک جج کے طور پر اور محمد طفیل مدیر نقوش کو ایک ادبی نشست کی صدارت کے لیے دعوت دی۔ ہم دونوں نوشہرہ پہنچے۔ وہاں ایک سول جج بڑے علم پرور اور ادب دوست تھے نام ذہن میں نہیں آ رہا۔ ان کے گھر پر ناشتہ کے بعد موصوف نے کچھ گرینیڈ بم کچھ برین گنیں دکھانے کے بعد بھانت بھانت کی بندوقیں ہمیں دکھانی شروع کر دیں۔ ایک بندوق میرے ہاتھ میں زبردستی دے کر اس کی ساخت اور کارکردگی کے باب میں قصیدہ خوانی کرتے جاتے اور مجھے اس بندوق کو چلا کر دیکھنے کے لیے کہتے جاتے۔ اس یقین دہانی کے ساتھ کہ بندوق میں گولی وولی نہیں ہے۔ بندوق بالکل خالی ہے۔ میں نے ان کے اصرار پر تقریباً زچ ہو کر لبلبی دبا دی۔۔ ایک دھماکہ ہوا اور گولی محمد طفیل سے کوئی بال برابر فاصلے سے گزر کر مکان کی چھت میں شگاف کر گئی۔ تمام حاضرین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے ہی رہ گیا۔ طفیل صاحب پیلے زرد اور ایک بے چارگی کا نمونہ اور میں ایک عالم بے بسی میں پتھرا کر رہ گیا۔ اور سول جج صاحب ایک مجرم کی طرح ہاتھ جوڑے کھڑے اور لڑکھڑاتی زبان سے قسمیں کھاتے جاتے تھے کہ ان کے خیال میں بندوق سو فیصد خالی تھی۔ ایک لمحے کے اندر ساری پرلطف سیاحت کا نشہ ہرن ہو گیا۔ میری قوت مدافعت لمحہ بہ لمحہ جواب دیتی جا رہی تھی اور وقفے وقفے سے کپکپی چھڑ جاتی اور سارا وجود اس تصور کی ہولناکی سے لرزنے لگتا کہ یہ گولی اگر خدانخواستہ۔۔ خدانخواستہ۔۔ یہ گولی جہاں سے گزر گئی ہے وہاں سے اس کا راستہ بال برابر مختلف ہوتا تو یہ گولی ایک بے حد قیمتی اور اعلیٰ انسان کو ختم کر دیتی۔ ایک زندہ روایت کو ہلاک کر گئی ہوتی۔ اس ایک گولی سے نقوش کا افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، ادب عالیہ نمبر اور لاہور نمبر گھائل ہو کر زمین پر تڑپ رہے ہوتے۔ اس ایک گولی نے پطرس نمبر، شوکت تھانوی نمبر، اقبال نمبر، غالب نمبر، میر تقی میر نمبر اور میر انیس نمبر کے چیتھڑے اڑا دیے ہوتے۔ اس بندوق میں ایک فراموش شدہ گولی سے نقوش کا زیر ترتیب ''رسول نمبر'' شہید ہو گیا ہوتا۔ میرے ہاتھ سے محمد طفیل۔۔ میرے ہاتھ سے۔۔! وہ محمد طفیل جو کہا کرتا ہے کہ اسلم کمال نقوش کا سرورق بناتا ہے تو اسے دیکھ کر مجھے نیا شمارہ چھاپنے کی تحریک ہوتی ہے۔ وہ مدیر نقوش میرے ہاتھ سے!!! لاہور کے ریگل چوک میں مسجد شہدا جب نئی نئی تعمیر ہوئی تو اس کے ڈیزائن اور قبلہ کے بارے میں بڑی لے دے ہوئی تھی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس مسجد کے مخروطی مینار کی بنیاد میں ایک مضبوط آہنی بکس کے اندر مملکت خداداد پاکستان کے کچھ سکے اور نقوش کا لاہور نمبر آئندہ زمانوں کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ہر زمانے کے افکار اور اوراق پریشان ہوتے ہیں جو اپنے مدیر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اردو ادب میں محمد طفیل ایک روایت کا نام ہے۔ روایت ہلاک نہیں ہوتی بلکہ شہید ہو کر عہد بہ عہد اپنی تعمیر نو کرتی ہے ہر دم جواں پیہم رواں رہتی ہے۔ مسجد شہدا کا نوکیلا مینار اصل میں شہید سپاہی کی بندوق کے ساتھ سنگین ہے۔ اور کثیر الاضلاع احاطے پر گول چھت مسجد کے فن تعمیر کی روایت میں گنبد اور معرکہ وجود میں شہید کا ہیلمٹ بھی ہے۔

۱۹۶۵ء میں ۶ ستمبر کو جب بھارت نے پاکستان پر جنگ مسلط کی تو محمد نگر کے ایک مکان کے روشن دان، کھڑکیاں اور

دروازے کالے کاغذ سے بلیک آؤٹ کر کے میں نے سترہ دنوں اور سترہ راتوں کی اس جنگ میں سترہ پینٹنگز کیں۔ یہ پاکستان میں مزاحمتی مصوری کی ابتدا تھی۔ الحمرا آرٹس کونسل کے سیکرٹری نعیم طاہر نے الحمرا میں ان تصاویر کی نمائش کی اور نقوش نے اپنے جنگ نمبر میں ان میں سے کچھ تصاویر شامل کیں۔ ان میں ایک تصویر بلکہ پہلی تصویر کلمہ طیبہ کی خطاطی ہے۔ یہ خطاطی ایک ہنگامی اسلوب میں ہے جو بعد میں میرے ایجاد کردہ خط کمال سے برائے نام مشابہت کی دعویدار ہو سکتی ہے۔

۷ ستمبر کی صبح ڈیوس روڈ پر چہل قدمی کرتے بندوق، ٹینک اور ہوائی جہاز کی جنگ کے ماحول میں اپنے نعیم کے ساتھ خوابوں کے میدان میں بقا کی جنگ کا آغاز کرتے ہوئے میں نے اپنی پہلی نظم کہی تھی۔ میں ایک تخیل زدہ مضطرب نوجوان تھا جسے بھارتی جارحیت نے شاعر بنا دیا تھا۔ شاعر بننے کا احساس بہت اعتماد آفریں تھا۔ یوں لگتا تھا، گویا میں نے ایک نظم نہیں کہی بلکہ اپنے خیالوں میں پھر پھڑانے والی کتاب کا پہلا صفحہ تصنیف کر ڈالا تھا۔ یہ تصنیف و تالیف یہ ترتیب و تدوین اور یہ تشکیل و تخلیق عجب سحر آفریں اصطلاحیں ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کب کوئی فنکار ان میں فٹ اور کب مس فٹ ہو جاتا ہے۔ فٹ ہونے کے حوالے سے مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ اگر محمد طفیل ابتدا میں تاج زریں رقم جیسے بلند پایہ خطاط کے ایک ایسے شاگرد نہ ہوتے کہ استاد نے شاگرد کی ہنرمندی دیکھ کر اپنی کلائی سے گھڑی اتار کر شاگرد کی کلائی پر باندھ دی تھی۔ بعد میں یہی محمد طفیل مدیر نقوش نہ ہوتے اور آپ بیتی نمبر کی ضخامت کے پیش نظر اس کے لیے ایک ڈبہ نہ بنواتے اور ڈبے پر آپ بیتی کا مفہوم بیان کرتا ڈیزائن مجھ سے نہ بنواتے اور میں سادگی اور اختصار سے زندگی کے تین مدارج میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا ایک ہرن نہ بناتا اور اس دید معکوس کی لہروں پر مترنم لفظ ''نقوش'' محمد حسین شاہ صاحب یوں نہ لکھتے کہ یہ تمیز کرنا ممکن ہی نہ رہا کہ قلم کی کرشمہ کاری اور موقلم کی معجز نگاری آپس میں کہاں ملتی اور کہاں پر جدا ہوتی ہیں۔ میرے ڈیزائن پر محمد حسین شاہ صاحب نے لفظ اسی طرح لکھ دیا تھا جس طرح لکھنے کی میں تمنا کرتا تھا اور تمنا کی اس تشفی نے مجھے اس ماحول میں جرأت آزما بھی بنا ڈالا، جس میں طفیل صاحب جیسا مدیر تھا جو فن خطاطی کی باریکیوں سے واقف تھا اور محمد حسین شاہ جیسا خطاط تھا جس کا کوئی مثل نہیں تھا۔ میں نے شاہ صاحب سے طفیل صاحب کی موجودگی میں پوچھا۔ قبلہ شاہ صاحب! اگر کوئی مصور دو تکونیں اوپر نیچے رکھ کر کہے کہ یہ دو آنکھوں والی ''ھ'' ہے تو کیا آپ اس کے کان کھینچیں گے؟ میں نے یہ سوال اس دن کر کے یہ جانا کہ محمد حسین شاہ کے سینے میں خطاط کے دل کے ساتھ ایک دل مصور کا بھی دھڑکتا ہے۔ محمد طفیل کی حوصلہ افزا مسکراہٹ میں محمد حسین شاہ نے اپنی شاباش ملا کر میرے کاندھے یوں تھپتھپائے کہ گویا کہہ دیا:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

کنڈنسکائی، پکاسو، براک اور پال کلی کی طرح میں اپنا ایزل اٹھا کر کوچہ ہنروراں کو چلا۔ میں نے مسطر اور پرکار سے پیٹ موندریان کی چوکوروں کو مزید چوکوروں میں اور مستطیلوں کو مثلثوں میں منقسم کر کے ان میں دائرہ کا اضافہ کیا اور ہندسی اشکال کے اس آئینہ خانے میں ابن مقلہ، میر علی تبریزی، عماد الحسینی، حامد علی تاج، امام ویروی، ہاشم البغدادی اور پروین رقم کے کمال فن کی عکس در عکس تجلیوں کا مشاہدہ مجھے اس دھیان میں زینہ بہ زینہ اتارنے لگا، جہاں ہر ایک دروازہ مجھ پر کھلتا چلا گیا اور میں حجرہ در حجرہ اور زاویہ در زاویہ منکشف ہوتا ہوا ہنر کی کارگاہ سے کشف و کرامات کی اس درگاہ تک چلا گیا، جہاں آوازیں حروف کے پیکروں میں ڈھلتی ہیں اور حروف کے سانچے عہد بہ عہد بدلتے ہیں۔ میں نے بصد عجز ''العلم'' کے دربار میں ابجد کے لیے اپنے عہد کا پیرہن نذرانے میں پیش کیا اور انعام کے طور پر خط کمال اپنے دامن میں لے کر لوٹا اور اپنے خارج میں ظاہر ہو گیا۔ میرے اس اجتہاد کو روایتی خطاط حضرات نے پذیرائی بخشی اور مصور خطاطین کے لیے یہ نیا اسلوب ایک سرچشمہ تحریک بن گیا۔ انجمن خوش نویساں ایران نے

خط کمال

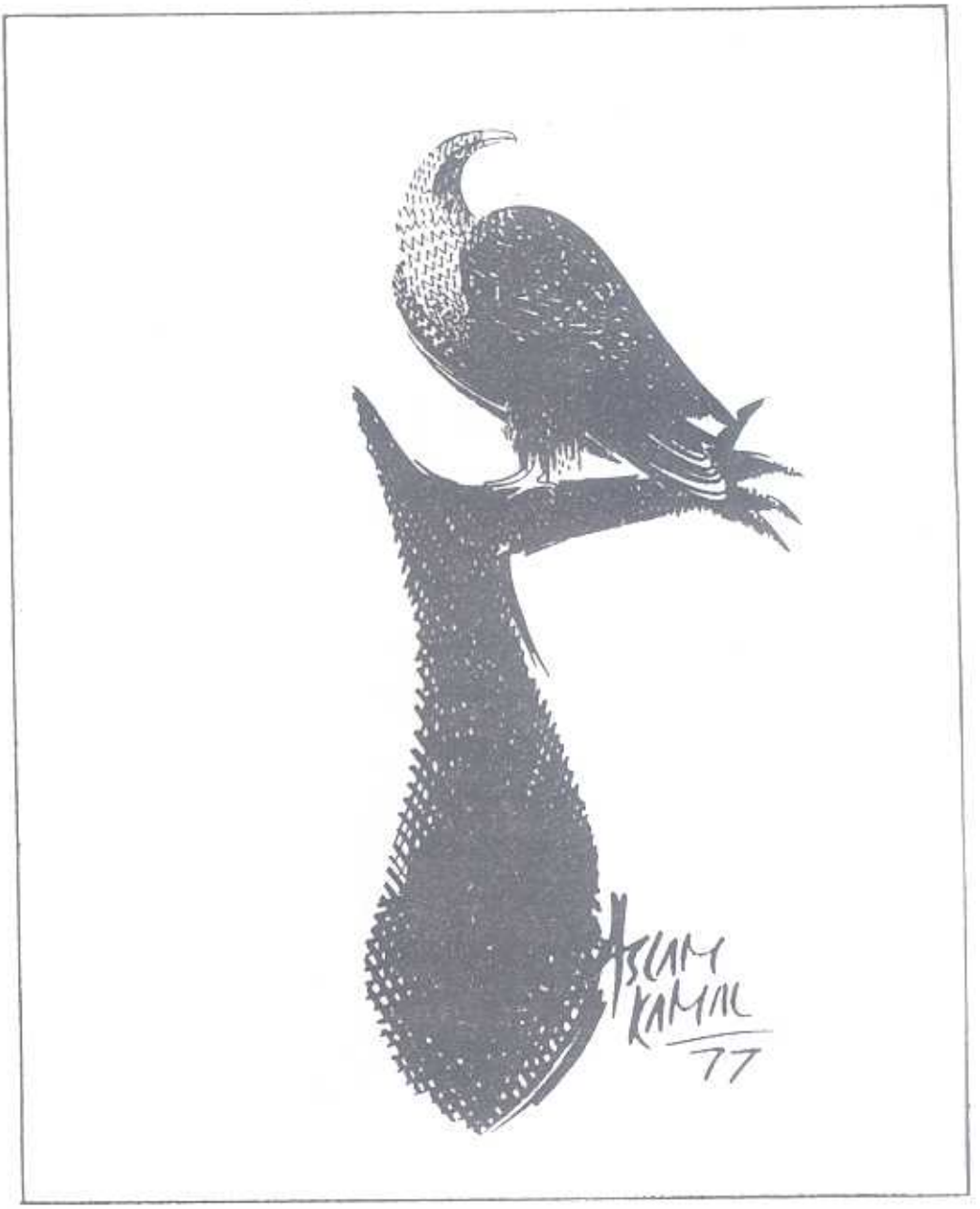

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اس کی تحسین کی اور ناقدین فن نے اسے نستعلیق کی ایجاد کے بعد کی صدیوں کا اہم کارنامہ قرار دیا۔ میں نے حروف ابجد کی موٹی اور مضبوط لائنوں کے سٹرکچر کو اسلامی فن تعمیر کے امتیازی محاسن سے معنی آفریں کر کے خطاطی کو اپنی مصورانہ خطاطی بنا دیا۔ وزارت خارجہ پاکستان نے اس مصورانہ خطاطی کے دوسو سے زائد نمونے دنیا بھر کے پاکستانی سفارت خانوں میں آویزاں کیے۔ غیر ملکی سربراہوں کو یہ مصورانہ خطاطی پاکستان کے قومی تحفہ کے طور پر پیش کی گئی۔ صدر پاکستان نے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ نیویارک کو اس مصورانہ خطاطی کا تحفہ دیا۔ اسلام آباد میں کانسٹی ٹیوشن ایونیو پر ایوان صدر، پارلیمنٹ ہاؤس اور سپریم کورٹ آف پاکستان سے متصل وزیر اعظم سیکرٹریٹ کی عمارت کی فوٹو کے ساتھ اس مصورانہ خطاطی کا نمونہ لگا کر ''پاکستان آبزرور'' اسلام آباد نے نیچے عنوان دیا۔ ''اسلام آباد میں وزیر اعظم سیکرٹریٹ کی عمارت کی صورت میں اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی زیر تعمیر ہے''۔ یہ سب کچھ جب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں ایک لطف بیکراں میں دیوانہ وار متلاشی تھا کہ یہ خوش اقبالی جو خوش خطی کی بخشش ہے یہ دولت بے بہا میں کس محیط میں مقید کروں، کس سمندر میں اسے سنبھالوں اور کس آسمان میں سجا کر رکھوں۔ کس کا ظرف اتنا لامتناہی ہے؟ آواز آئی۔۔ میرے اندر سے۔۔! کتاب، کتاب۔ لاریب کتاب ہی ایک محفوظ ترین خزانہ ہے۔ پس میں نے حروف ابجد کی تشکیل نو اور پاکستان میں خطاطی کے اجتہادی عرصہ کا ریکارڈ ''اسلامی خطاطی۔ ایک تعارف'' نام کی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔

اکثر اوقات نہ سہی بعض اوقات اس طرح محسوس کرنا اچھا لگتا ہے کہ میں ایک خواب میں زندہ ہوں۔ میں ایک خواب سے بیدار ہو کر دوسرے خواب میں آنکھ کھولتا ہوں۔ میرا ارمان پاکستان میں ایک تخلیقی عہد کی تعمیر ہے اور میرے زیر عمل بھی ایک تخلیقی عہد ہے۔ میں پاکستان میں ایک تخلیقی عہد تراش رہا ہوں۔ قلم سے کتاب اور رنگ سے خیال اور خواہش سے خواب تک میں ایک تخلیقی عہد تعمیر کر رہا ہوں۔ احساس سے ادراک اور ادراک سے وجدان اور وجدان سے شعور اور شعور سے شعور شعور تک میں پاکستان کی تخلیقی کائنات میں سفر کر رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں کتاب کی قندیل ہے اور میرے کانوں میں حکیم مشرق نے نوازی کرتا ہے:

ہر ستارا جہاں است یا جہاں بود است

میں ایزل کھولتا ہوں، اس پر نیا کینوس جماتا ہوں۔ الفاظ کے اندر معانی، معانی سے ماورا مفہوم اور پس مفہوم سے لگ کر بیٹھے ہوئے امکانات کہکشاں در کہکشاں۔ میں اپنے ایزل پر کینوس کو آئینہ نما کر کے اس میں دیکھتا ہوں۔ میرے اردگرد میرے آس پاس بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، ارمغان حجاز، پیام مشرق، اسرار و رموز، زبور عجم اور جاوید نامہ ہے۔ کتابوں کے اوراق پھڑ پھڑاتے ہیں۔ اوراق سے رباعی، قطعہ، نظم اور غزل اڑ اڑ کر میرے کینوس پر غول در غول پھیل جاتے ہیں۔ میں بال جبریل میں سے لالہ صحرا نکال کر یہ ورق کینوس کے وسط میں چسپاں کر دیتا ہوں:

یہ گنبد مینائی یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی!

تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبہ پیدائی، اک لذت یکتائی
غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمی آدم سے ہنگامہ عالم گرم
سوز بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی
اے باد بیابانی! مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دلسوزی، سرمستی و رعنائی!

میرا سنوڈیو آوازوں سے بھر جاتا ہے۔ اتنی آوازیں! ازل سے ابد کو رواں دواں آوازیں ہی آوازیں۔ کسی کے ہونے کی آوازیں۔ کسی کے اقرار کی آوازیں اور کسی کے اثبات کی آوازیں ہی آوازیں۔ اقرا۔ اقرا ور بک الاکرم۔ میں بال جبریل کھولتا ہوں اور مسجد قرطبہ کا ایک ورق نکال کر کینوس کے وسط میں چسپاں کرتا ہوں۔ پڑھتا ہوں اور سوچتا ہوں۔ یہ شاعری ہے یا پیغمبری؟ اور اس سوال کے ساتھ ہی کینوس پر چسپاں ورق پر حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے شاعری اپنے تمام محاسن سمیٹ کر حاشیہ میں جمع ہو جاتی ہے اور خالی کردہ جگہ پر ایک کھڑکی نمودار ہو جاتی ہے۔ جس میں اس شاعری کا متن ایک ایسا منظر بن کر پھیل جاتا ہے جس میں فرش سے عرش کی جانب عظمت پذیر خاک زادے کو شمس و قمر و نجوم سجدہ کرتے اور کروبیاں مبارک باد کہتے نظر آتے ہیں۔ یہاں الہام اور القا آپس میں ایک ہوتے ہوتے پھر جدا ہو جاتے اور جدا ہو کر پھر ہم آہنگ ہونے کی تگ و دو میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں حور و فرشتہ کا شکار عام اور توڑ کر اپنا سبو کسی کے سرمست ہونے کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ ہر ایک معرکۂ وجود کے ہر طور سینا پر تجلی کا منتظر کلیم دکھائی دیتا ہے۔ اچانک یہاں خودی کے ایک ٹیلے کی اوٹ سے میرا مرشد حکیم نے نواز نکل کر میرے آگے آگے چلنے لگتا ہے اور میں اس کے پیچھے پیچھے اس کے نقش قدم پر چلتا ہوا اس کے دشت جنوں میں داخل ہو جاتا ہوں۔ اقبال میرا مرشد ہے اور میرے مرشد کے دشت جنوں میں ''جبریل زبوں صیدے'' اور ''یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ'' کا نعرہ مستانہ گونجتا ہے۔ میرا مرشد دانائے راز ہے۔ وہ کائنات کے ناتمام ہونے کا شعور رکھتا ہے۔ وہ رنگ و بو کے قافلے کا مدعا اور منتہا جانتا ہے۔ وہ عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا اور بھی جو زمانے ہیں، جن کا کوئی نام نہیں، وہ انہیں دیکھتا ہے اور جو حادثہ رونما ہونے کے لیے ابھی پردۂ افلاک میں ہے اس کا عکس ابھی سے اپنے آئینہ ادراک میں دیکھ لینے والا دیدۂ بینا ہے۔ وہ پرندوں کے سینوں میں ہاو ہو کی صورت میں اپنے لیے آواز پہچانتا اور برگ لالہ پر لکھا ہوا اپنے نام پیغام پڑھ لیتا ہے۔ اس لاشریک کا پیغام جس سے ہم کھوئے گئے ہیں جو ہماری جستجو میں ہے۔ میں اس کا ایک مرید ہوں میں ایک امی اور اس کا مصور ہوں۔ میں ابھی خاموشی و دل سوزی اور سرمستی و رعنائی کے لیے باد بیابانی کی چشم عنایت کا منتظر ہوں۔ مجھے سکوت لالہ و گل سے کلام کرنے کی زبان ابھی نہیں آئی ہے ابھی اس قابل نہیں ہوں کہ کہہ سکوں۔

میں صورت گل دست صبا کا نہیں محتاج

اس لیے میں اپنے مرشد سے نظریں بچا کر نکلتا ہوں اور دست صبا کی لہریں تھام کر فیض احمد فیض کے پاس چلا آتا ہوں۔ نادیدہ کا شوق دید اور نامعلوم کی آگہی کی لذت کا نشہ نایاب ہی سہی۔ لیکن جس کی دید وطلب وہم لگنے لگی ہو وہ اچانک روبرو سر رہگزار آ جاتا ہے تو صبح فردا کو پھر دل ترسنے لگتا ہے اور عمر رفتہ کا پھر اعتبار سا آ جاتا ہے۔ اس صورت میں ایزل پر آئینہ نما کینوس کا رخ میں مقتل شہر کی جانب کر لیتا ہوں جہاں سے قتل ہو کر روزانہ فیض احمد فیض آتا ہے، اسلم کمال آتا ہے۔ ہم قتل ہو کر ایک دوسرے کے ہمراز بنے ہیں۔ فیض میرا دوست ہے میرا مونس ہے۔ میں فیض صاحب سے کہتا ہوں۔ آپ نے جس بت کو چاہا اور اس کی چاہت میں شاعری کی، میں نے بھی اسی بت کو چاہا اور اس کی چاہت میں مصوری کی۔ ہم دونوں ایک ہی محبوب کے دو عاشق اور آپس میں رقیب ہیں۔ ایک شاعر ایک مصور۔ میں اس کی شبیہ پینٹ کرتا ہوں، آپ میرے ایزل کے پاس بیٹھیں۔ آئیں ہم تنہائی گھونٹ گھونٹ پئیں۔ آؤ ہم دونوں مل کر شرح فراق مدح لب مشکبو کریں۔

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے — جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے — دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا
آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر — اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے — جن کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

فیض صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں — اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ برسا ہے اسی بام سے مہتاب کا نور — جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

میں پوچھتا ہوں فیض کیا آپ نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ۔ زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے۔ فیض صاحب آپ پر انھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں۔ تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے؟ میرے استفسار پر فیض نے نیا سگریٹ سلگایا۔ ایک لمبا کش لیا۔ دھواں چھوڑا اور بولے۔

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے — اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے — جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

میں نے پوچھا۔ فیض صاحب میں نے آپ کی نظم ''تنہائی'' پینٹ کی یہیں کہیں پڑی ہوگی۔ آپ کو دکھاتا ہوں۔ میں یہ تصویر تلاش کرنے اٹھا تو محسوس کیا کہ فیض صاحب یکدم بے چین ہو گئے ہیں اور پھر وہ اٹھے انہوں نے میرے سٹوڈیو کی کھڑکی سے باہر دیکھا رات گہری ہو چکی تھی۔ انہوں نے نیا سگریٹ سلگایا اور کرسی کھینچ کر کھڑکی کے قریب کی اور اس پر بیٹھ کر پھر باہر دیکھنے لگے۔ میں نے ان کے اندر کا اضطراب بھانپ کر کہا:

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
سب ستارے سر خاشاک برس جائیں گے

فیض صاحب بہت زیادہ بے چینی محسوس کرنے لگے انہوں نے ابھی ابھی سلگایا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں دبا کر بجھایا

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا ، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی ، ترک مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنا سوا یاد نہ آئے گا کوئی!
ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کہ پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے

قائداعظم لائبریری کی مطبوعات

۱-ابتدائی فلکیات	خالد مسعود	-/20روپے
۲-پودوں کی زندگی	خالد مسعود	-/30روپے
۳-مسلمان اور سائنس	خالد مسعود	-/30روپے
۴-عالم حیوانات	خالد مسعود	-/20روپے
۵-کرہ زمین	خالد مسعود	-/20روپے
۶-کلیاں میرے گلشن کی	عبدالرحمٰن خالد	-/20روپے
۷-اصطلاحات حدیث	ڈاکٹر محمد سعد صدیقی	-/80روپے
۸-علم حدیث اور پاکستان میں اس کی خدمت	ڈاکٹر محمد سعد صدیقی	-/100روپے
۹-اسلامی آداب	سید عبدالرحمٰن بخاری	-/100روپے
۱۰-اسلامی قانون کا نظریہ مصلحت	سید عبدالرحمٰن بخاری	-/190روپے

ملنے کا پتا: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

Calligraphy

Oil on Canvas 24" x 36"

Faiz Ahmad Faiz (Poet)

Water Colour 10" x 15"

علامہ اقبال کا تصور ریاست

ڈاکٹر وحید قریشی

علامہ کے تصور ریاست کو سمجھنے کے لیے پہلے پانچ امور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

علامہ اقبال فلسفے کے طالب العلم تھے اور ۱۹۰۸ء تک ان کی بنیادی دلچسپی مابعد الطبیعیاتی مسائل سے رہی۔ ۱۹۱۰ء کے بعد ان کی توجہ کا مرکز ''مابعد الطبیعیات'' کی بجائے ''معاملات'' ہو گیا۔

انہوں نے اسلام کی تاریخ اور مغرب کی تہذیبی و علمی پیش رفت کا بغور مطالعہ کیا اور قرآن و حدیث کے حوالے سے اپنے بنیادی فکری رویوں کی تشکیل و تعمیر کی اور ان عناصر پر خاص طور پر غور کیا جو جدید زمانے میں ہماری تہذیبی، فکری اور سیاسی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ مغربی فکر کی نشوونما کے وہ عناصر (جو ترقی کے عناصر ہیں) علامہ کو خاص طور پر اہم نظر آئے جن سے مشرق استفادہ کر سکتا ہے۔ وہ ان عناصر کو جو قرآن پاک میں بھی موجود ہیں عالمگیر اقدار کا حامل قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے نزدیک ان اقدار کی طرف واپسی گویا عالم اسلام کے لیے اپنے ہی سرچشموں کی طرف مراجعت ہے۔

عرب میں اسلام کی ابتدائی سیاسی ترقی ایک پس ماندہ Primitive سوسائٹی میں اسلامی اصولوں کا سادہ سا استعمال ہے۔ رسول پاک ﷺ اور خلفائے راشدین کا زمانہ قرآنی اصولوں کی سادہ عملی شکل ہے، جس سے کئی راہنما سیاسی اصولوں کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد اسلامی سلطنت سیاسی سطح پر خلافت سے ملوکیت میں بدل گئی۔ یہ پیش رفت قرآنی اصولوں کے مطابق نہ تھی۔ جیسے جیسے مسلمان فتوحات میں مصروف رہے اسلامی معاشرے کے ذہین طبقے سیاست کی بجائے علمی اور ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے اور سیاست کا میدان اوسط درجے کے افراد کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اس سے اسلامی سیاسی اداروں کی عملی نشوونما رک سی گئی۔

ایران سے واسطہ پڑنے کی وجہ سے اسلام تہذیبی طور پر ایک دیہی کلچر سے شہری تمدن میں منتقل ہوا۔ علامہ کے نزدیک عرب میں اسلام کی تہذیبی روایت یک طرفہ تھی جو ایران میں آنے کے بعد اپنی تکمیلی منزل کی طرف روانہ ہوئی اور آئندہ صدیوں میں اگرچہ سیاسی سطح پر ایران کے منظم سیاسی نظام کو پوری طرح اختیار کر لیا گیا۔ یہ ایک تقلیدی رجحان تھا۔ اس سے کہیں زیادہ پیش رفت علمی و ادبی اداروں میں ہوئی۔ اس لیے مسلمانوں کے سیاسی تصورات کی ابتدائی عملی شکلوں کے علاوہ ان فکری رویوں کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے جو علما اور صاحب بصیرت سیاسی مفکرین نے عطا کیے۔ مسلمانوں کی سیاسی فکر کو منظم کرنے کے لیے سیاسی اداروں کے علاوہ سیاسی مفکرین کے خیالات سے بھی خوشہ چینی ضروری ہے۔ اشاعرہ کی فلسفیانہ موشگافیاں اگرچہ انتہا پسندانہ تھیں لیکن مسلمانوں کے سیاسی فکر کی نشوونما میں انہوں نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح معتزلہ کی فکری کارگزاریاں بھی توجہ طلب ہیں۔ پھر ماہرین فقہ میں امام الماوردی اور امام غزالی، فلاسفہ میں الفارابی، ابن رشد اور ماہر علم سماجیات میں ابن خلدون اور پچھلی صدی میں شاہ ولی اللہ کے افکار سے بھی روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہو گی کیونکہ فکری سطح پر بہترین کارگزاری کا اظہار انہی

دانشوروں کی تحریروں میں ہوا ہے۔ یہی اصل فکری سرچشمے تھے۔ یہ لوگ سیاسی عمل میں شریک نہ سہی، تہذیبی حوالے سے ہماری میراث کی تشکیل میں اہمیت رکھتے ہیں۔

۵۔ سماجی زندگی مسلسل تہذیبی عمل ہے۔ اسلام تیس برس کے بعد نئے سیاسی اداروں کی تشکیل کے لیے زیادہ اہم قوت تو نہ رہا لیکن مسلمانوں کی فکری نشوونما تہذیبی حوالے سے بدستور جاری رہی۔ اس لیے اسلامی معاشرے کے تہذیبی عنصر ایک اہم حقیقت بن گئے۔ اسلام کی ترقی اور پیش رفت میں سماجی عناصر کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسلام صرف مذہب نہیں، دین بھی ہے یعنی ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جس میں روحانی اور مادی قدروں کو بیک وقت اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے ہم اسلام کی عملی صورتوں کے مطالعے کے وقت سوسائٹی کی عہد بہ عہد ترقی اور تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسلامی اصول ازلی اور ابدی ہیں کیونکہ یہ عالمگیر اقدار پر مبنی ہیں۔ ان اصولوں کی تعبیر اور تشریح اور اطلاقی پہلوؤں کو ہر زمانے اور ہر دور میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ زندگی ایک بدلتی ہوئی اور ترقی پذیر حالت کا نام ہے۔ اس اعتبار سے ہر زمانے میں ان اصولوں کے اطلاقی پہلو نئی تعبیر اور نئی تشریح کے متقاضی ہیں۔ ختم نبوت کی یہ اہمیت ہے کہ اب انسان کو مزید ترقی کے لیے خود اپنی ذہانت پر بھروسہ کر کے آئندہ کا راستہ خود متعین کرنا ہوگا۔

۲

علامہ اقبال کے ذہن میں یہ مسائل کیوں ابھرے؟ اس کے اور بھی کئی عوامل ہوں گے لیکن سب سے زیادہ برصغیر پاک و ہند کے سیاسی اور تمدنی مسائل تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے ہاں یہ احساس شدت اختیار کر گیا تھا کہ برصغیر کے سیاسی حالات کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کو جن خطوں میں عددی اکثریت حاصل ہے وہاں انہیں آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ الگ ملک کا یہ مطالبہ محض اقتصادی اغراض یا دوسرے مادی فوائد کے لیے نہ تھا بلکہ اپنے کلچر اور اپنی روایات و مذہب کی حفاظت کے لیے تھا۔ دوسری اور تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (۳۲-۱۹۳۱) کے بعد تو علامہ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اختلافات کا واحد حل اور برصغیر کو فسادات سے بچانے کا واحد ذریعہ اس علاقے کو ''ایک یا ایک سے زیادہ'' مسلم ریاستوں کی تشکیل کے سوا کوئی اور نہیں۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اس کا برملا اظہار کر دیا۔ پھر اس نئی حکمت عملی کے لیے ایک سیاسی اور تمدنی سانچے کی ابتدائی تفصیلات وضع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح ان کی توجہ ''معاملات'' کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ مملکت خداداد کے لیے سیاسی ڈھانچے کی تلاش بھی کرتے رہے اور فقہ اسلامی کی تدوین نو بھی ان کی توجہ کا مرکز رہی۔ ان دو امور پر وہ ۱۹۳۸ء تک برابر غور کرتے رہے۔ سیاسی سانچے کے بارے میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ علامہ نے ہمیں کوئی بنا بنایا ماڈل نہیں دیا۔ انہوں نے صرف بعض اصولوں کی نشان دہی کی اور کچھ تفصیلات مہیا کر دیں جو ماڈل بنانے میں کام آ سکتی ہیں۔ ماڈل اس لیے نہیں دیا کہ ہر زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات روبہ تغیر رہتے ہیں۔ اس لیے ہر زمانے کو اپنا ماڈل اپنے حالات کی روشنی میں خود وضع کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے صرف جدید حالات کی روشنی میں پیدا ہونے والے رویوں اور بنیادی اصولوں کی طرف واضح اشارے کر دیے ہیں جن سے ہم اپنا سیاسی نظام وضع کر سکتے ہیں۔

اسلامی ریاست کی تشکیل میں ان کے سامنے مشرق ہی نہیں مغرب بھی تھا۔ مشرقی اداروں کے ماضی کے علاوہ وہ مغربی ممالک کے ماضی کو بھی تجزیے کا موضوع بناتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ماضی، حال اور مستقبل ایک اکائی ہیں اور معاشرتی زندگی کو ماضی سے بھی استفادہ کرنا ہوتا ہے ورنہ معاشرتی تسلسل ٹوٹنے سے معاشرہ ہوا میں معلق ہو جاتا ہے اور اس کی جڑیں باقی نہیں رہتیں۔ اس تغیر اور تبدیلی کا عمل آہستہ آہستہ بنیادی روح کو قائم رکھ کر ہونا چاہیے ورنہ معاشرتی سانچہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں مغرب سے معاشرتی حالات کے تحت استفادہ تو کرنا چاہیے۔ پھیلتی بڑھتی زندگی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم نئے حالات کو جذب کریں۔ تاہم یہ عمل اپنی اساسی اقدار اور ثقافتی روح کو نظر انداز کر کے نہیں ہوگا بلکہ اس کی روشنی میں ہمیں آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوگا۔

اس حوالے سے سب سے پہلے علامہ کی توجہ مغرب کے قومی سلطنت کے تصور کی طرف گئی۔ یہ ادارے پچھلے تین سو سال میں بتدریج وجود میں آئے تھے۔ علامہ اقبال اس کا آغاز لوتھر کے ظہور سے کرتے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں لوتھر کی تحریک اٹھی جو بظاہر ایک مذہبی تحریک تھی۔ لوتھر نے رومن کیتھولک فرقے کے خلاف لبرل ازم کا رویہ اختیار کرتے ہوئے ایک پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ ایک سیاسی نظام کا بھی آغاز کر دیا۔ اس رویے کے بہت سے شاخسانے ہیں جن کی طرف علامہ اقبال نے چھٹے خطبے میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ارتقاء کے عمل کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا اور اجتہاد کے عمل میں یہ روش کس حد تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ لبرل ازم اگر بالکل آزاد ہو جائے (جیسے کہ لوتھر کے سلسلے میں ہوا) تو اس سے بربادی کی قوتیں بھی ابھرنے لگتی ہیں۔ جدید زمانے میں جو سلی برتری کا رویہ ابھرا اس کی ابتدا بھی لوتھر ہی کے ذریعے سے ہوئی۔ لوتھر کے اقدام سے اس سیاسی مسلک کا آغاز ہوا جس نے آزادی فکر کے ذریعے سے پوپ کے آفاقی نظام ہی کو رد نہیں کیا بلکہ اس سے یورپ میں قومی ریاستوں کے تصور کا آغاز بھی ہو گیا۔ قومیت کا یہ مغربی تصور علامہ اقبال کے نزدیک ریفارمیشن ہی کا شاخسانہ ہے۔ سیاسی یک جہتی نے علاقائی یک جہتی کی شکل اختیار کر لی جسے آگے چل کر روسو نے باقاعدہ سیاسی فلسفے کی شکل دی۔ عیسائیت کے آفاقی اخلاقی اصول قومی ریاستوں میں بدل گئے جس سے یورپ میں بڑی بڑی جنگیں رونما ہوئیں۔ علامہ اقبال ''قومی ریاست'' کے تصور کے سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ برصغیر میں وجود میں آنے والے نئے ملک کے لیے اجتہاد کو بڑی احتیاط کے ساتھ عمل میں لانے کی ضرورت ہے تا کہ اسلامی اصولوں کی تعبیر نو کر کے ایک نیا اسلامی نظام وضع کیا جا سکے جو دور حاضر کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ ان کی رائے میں نئی مملکت کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تدوین نو ہے جسے اختیار کرتے ہوئے ہمیں لوتھر کی انتہا پسندی سے بچ کر چلنا ہوگا۔ (خطبات اقبال ص ۱۲۹۔۱۳۰) علامہ اقبال نے اس کا بار بار ذکر کیا ہے چنانچہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں پر اس وقت دماغی اعتبار سے وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی لیکن چونکہ اسلامی تاریخ کی کوئی خاص شخصیت رہنما نہیں ہے، اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عالمۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لیے کیا کیا نتائج پیدا کیے''۔ (اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۴۳)

لوتھر سے شروع ہونے والی قومی ریاستیں جغرافیائی، لسانی، ثقافتی بنیادوں پر استوار تھیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطرہ مغربی قومیت کے تصور سے ہے۔ وہ اس کے شدید مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں قومیت کے بجائے ملت کا تصور ابھرے۔ وہ علاقے سے محبت کو نفسیاتی سطح پر قبول کرتے ہیں لیکن اس بات کے خلاف ہیں کہ یہ

تعصب ایک نصب العین بن کر ایک نئی بت پرستی کا پیش خیمہ بن جائے۔ انہوں نے عمر بھر اس کی مخالفت کی۔ ان کے نزدیک وطنیت کا تصور مکان سے نکل کر زماں کی طرف جانا چاہیے۔ یعنی مادی شکل وصورت سے بلند ہو کر یہ سفر اقدار کی طرف ہونا چاہیے۔ اسی سے ہم اس عالم گیر تصور کی طرف جا سکتے ہیں جو آج ہمیں اکیسویں صدی میں ایک گلوبل ویلج بنانے میں مصروف ہے۔ اقبال کا خیال یہ تھا کہ دنیا آہستہ آہستہ عالمگیر قدروں کی طرف جا رہی ہے۔ اسلام عالمگیر قدروں کا نقیب ہے، اس لیے اسے ترقی میں اس مرحلے پر ایک موثر کردار ادا کرنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے ان مقالات میں بھی کیا جو مولانا حسین احمد مدنی کے تصور وطنیت کے جواب میں لکھے گئے تھے۔ علامہ نے اپنے خطبات میں بھی واضح طور پر اس کی نشان دہی کی ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد ایک عالمگیر معاشرے کی تشکیل ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی شاعری میں بھی ''جمعیت آدم'' کا ذکر کیا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو لاہور کے نام ان کا جو پیغام نشر ہوا جس میں اس وقت دنیا میں جنگ و جدل کا حوالہ دیتے ہوئے لسانی اور نسلی امتیازات کے ذریعے ایک دوسرے کے قتل عام کی مذمت کی ہے۔ ان کی رائے میں مغرب میں یہ تفرقے قومی ریاستوں کا نتیجہ ہیں اور اس کا سبب اقتصادی ہے۔ اقتصادی وحدت کی تلاش دنیا کو ایک نظام میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"This one event shows clearly that national unity too is not a very durable force. Only one unity is dependable, and that unity is the brotherhood of man, which is above race, nationality, colour or language. So long as this so called democracy, this accursed nationalism and this degraded Imperialism are not shattered, so long as men do not demonstrate by their actions that they believe that the whole world is the family of God, so long as distinctions of race, colour and geographical nationalities are not wiped out completely, they will never be able to lead a happy and contended life and the beautiful ideals of liberty, equality and faternity will never materialise.

(Speaches and stateements of Iqbal. pp.299,300)

لوتھر نے جہاں مغرب کو مذہبی آزادی اور فکر ونظر کی نعمت عطا کی وہاں اس کی حد سے بڑھی ہوئی لبرل ازم نے نظام سیاست کو کئی خرابیاں بھی دیں جن میں سے ایک کا ذکر ضروری ہے۔ یہ خرابی اس طرح وجود میں آئی کہ عیسائیت انسان کا ذاتی مسئلہ بن گئی اور سماجی زندگی میں جو اخلاقی حد بندیاں معاشرے کو بچا سکتی تھیں وہ قائم نہ رہ سکیں۔ مذہب فرد کا ذاتی مسئلہ بن گیا اور معاشرتی زندگی میں اس کا کوئی کردار نہ رہا۔ یہی چیز مغربی جمہوریت کا بنیادی پیمانہ بنی۔ علامہ اقبال اس رویے کے شدید نقاد اور بہت بڑے مخالف ہیں۔ ان کی نظر میں اسلام ایک ضابطہ حیات بھی ہے اور سماجی زندگی میں اس کی عالمگیر قدروں کو نافذ کیے بغیر دنیا کی فلاح ممکن نہیں۔ اسی لیے وہ نئی مملکت میں اسلامی ریاست کا تصور پیش کرتے ہیں۔ یہ اسلامی ریاست تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں ہے نہ ہوگی جس میں علماء کو بطور جماعت وہ قوت نافذہ حاصل ہو جو معاشرے کو پاپائی ریاست میں تبدیل کر دے۔ علامہ اقبال اس پاپائیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ان کی رائے میں اسلام میں علماء کو من حیث الجماعت کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ ان کی

رائے میں علماء سے علمی کام لینا چاہیے اور ریاست کے چلانے میں ان کے علمی تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن من حیث الجماعت انہیں کوئی برتری حاصل نہیں۔

علامہ اقبال اپنے دور کے علماء سے من حیث الجماعت بہت مایوس تھے۔ اسی لیے ان کے لہجے میں ایک خاص طرح کی تلخی آ گئی ہے اور انہیں کچھ زیادہ ہی اندیشے لاحق ہوئے ہیں کہ علماء اگر من حیث الجماعت سیاست میں حصہ لیں گے تو اس سے پاپائی ریاست کے بن جانے کا امکان ہے۔ پاکستان بننے کے بعد حالات بڑی حد تک بدل چکے ہیں۔ علماء کے ایک طبقے نے فروعی باتوں کی جگہ اساسی امور کو اہمیت دینی شروع کی ہے نیز اس طبقے میں علامہ اقبال کی تعلیمات کا شعور بھی بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے علماء جدید مسائل اور جدید علوم سے آگاہی حاصل کرنے لگے ہیں۔ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ مختلف فرقوں کے علماء کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکتے۔ ان کا یہ احساس ان کے معاصر علماء کے بارے میں تو صحیح ہو گا لیکن بعد میں یہ صورت حال نہیں رہی۔ علماء نے اسمبلی سے قرارداد مقاصد کے پاس کرانے میں جس یک جہتی کا مظاہرہ کیا وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے اور بدلے ہوئے حالات کا غماز ہے۔ دوسری بار یہ اتحاد مجلس عمل کی صورت میں موجودہ الیکشن میں ظاہر ہوا۔ یہ محض افغانستان کے حالات اور امریکہ کے خلاف ردعمل کا نتیجہ نہیں۔ یہ عنصر بھی یقیناً شامل ہو گا لیکن علماء کے اتحاد فکر و عمل میں فکر اقبال کی شرکت اور علماء کی جدید علوم سے سیاسی تربیت کے ذریعے آگاہی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے علماء کے طرز عمل سے علامہ کا تند و تیز رویہ ان کے زمانے کے سیاسی حالات کا نتیجہ تھا۔ اب شاید وقت آ گیا ہے کہ علماء کی اسمبلیوں میں شرکت سے وہ توازن عود کر آئے جسے اقبال خوش آمدید کہتے تھے۔

مسلمان معاشرے میں یہ خرابی بھی پیدا ہوئی کہ آزادی فکر کے راستے مسدود ہو کر رہ گئے۔ قرون وسطیٰ میں جو فقہ اسلامی مدون ہوا وہ اس زمانے اور ان حالات کے لیے تھا۔ منگولوں کے حملے کے بعد مسلمانوں نے اجتہاد کو چھوڑ کر تقلید کو اختیار کر لیا۔ اس طرح اجتہاد کی جگہ جمود نے لے لی۔ علامہ اقبال فقہ اسلامی کی تدوین نو کے قائل تھے جس میں وہ علماء سے مدد لینے کے حامی ہیں۔ لیکن عالموں سے، علماء سوء سے نہیں۔ وہ اپنے دور کے اکثر علماء سے بدظن تھے اور صرف چند ایک (مثلاً مولانا انور شاہ اور سید سلیمان ندوی وغیرہ) کو اس کا اہل جانتے تھے اور ان سے اس نئی ریاست کی تشکیل نو میں بھی کام لینا چاہتے تھے اور فقہ اسلامی کی تدوین نو میں بھی وہ ان کی رائے کو اہم جانتے تھے۔ حکومت کا جو ڈھانچہ ان کے ذہن میں تھا اس میں اسمبلی میں علماء کی شرکت کا ذکر انہوں نے خطبات میں کیا ہے۔ اسی طرح اپنے دوسرے بیانات میں انہوں نے عارضی طور پر علماء کی ایک تنظیم بنانے کا تذکرہ بھی کیا ہے، جس کی حیثیت عارضی ہو اور وہ بعض امور کے سلسلے میں حکومت کو مشورے دے۔ اسے عارضی انہوں نے اس لیے قرار دیا کہ کہیں نئی مملکت کا تھیوکریٹک سٹیٹ بن جانے کا امکان پیدا نہ ہو۔ وہ تو ملک کو جمہوری اقدار کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔

۴

علامہ اقبال جمہوری قدروں کے حامی تھے۔ ان کی رائے میں جمہوری اداروں کی تشکیل بھی ضروری ہے لیکن مغرب کی جمہوریت کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی رائے میں اسلام جمہوری قدروں کا امین ہے۔ یورپ میں جس طرح جمہوری اداروں کی تشکیل ہوئی علامہ اقبال اسے پسند نہیں کرتے۔ فرانس اور جرمنی میں جمہوریت کی نشوونما جس طریقے پر ہوئی اس سے جنگ و جدل کے راستے کھلے۔ علامہ اقبال ایسی جمہوریت کے سخت مخالف تھے۔ انگلستان کی جمہوریت کو انہوں نے ''چھوٹی برائی'' کے طور پر قبول کیا اور اسے عارضی طور پر اختیار کرنے کے بھی حق میں تھے لیکن مجموعی طور پر وہ مغربی جمہوریت کے مخالف تھے کیونکہ مغرب میں جس طرح جمہوریت کی پرورش ہوئی اس کے پیچھے اخلاقی اقدار نہ ہونے کی وجہ سے جمہوریت عملی طور پر فاشزم میں بدل گئی۔

جمہوریت کو اگر اخلاقی قدروں کا پابند نہ کیا جائے تو وہ فسطائیت میں بدل جاتی ہے۔ لوتھر کا یہی اثر اقبال کو ناپسند ہے۔ وہ جمہوریت کو اخلاقی قدروں کا پابند رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے جمہوری اداروں کی صحیح خطوط پر نشوونما کے قائل ہیں۔ اس نشوونما کے لیے عوام کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہے اور مذہب کا عمل دخل بھی۔ اسی لیے اقبال نے اپنے تصور کو خطبات میں روحانی جمہوریت کے نام سے بیان کیا ہے۔ ان کی رائے میں مسلمانوں میں جمہوری قدریں معاشرتی سطح پر پوری طرح پھل پھول نہیں سکیں۔ مسلمانوں کو اب آنکھیں کھولنی چاہئیں۔ ان کی رائے میں دنیا کو تین چیزوں کی ضرورت ہے:

(الف) کائنات کی روحانی تعبیر۔

(ب) فرد کی روحانی آزادی۔

(ج) انسانی سوسائٹی کو روحانی بنیادوں پر ایک آفاقی نظام میں بدلنا۔

ان تین چیزوں کو علامہ اقبال نے ضروری قرار دیا ہے۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کے نام انہوں نے جو خط لکھا اس میں انہوں نے ایک نئی اصطلاح ''سوشل ڈیموکریسی'' استعمال کی ہے۔ ان تین نکات کا خلاصہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ مسلم لیگ کو اعلیٰ طبقے کی بجائے مسلمان عوام کا نمائندہ بنایا جائے اور اسے جاگیرداروں کے چنگل سے نکال لیا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کے لیے روٹی کا مسئلہ روز بروز اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ جس کے سبب دو ہیں۔ ہندو ساہوکار اور غیر ملکی حکومت۔ مسلم لیگ اگر مسلمانوں کو قرآن کی روشنی میں اقتصادی نظام دے گی تو ان کے افلاس کا حل ہوگا ورنہ مسلمان عوام مسلم لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔

۳۔ اسلام میں سوشل ڈیموکریسی اہمیت رکھتی ہے۔ اسے کسی موزوں شکل میں رائج کیا جائے اور شریعت اسلامیہ میں اسے مناسب شکل دے دی جائے تو اس سے مسلمانوں کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ (اقبال نامہ جلد دوم: ص ۱۴ تا ۱۸)

یہ تین مشورے دینے کے بعد علامہ اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ سب کچھ ایک آزاد ریاست کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے قائداعظم کو ایک الگ ملک کے مطالبے کا مشورہ بھی دیا گیا جس میں نفاذ اسلام کے ذریعے مسلمانوں کے اقتصادی مسائل بھی حل کیے جائیں اور ان کی سماجی زندگی کو بھی اسلامی قدروں کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ علامہ کے نزدیک نئے ملک کا مطالبہ محض اقتصادی اغراض کے لیے نہیں تھا بلکہ اسلام کی حفاظت اور اسلامی کلچر کا تحفظ اس کا بنیادی مقصود تھے اور اسی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۵

علامہ کے لیے ۱۹۳۰ء تک ترکی ایک مثالی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ خلافت کے خاتمے کے بعد سنی فقہ کی رو سے امام یا خلیفے کا تقرر لازم تھا۔ تو کیا پھر اجتہاد کا اختیار اسمبلی کو دیا جائے یا کسی فرد واحد کو؟ ترکی کی پیروی میں انہوں نے منتخب اسمبلی کو یہ اختیار دینے کی تائید کی (خطبات ص ۱۲۴) اور اس عمل کو عالم اسلام میں ایک آفاقی مسلم معاشرے کی تاسیس کی طرف اہم قدم قرار دیا (ایضاً ص ۱۲۵ تا ۱۲۶)۔ لیکن آگے چل کر اجماع کے ذیل میں خود ہی اس اقدام پر اعتراض بھی کر ڈالے (ایضاً ص ۱۳۸) اس مشکل مسئلے کے حل کے لیے انہوں نے ایران کے ۱۹۰۶ء کے آئین میں شامل شق کو عارضی طور پر قبول کرنے کا مشورہ بھی دیا، جس کے مطابق علماء کی ایک مجلس اسمبلی کے اراکین کو مشورے دے گی (ایضاً ص ۱۳۹) لیکن اس مجلس کے قیام کو خطرات سے خالی بھی قرار نہیں دیا (ایضاً)۔ یہ اقدامات علامہ کو ''روحانی جمہوریت'' کی طرف پیش قدمی کے امکان کی طرف لے جاتے ہیں۔ پاکستان کی اسمبلی کے بیشتر اراکین مغربی علوم سے بہرہ مند ہیں لیکن اسلام کے مطالعے سے پوری طرح آگاہ نہیں۔ انہیں خلافت کے اختیارات دے کر کیا ہم نظام اسلام کے نفاذ کی توقع کر سکتے ہیں؟ اسمبلی کے اس اجتہادی اختیار پر نظریاتی کونسل کے فیصلوں کا

کیا اثر ہو سکتا ہے جن کی حیثیت محض مشاورتی ہے اور جن کی رپورٹوں تک کو اسمبلی کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا؟ یہ اور ایسے کئی سوالات ہیں جو آج کے قاری کو پریشان کرتے ہیں۔ ترکی سے علامہ نے جو توقعات وابستہ کی تھیں کیا وہ پوری ہوئیں؟ ترکی میں چرچ اور حکومت کو الگ الگ کر کے مغرب کی پیروی کی گئی اور علامہ آخر میں اتنے مایوس ہوئے کہ انہیں یہ کہنا پڑا:

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

آئین اگر افراد کا وضع کردہ قانون ہے اور اس کی حیثیت اگر رعایا اور حاکم کے درمیان صرف ایک ''معاہدے'' کی ہے۔ (اقبال ریویو جلد ۴۰ شمارہ ۱۰ اپریل ۱۹۹۸ء، مقالہ ڈاکٹر جاوید اقبال) تو پھر یہ تو سوچنا پڑے گا کہ ریاستی نظام کے اندر اصلاح احوال کے کون کون سے امکانات پوشیدہ ہیں؟ اگر حاکم ظلم و ستم سے کام لیتا ہے تو رعایا کے لیے اسے ہٹانے کی آئین میں کیا گنجائش موجود ہے؟ کیا ہم بار بار مارشل لاء سے جمہوریت اور جمہوریت سے مارشل لاء کا تجربہ کرتے چلے جائیں گے یا آئین کے اندر کسی تبدیلی کی کوئی ممکنہ صورت ہو سکتی ہے؟ آخر ہم کب تک اضطرار یا نظریہ ضرورت سے کام چلاتے رہیں گے؟ جب علم و عمل کے درمیان فاصلے بڑھ جائیں تو کیا آئین کی ہر شق پر عمل ممکن ہے؟ اراکین اسمبلی کے انتخاب کے لیے جو شرائط آئین میں موجود ہیں ان پر کبھی سنجیدگی سے عمل ہوا ہے؟ ایسے بہت سے سوال آج کے قاری کو پریشان کرتے ہیں لیکن اس کا علاج معاشرے کی سرگرمیوں کو نئے سرے سے منظم کرنے کی ضرورت کے سوا اور کیا ہوگا۔

علامہ اقبال نے نئے ملک کے لیے وفاقی طرز کے آئین کی سفارش کی ہے۔ جس میں ایک ایوان کی بجائے دو ایوان ہوں۔ لیکن ساتھ ہی انتباہ بھی کیا ہے کہ کوئی ایسا آئین جس میں جمہوریت اور شخصی حاکمیت کو یک جا کیا گیا ہو اس سے بھی خیر کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔ (Speaches and statements of Iqbal p.17)

بہر حال آئین کو جمہوری قدروں کا امانت دار تو ہونا ہی چاہیے لیکن آئین قومی امنگوں کا اشاریہ بھی ہوتا ہے۔ جمہوریت صرف آئین سے نافذ نہیں ہوتی اس کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری اداروں کو پنپنے کا موقع بھی دیا جائے۔ ہمارے ہاں یہ عمل تواتر سے نہیں ہوا۔ اس کے لیے افراد قوم کی جس ذہنی تربیت کی ضرورت تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس کے لیے تعلیم کا جو کم سے کم معیار ہونا چاہیے تھا وہ Unesco کے قائم کردہ معیار سے تو بہر حال مختلف ہوگا۔

علامہ اقبال نے معاشرتی برائیوں میں جس کی سب سے زیادہ مذمت کی وہ دوہرا ذات پات کا نظام تھا۔ مذہبی ذات پات یعنی فرقہ بندی کے لیے علامہ نے سخت الفاظ استعمال کیے۔

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

اسی طرح انہوں نے برادری سسٹم کو بھی Social Caste System (ذات پات کا سماجی نظام) کے نام سے یاد کیا ہے (ایضاً ص ۱۱۷)۔ کیا اس بیماری کا ہم علاج کر پائے ہیں؟ کیا اس فضا میں آفاقی قدروں کی طرف پیش رفت ممکن ہے جسے علامہ نے ''روحانی جمہوریت'' کا نام دیا ہے؟ آج کی نسل کے لیے یہ سوال ایک لمحہ فکریہ ہے۔

ارمغان کشمیر

ڈاکٹر ظہور الدین احمد

اس کتاب کے مصنف رمولف ڈاکٹر آفتاب اصغر ہیں۔ کتاب پیروان جماعت اسلامی اور خانہ فرہنگ ایران کے تعاون واشتراک سے انتشارات فاران نے شائع کی ہے جو کار پردازان جماعت اسلامی کا نشریاتی ادارہ ہے۔ جن اصحاب نے اس کتاب کی نشر واشاعت میں مدد ومعاونت کی وہ اسلامیات کے استاد ہیں مثلاً پروفیسر محمد ایوب انصاری، پروفیسر ارشاد صدیقی، شریف اصلاحی و دیگر۔ انہوں نے مولف پر بڑا احسان کیا کہ فارسی کے موجودہ انحطاطی دور میں فارسی کی کتاب شائع کی۔ (ص ۲۸)

کتاب ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کا موضوع ہے ''ارمغانِ کشمیر'' ترجمہ منظوم فارسی از اشعار اردوی علامہ اقبال راجع بہ کشمیر۔ ترجمے کا یہ حصہ کتاب کے ۱۰۵ سے ۱۴۱ صفحات پر محیط ہے۔ بعض صفحات پر ایک ایک دو دو شعر درج ہیں۔ ۱۴۵ سے ۱۶۶ تک علامہ اقبال کا فارسی کلام ہے جو انہوں نے کشمیر کے متعلق لکھا ہے اور یہ موضوع سے الگ اضافہ ہے۔

کتاب جناب اکبر علی ہاشمی رفسنجانی، صدر جمہوریہ اسلامی ایران کی خدمت میں ارمغان کے طور پر پیش کی گئی ہے (ص ۱۷) اس کے علاوہ مولف نے اسے اپنے ماں باپ کی ارواح پاک کی خدمت میں بھی پیش کیا ہے۔ (ص ۲۷)

مولف نے فارسی حصے میں بتایا ہے کہ یہ کشمیر کی طرف سے ایران کے لیے ارمغان ہے مگر انگریزی نام میں بتایا ہے کہ یہ کشمیر کے لیے تحفہ ہے۔ Gift for Kashmir

اصل کتاب صفحہ ۳۹ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے ۳۸ صفحات میں تمہیدات ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ پیامی از دوست (نظم)

۲۔ ارمغان بہ حضور رئیس جمہوری اسلامی ایران

۳۔ پیش گفتار از ایران فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران

۴۔ سپاس خصوصی

۵۔ تقدیم

۶۔ سخنہای گفتنی

اردو کلام اقبال کا فارسی ترجمہ پیش کرنے کے لیے کشمیر کے متعلق مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تفاصیل پیش کی ہیں:

۱۔ پیشگوئی اقبال دربارہ سرنوشت کشمیر

۲۔ کشمیر کا تاریخی وسیاسی پس منظر

۳۔ کشمیر کا ادبی وثقافتی پس منظر

۴۔ اقبال کے روابط کشمیر کے ساتھ

مولف نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو تحقیقی مقالے کی صورت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ مطالب کے ضمن میں مذکورہ اشخاص کے متعلق تعلیقات لکھے ہیں تا کہ ایرانی اس سے مستفید ہوسکیں۔ (ص ۱۶۹۔۱۹۲)

اسی طرح بعض امور کی توضیح کے لیے ماخذ و منابع کتب کے حوالوں کے لیے ''توضیحات واضافات'' کے زیر عنوان نوٹ لکھے ہیں:

اس کتاب پر تبصرہ کے لیے چار موضوعات یعنی ترجمہ، تحقیق، زبان اور شاعری پر گفتگو ہوسکتی ہے۔

ترجمہ:

پروفیسر مرزا محمد منور ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی نے اپنے انگریزی مقدمے میں ترجمے کی بہت تعریف کی ہے۔ یہاں تک کہا ہے کہ زبان و بیان کے لحاظ سے اصل و ترجمہ میں تمیز نہیں ہوسکتی ان کے الفاظ یہ ہیں:

The excellent translation of Urdu verses into Persian with such skill that a reader does not suspect which verse is in original and which one has been translated (P.226)

مولف کتاب کی تعریف میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ فارسی اور اردو کے باکمال شاعر (accomplished poet) ہیں۔

He has translated a number of books on history with consummate skill.

پروفیسر صاحب نے شاید دوستی و مروت میں ایسا لکھ دیا ہے۔ بعض اشعار کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ اچھا اور مناسب ہوگیا ہے، علامہ اقبال کے بعض اردو اشعار پہلے ہی فارسی الفاظ و تراکیب لیے ہوئے ہیں کہ ان کے ترجمے میں بھی انہیں ہی رکھا جا سکتا ہے، مندرجہ ذیل اشعار کے ترجمہ میں مترجم نے ایسا ہی کیا ہے:۔

اصل متن: ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

ترجمہ: ممکن نہ کہ محکومی بود ہم سر آزاد
آں بندہ افلاک و این خواجہ افلاک

متن: شرع ملوکانہ میں جدت احکام دیکھ
صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام

ترجمہ: شرع ملوکانہ را جدت احکام بین
صور بہ غوغا حلال، لذت محشر حرام

بعض جگہ اقبال کی تراکیب کو ویسے ہی نقل کر دیا ہے۔ ایک جگہ اقبال کے فارسی کلام کو اپنا ترجمہ لکھ کر نقل کر دیا ہے۔

(صفحہ ۱۲۷)

ذیل میں چند ترجموں کی نشاندہی کی جاتی ہے جن میں اصل الفاظ کا ترجمہ شامل نہیں ہوا یا جن الفاظ میں ترجمہ کیا گیا ہے ان سے اصل مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ (ص ۱۰۶)

اصل شعر: غبار دل میں جو تھا کچھ فلک کی جانب سے
دبے اسی میں غم و رنج صورتِ قاروں

ترجمہ: کدورتی کہ بہ دل بود از سوی گردون
فرو برفت تہ خاک صورت قارون

اس ترجمے میں ''غم و رنج'' کا ترجمہ غائب ہے۔

متن: مثال شانہ اگر میری سو زبانیں ہوں
نہ طے ہو زلف رہ شکر ایزد بیچوں

ترجمہ: بسان شانہ اگر صد زبان ھم دارم
نہ طی شود گہی زلف تشکر بیچون

اس میں ''رہ'' کا ترجمہ غائب ہے۔ زلف تشکر طی شدن، فارسی محاورہ نہیں۔ آج کل کی مروجہ زبان میں ایسا ترجمہ ہونا چاہیے۔ اگر ..... می داشتم ..... طی نمی شد۔

متن: بعید رنج سے اور خرمی سے ہوں مقروں

ترجمہ: بہ دور از غم و با خرمی شدم مقرون

بعید کی بجائے ''بہ دور'' مناسب نہیں۔

متن: خدا نے ہوش دیا متفق ہوئے سارے
سمجھ گئے ہیں تری چال گنبد گردوں

ترجمہ: خدا بداد بہ آنہا خرد یکی گشتند
رسیدہ اند بہ رفتار و گردش گردون

رفتار سے چال کے معنی ظاہر نہیں ہوئے۔ ہوش کا مطلب خرد سے واضح نہیں ہوتا۔ اسی طرح یکی سے متفق کا مطلب نہیں کھلتا۔ رسیدہ اند سے سمجھ گئے ہیں کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

متن: یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں

ترجمہ: کند بہ راہ شود روی طالع واژون

اس میں یقین کے بجائے ''کند'' اور ''روی'' کا لفظ زائد ہے۔ ''براہ شود'' سے راہ پر آنے کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

ص ۱۱۴۔ متن: کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے
اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے
ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

ترجمہ: کہکشاں در آمدہ، اختر کنون
منسلک گشتہ ببین گوہر کنون

باہ بہ چہ محفل احباب ہست؟
در بہ در گشتہ شدہ ہمبر کنوں

پہلے مصرعے میں اصل کا مفہوم ادا نہیں ہوا۔ ''اختر کہکشاں میں آ کر مل گئے'' کا ترجمہ کرتے ہوئے ''در کہکشاں'' کی بجائے ''کہکشاں در'' لکھا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''ہین'' کا لفظ زائد ہے، تیسرے مصرعے کے آخر میں سوالیہ نشان لگایا ہے، حالانکہ تعجب اور اظہار مسرت ہے۔

چوتھے مصرعے میں اصل مطلب نکھر کر سامنے نہیں آیا۔

ص ۱۱۵۔ متن: در طلب کہ ہے اخوت کی صدف میں پنہاں
ترجمہ: در مقصود نہانست بہ درج حکمت

مصنف کا اصل مطلب ادا نہیں ہوا۔ اخوت کی بجائے حکمت بیجا ہے۔

ص ۱۱۶۔ متن: بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
ترجمہ: گشتہ مقراض بہ ما داغ پروبالی دار

مقراض کا داغ پروبالی دینا خلاف محاورہ ہے۔ صاف سیدھا ترجمہ نہیں ہوا۔

متن: پنجہ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
ترجمہ: پنجہ ظلم و ستم ہین کہ چہ بد حالی داد

جہالت کی بجائے ستم لکھ دیا ہے۔ مصنف کا مطلب گم کر دیا ہے۔

ص ۱۲۵۔ متن: آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگِ تاک
ترجمہ: آزاد بہ رگ سخت بود مثل رگِ سنگ
محکوم بہ رگ نرم بود مثل رگِ تاک

ترجمہ غلط ہو گیا ہے۔ اصل میں رگِ سخت کو رگِ سنگ سے اور رگِ نرم کو رگِ تاک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ترجمے نے آزاد کو رگ سنگ اور محکوم کو رگ تاک کے مشابہ بنا دیا ہے۔

متن: محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک
ترجمہ: محکوم؟ بہ دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد؟ بہ دل زندہ و پرسوز و طربناک

اس ترجمہ میں اصل مطلب سے انحراف کیا گیا ہے، مصنف محکوم اور آزاد کے دلوں کی حالت بیان کر رہا ہے۔ مترجم نے محکوم اور آزاد کے متعلق خود ہی استفسار کیا ہے کہ وہ کون ہے، پھر جواب دیا ہے کہ وہ بالترتیب مردہ، اور زندہ دل والے ہیں۔

متن: آزاد کی دولت دل روشن، نفس گرم
ترجمہ: آزاد نفس گرم بود با دل روشن

یہ ترجمہ بھی اصل سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آزاد کو نفس گرم بنا دیا ہے۔

متن: ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ترجمہ: ہر چند کہ در فلسفہ باشد بسی چالاک

مترجم کی مجبوری ہے کہ وہ دلائل منطقی کی بجائے ''فلسفہ'' کام میں لایا۔

ص ۱۲۸۔ متن: غلام قوموں کے علم و عرفان کی ہے یہی رمز آشکارا

ترجمہ: زعلم و آگاہی غلامان بود یکی رمز آشکارا

یہی کا ترجمہ یکی درست نہیں۔ ''ہمیں'' آسانی سے آ سکتا تھا۔

متن: زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بے کرانہ

ترجمہ: زمین اگر تنگ شد برایشان فضای گردون کہ بی کرانہ

''تو کیا ہے'' کا ترجمہ نہیں ہوا۔ کہ ہست کے معنوں میں نہیں آ سکتا۔

متن: کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پر آشیانہ

ترجمہ: چو گفت: این نغمہ خوان خوش را کجا گراں بود آشیانہ

پرسوز کی بجائے ''خوش'' اصل کی روح کو نہیں لاتا۔ ''مجھ پر'' کا ترجمہ غائب ہے۔ کجا لانے سے شاخ گل کا بیان ہی بدل گیا ہے۔

ص ۱۲۹۔ متن: دگرگوں جہاں ان کے زور عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

ترجمہ: دگرگوں جہاں شد بہ نیروی آنہا
زدہ معرکہ، زندہ اقوام، آرہ

دوسرے مصرعے میں ''معرکے'' کی بجائے ایک معرکہ لایا گیا ہے۔ قافیے کی مجبوری کے لیے ''آرہ'' کا خواہ مخواہ اضافہ کرنا پڑا۔ اسی قطعہ کے آخر میں ''ولر کے کنارے'' کو اردو ترکیب کے مطابق ''ولر کنارہ'' لانا پڑا جو فارسی ترکیب نہیں۔

ص ۱۳۱۔ متن: گر صاحب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندہ مومن کے لیے موت ہے یا خواب

ترجمہ: گر صاحب ہنگامہ نباشد خم محراب
دین بہر تو مرگی است و با فرصت صد خواب

ترجمے میں ''منبر'' غائب ہے۔ ''فرصت صد'' زاید ہے۔

ص ۱۳۳۔ متن: چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آب ولر کے تمام یک دانہ

ترجمہ: زچشمہای زمانہ نہان بود تا کی
گہر ز آب ولر ہست جملہ یک دانہ

جملہ کے ساتھ کلمہ جمع آنا چاہیے جیسے جملہ کسان، یا اسم جمع آنا چاہیے جیسے۔ لشکر۔

ص ۱۳۳۔ متن: جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

ترجمہ: باشد نہان چو نار چناران تہ زمین

ضمیر کا لفظ غائب ہو جانے سے انسان پر اس کے معانی منطبق ہو جانے کا اشارہ بعید ہو گیا ہے۔

ص ۱۳۴۔ متن: معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
خدا معاف کند از خطا و تقصیرش

ترجمہ:

فطرت کا ترجمہ خدا کیا ہے۔ جمع تقصیریں، کی بجائے واحد، تقصیر کیا ہے۔ آج کل کے محاورے میں معاف کردن، بخشیدن کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً کہتے ہیں ''از پرداخت مالیات معاف است''۔

ص ۱۳۵۔ متن: گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد

ترجمہ: گلہ چہ دارم ازین کور ذوقی دنیا
کجاست محنت من مثل محنتِ فرہاد

''گلہ دارم'' کو ''گلہ چہ دارم'' سے ترجمہ کرنا اصل مطلب کو اجاگر نہیں کرتا۔ دوسرے مصرعے میں اردو کی محنت اور فارسی کی محنت میں فرق ہے۔ آج کل محنت سے وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا جو اقبال چاہتے ہیں۔

ص ۱۳۶۔ متن: نہ کام آیا ملا کو علم کتابی
بہ در رفت ملا بہ علم کتابی

ترجمہ:

ترجمہ میں اصل مفہوم ادا نہیں ہوا۔ بدر رفت یا بہ در رفت سے ''نہ کام آیا'' کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔

ص ۱۳۷۔ متن: یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
ہمیں باشد بہ نزدم امتان را عالم پیری

ترجمہ:

ترجمہ میں مرنے والی، کا ترجمہ غائب ہے۔

ص ۱۳۹۔ متن: مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
مشرق رخ فردای قیامت بنمود آج

ترجمہ:

اردو آج، کے لیے کوئی لفظ نہیں آ سکا۔

متن: فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
از حشر دل خود ز قیامت طلبد باج

ترجمہ:

ترجمے میں مصنف کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔

ص ۱۹۶۔ متن: تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

ترجمہ: تہران بود ار ژنو عالم مشرق
شاید کہ جہان را رخ تقدیر بگردد
رخ بگردیدن فارسی کا محاورہ نہیں۔ بدل جانے یا تبدیل وتغیر ہونے کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔

تحقیق:

مولف نے بعض جگہ قیاس سے کام لیا ہے اور کوئی شہادت پیش نہیں کی۔ بعض جگہ کتابوں کے نام حوالے کے طور پر دیے ہیں لیکن ان کے صفحات کی نشاندہی نہیں کی۔ بعض جگہ دوسری کتابوں سے مطالب نقل کیے ہیں لیکن متن میں یا حاشیے میں ان کا نام نہیں لیا۔ صرف کتابیات کی فہرست میں ان کے نام درج کیے ہیں۔ بعض جگہ حافظے کی مدد سے کتابوں کے نام لکھے ہیں یا واقعات صحیح طور پر بیان نہیں کیے۔ ان تمام مسامحات کی مثالیں ذیل میں ملاحظہ کیجیے

ص ۸۷۔ علامہ اقبال کشمیر کی ایک ہندو گوت، سپرو، سے اپنے آپ کو منسوب سمجھتے تھے۔ مولف کتاب نے اپنی قوت واہمہ کے بل پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال ایرانی النسل ہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ ساسانی خاندان کے بزرگ بادشاہ شاہپور کے اخلاف کشمیر میں آباد ہوئے۔ کلمہ سپرو، شاہپور کی متغیر شدہ صورت ہے اور ایران کبیر اور ایران صغیر سے محبت ووابستگی ان کے ایرانی نژاد ہونے کی پوشیدہ احساس کی وجہ سے ہے۔ یہ قیاسی تحقیق ہے۔

ص ۴۹۔ لکھا ہے کہ ۳۲۶ ق۔م میں حملہ سکندر کو ''می توان مبدای'' تاریخ پاکستان وکشمیر محسوب کرد، مولف کا یہ بیان درست نہیں۔ اس سے پہلے دارپوش بزرگ (۵۲۰۔۴۸۶ ق۔م) ہندوستان کے بعض حصوں پر متصرف رہا ہے۔ دارا نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں ہندوش، گاندھارا، ثاتاگوش کا ذکر کیا ہے جو موجودہ پاکستان کے علاقے ہیں۔ نقش رستم کے کتبے میں یہ نام کندہ ہیں۔

ص ۵۲۔ کشمیر کا ہندو راجا جو سب سے پہلے مسلمان ہوا اس کا نام رنچن تھا۔ مولف نے رنجوت لکھا ہے جو صحیح نہیں۔
مولف کا بیان ہے'' دورہ اسلامی در کشمیر کما بیش ہم زمان با دورہ اسلامی در پاکستان فعلی شد'' کشمیر میں رنچن کے مسلمان ہونے سے یعنی ۷۲۵ھ میں اسلامی دور حکومت شروع ہوا۔ حالانکہ سندھ میں ۹۲ھ میں محمد بن قاسم کی اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔

ص ۵۴۔ مولف نے علامہ اقبال کے ایک مصراع'' آہ پنجاب آن زمین ارجمند'' پر حاشیہ لکھا ہے کہ پنجاب سے مراد کشمیر ہے کیونکہ پنج آب یعنی پنجاب کے پانچوں دریا کشمیر سے نکلتے ہیں۔ حالانکہ یہ بیان درست نہیں۔ راوی، ستلج، بیاس تو کشمیر سے نہیں نکلتے۔

ص ۵۱۔ سلطان محمود غزنوی نے دو بار کشمیر پر حملہ کیا اور بعضی از نواحی آن را با مستعرۂ پنجاب ضمیمہ نمود'' یہ بیان صحیح نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ محمود نے ۴۰۶ھ اور بعد میں ۴۱۲ھ میں دوبارہ کشمیر پر حملہ کیا اور وہ کوٹ پر قبضہ نہ کر سکا۔ دونوں مرتبہ سردی اور برف باری کی وجہ سے جان ومال کے نقصان کے بعد کشمیر پر حملے کا خیال چھوڑ دیا۔

ص ۵۰۔ پہلی مرتبہ دورہ خلفائے راشدین (۲۳۔۳۵ھ ق) میں سندھ پر حملہ ہوا۔ اس بیان میں خلفائے راشدین کا دور حکومت ۲۳ سے ۳۵ھ لکھا ہے۔ حالانکہ یہ دور حکومت ۱۱ھ سے ۴۰ھ تک رہا۔

ص ۵۱۔ عبور ومرور مسلمانان صدر اسلام از کشمیر'' کا عنوان لکھ کر سید سلیمان ندوی کی کتاب ''عرب وجغرافیا'' کے حوالے سے

بتایا ہے کہ مسلمانوں کے عرب چین سے دمشق اور دمشق سے چین تک شاہراہ ابریشم کے ذریعے تجارتی قافلے جاتے تھے۔ اس بیان میں کشمیر کا کوئی ذکر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سید سلیمان کی کتاب کا نام عرب وجغرافیا نہیں۔ عرب پر ان کی دو کتابیں ہیں۔ عرب و ہند کے تعلقات اور ارض قرآن، تیسری بات یہ ہے کہ چین و دمشق کے درمیان آسانی سے ایران و عراق کے راستے سے تجارت ہو سکتی تھی۔ شاہراہ ابریشم کا استعمال کیسے ضروری ہوا۔ شاہراہ ابریشم تو دے گرنے اور برف باری سے اکثر مسدود رہتی تھی۔ غیر ممالک سے تجارت کے لیے اور بہت سے راستے تھے۔ لداخ سے لیہ کے راستے زیادہ تجارت ہوتی تھی۔ ''کشمیر سلاطین کے عہد میں'' کے مصنف نے ان تمام راستوں کی نشاندہی کی ہے جن کے ذریعے تجارت ہوتی تھی۔

ص ۵۸۔ مولف لکھتے ہیں، جب بڑے تیموری بادشاہوں کا شیرازہ بکھر گیا تو مسلمانانِ کشمیر نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کی طرح ہندوؤں سے نجات پانے کے لیے احمد شاہ ابدالی کا دامن تھاما۔ یہ بیان غیر واضح ہے ہندوستان میں تو مرہٹوں کی قوت کو کچلنے کے لیے مسلمان راہنماؤں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی۔ مگر کشمیر میں تو اس وقت مسلمانوں کی اپنی حکومت تھی۔

ص ۶۹۔ کشمیر کے سیاسی پس منظر کے ضمن میں مندرجہ ذیل عنوانات پر خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

دورۂ سلاطین لاہور، لاہور مرکز فرہنگ و ادب، سلاطین دہلی و ادبیات و فرہنگ فارسی، حملہ تیمور بہ ہند، تیموریان ہند، علما، و ماوای دانشوران و نوپسندگان''۔ صفحہ ۶۹ سے ۷۴ تک کے یہ مطالب زاید ہیں اور کشمیر سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

کشمیر کے سیاسی پس منظر کے ضمن میں تیموریان بزرگ میں سے اورنگزیب تک تو کشمیر کے احوال پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن تیموریان متاخر جو ۱۱۱۹ھ سے ۱۱۷۵ھ تک حکمران رہے اور ان کے بعد افغان ۱۱۷۶ سے ۱۲۳۴ھ تک قابض رہے ان کے عہد میں کشمیر کی کیفیت پر کچھ نہیں لکھا گیا۔

ص ۸۵۔ لکھا ہے: سیالکوٹ، لاہور اور ملتان سے کمتر درجے کا مرکز علمی و ادبی نہیں رہا اور بتایا ہے یعقوب صرفی، شیخ احمد سرہندی نے وہاں سے ظہور کیا۔ مولف کا پہلا بیان بھی مزید تحقیق کا محتاج ہے۔ علمی و ادبی اعتبار سے لاہور کی افضلیت اور مرکزیت تو سب مانتے چلے آئے ہیں۔ دوسرا بیان بھی درست نہیں۔ یعقوب صرفی اصلاً کشمیری تھے اور شیخ احمد مولداً او موطناً سرہندی تھے اور وہ آج تک اپنے وطن کی مناسبت سے یاد کیے جاتے ہیں۔

مولف کو معلوم ہے کہ اس کی کتاب سے پہلے مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں کشمیر کے ساتھ علامہ اقبال کے خاندانی اور عرفانی روابط بیان ہوئے ہیں اور ان کی سیاسی اور ادبی خدمات کے متعلق مفصل معلومات فراہم ہو چکی ہیں۔

۱۔ زندہ رود — از ڈاکٹر جاوید اقبال
۲۔ اقبال اور کشمیر — از ڈاکٹر صابر آفاقی
۳۔ اقبال اور کشمیر — از سلیم خان گی

مولف نے ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نئی تحقیق بھی پیش نہیں کی۔ مولف نے جن اشعار و منظومات اردو کا فارسی میں ترجمہ پیش کیا ہے وہ خود جمع نہیں کیے بلکہ مندرجہ بالا مولفین کی کتابوں سے اخذ کیے ہیں اور انہیں اسی ترتیب سے لکھا ہے جیسا کہ ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ البتہ بیاض ملازادہ ضیغم کی اس ترتیب کو سراسر بدل دیا ہے جس ترتیب سے علامہ

اقبال نے لکھا تھا۔ نہ معلوم اس میں کیا حکمت تھی۔

وزن سے خارج اشعار:

مندرجہ ذیل اشعار وزن سے خارج ہیں:

ص ۱۰۵۔ جنود رنج و الم طوری حملہ و رگشتہ

ص ۱۰۷۔ بہ سان شانہ اگر صد زبان ہم دارم
نہ طی شود گی زلف تشکر بیچون
نسیم طوری و زیدہ کہ شد خنک قلمم
خدا کند کہ بہ کرمش رہی فراز کند

ص ۱۱۰۔ امن میبنم بہ دیدہ ام جنت نظیر ہست

ص ۱۱۱۔ پیش این گونہ گلستان گہی گر آید

ص ۱۱۷۔ گویدم گر کسی پندیت خجالت دارم

ص ۱۱۹۔ بعضی ہایند کہ صد نقش نوی می بندند

ص ۱۲۴۔ تقدیر بود نام مکافات عمل را

ص ۱۲۵۔ محکوم بود عاری ز اخلاص و مروت
ہر چند کہ در فلسفہ باشد بسی چالاک

ص ۱۲۸۔ در آنجا لحظہ بہ لحظہ گردد و در اینجا گردونہ این زمانہ
کنار دریائی خضر گفتہ مرا بہ شیوہ محرمانہ

ص ۱۴۰۔ بہ داد ما برس بہر ما تو نگران باش

نگران غلط باندھا ہے۔ گ پر زبر ہوتی ہے۔

ص ۱۱۳۔ باہ بہ! چہ محفل احباب ہست!

باہ بہ غلط ہے۔ محاورہ ''بہ بہ'' ہے۔

زبان و بیان کے نقائص:

کتاب کے مولف چھ سات سال ایران میں رہے۔ پاکستان میں ایرانیوں سے روابط کی وجہ سے فارسی زبان لکھنا اور بولنا ان کے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر جوادی رائزن فرہنگی نے پیش گفتار میں زبان پران کے تسلط کی تعریف کی ہے لیکن ارمغان کشمیر پڑھنے والا شخص دیکھے گا کہ مولف نے فارسی محاورہ استعمال کرنے کی جابجا کوشش کی ہے لیکن زبان کا عمدہ اسلوب نظر نہیں آتا۔ چونکہ وہ شاعر ہیں اس لیے شاعرانہ عبارت آرائی کو پسند کرتے ہیں۔ لمبے لمبے جملے لکھتے ہیں۔ کہیں کہیں الفاظ کے زور سے معانی ٹوٹ جاتے ہیں۔ مطالب کی تکرار عام ہے۔ مترادفات لانے کا بڑا شوق رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں املائی اور دستوری غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی حسب ذیل ہے:

ص ۴۸۔ مبدء کو مبدای لکھا ہے۔
ص ۵۵۔ ''در سن ہشتم و پنج ہجری'' سن غلط ہے سنہ یا سال چاہیے۔
مترادفات کا استعمال:
تشویق و ترغیب (۳۰۲)۔ ابتلا و آزمائش (۵۱)۔ معایر و موازین (۴۳) مبارزان و رزمندگان (۳۶)۔ کشمیریان گران خواب و بیہوش (۳۷)
ص ۴۳۔ از انہا بیگار کشیدند۔ بیگار کشیدن غلط ہے۔ یہاں بیگار گرفتن ہونا چاہیے۔
ص ۴۴۔ استفادہ بردن غلط۔ استفادہ کردن صحیح۔
ص ۴۴۔ ہتک ناموسہای ننگ آور دختران۔
ناموسہای ننگ آور، صحیح نہیں۔ ہتک ننگ آور ہو سکتی ہے۔
ص ۳۷۔ ترویج و تمدید افکار و احساسات اقوال۔ تمدید تو مدت بڑھانے کے لیے آتا ہے مثلاً تمدید مرخصی۔ یہاں اس کا استعمال غلط ہے۔
مولف کی بعض نئی تراکیب غیر واضح ہیں مثلاً:
تراجم متقابل (۳۶)
کشمیریات اردو۔ کشمیریات فارسی (۳۵)
نہضت طلبان (۲۱۳)
ص ۴۹۔ ''سردار خونخوار بودائی راکشت و کشتار واز برہمنان سرپرستی نمود''
دو غیر متجانس جملوں کو عطف کر کے ایک ہی فعل کے ساتھ مربوط کرنا معیوب ہوتا ہے۔
ص ۶۵۔ قبول اسلام سلطان مسلمان کشمیر، اس جملے میں سلطان کے ساتھ مسلمان کا لفظ زاید ہے۔ جب وہ پہلے مسلمان تھا تو پھر اس کے قبول اسلام کا کیا سبب۔
غیر واضح جملے:
ص ۶۵۔ مسجد جامع در نماز جمعہ معمور گشت
ص ۶۶۔ حسنات بسیار گردید
ص ۶۷۔ با فرہنگ دوست ترین۔ اس میں باز اید ہے۔
ص ۷۷۔ ''کار گران روسی را ملازم گذاشت، ملازم رکھنا اردو محاورہ ہے۔
ص ۳۱۔ ''عشق و محبت با کشمیر و اقبال با خون و شیر در کالبد من عجین ساختند و آنرا در عروق و شرائین من بجریان انداختند''۔
اس عبارت میں کلمہ عجین درست استعمال نہیں ہوا۔ اگر کوئی چیز گوندھی گئی تو وہ سخت ٹھوس ہو گئی اس لیے وہ رگوں اور شریانوں میں کس طرح رواں ہو گی۔
ص ۲۰۴۔ ایک بات کو ایک ہی صفحے میں چار مرتبہ دہرایا ہے۔
۱۔ این واقعیت غیر قابل انکار است کہ ایشاں معرف اقبال در جہان فارسی بودند۔

۲۔ عرفانی معرف اقبال در ایران بود۔
۳۔ بزرگترین معرف اقبال در جہان فارسی۔
۴۔ در اقبال شناسائی در سراسر جہان فارسی بی رقیب بود

ص ۲۰۱۔ سات سطروں کا ایک جملہ ہے۔ پہلی سطر میں استاد سعید نفیسی مبتدا ہیں آخری سطر میں خبر ہے۔ یعنی با اطلاع ترین استادان ایرانی بودہ اند۔

خودکلامی اور خودستائی مولف:

مولف کتاب نے جہاں بھی موقع ملا ہے اپنی تعریف اور والا پا یگی کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً کتاب کی دوسری تقدیم میں کہتے ہیں۔

میرے باپ نے اپنے خون سے اور ماں نے اپنے دودھ سے اقبال اور کشمیر سے محبت میرے جسم کے اندر گوندھی پھر میری رگوں اور شریانوں میں اسے رواں کیا۔

ص ۲۰۱۔ سعید نفسی کا ذکر آیا ہے تو لکھا ہے:

''مجھے ان کے حضور شرفیابی کا افتخار نصیب ہوا ہے''۔

ڈاکٹر عرفانی کا ذکر آیا ہے تو ان کی تعریف میں لکھی ہوئی اپنی نظم نقل کر دی ہے۔

ایک جگہ استادان دانش مند و ایران دوست بندہ، کہہ کر اپنے اساتذہ کے نام لکھ دیئے ہیں۔

ص ۴۴۔ مولف نے کشمیر کی تعریف میں اپنی اردو نظم کا ذکر کیا ہے اور خواہ مخواہ اردو کے متعلق محمود شیرانی کی رائے نقل کی ہے۔ چونکہ محمود شیرانی کا نام آ گیا ہے، اس لیے صفحہ ۲۰۰ پر ان کے بارے میں نوٹ لکھا ہے۔ ساتھ ہی اپنی تحقیق کے اظہار کا موقع مل گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں'' پروفیسر شیرانی کے لیے دیکھیے میرا مقالہ جو ۱۹۸۴ء میں مجلہ تحقیق میں چھپا۔ پھر یہی مقالہ ڈاکٹر ایرج افشار کے توسط سے مجلہ آئندہ میں دوبارہ چھپا۔

ص ۲۰۶۔ کشمیر کا ذکر ہے تو اپنے آباء و اجداد کا ذکر بھی شامل کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے اجداد بھی کشمیر سے گجرات میں مہاجرت کر کے آئے تھے۔

ص ۲۰۷۔ پھر بتایا ہے کہ گورداسپور میں ان کے والد کے قتل کی غلط خبر پہنچی تو سارا خاندان گریہ وزاری کا مرکز بن گیا لیکن جب والد خود ناگہانی طور پر آ گئے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مولف کی عمر اس وقت سات سال تھی۔ انہوں نے بھی بے پایاں مسرت کا اظہار کیا۔

ص ۳۶۔ علامہ اقبال خود کشمیر سے متعلق اپنی اردو نظموں کو فارسی میں منتقل کرتے لیکن ضعف پیری کی وجہ سے میرے جیسے عاجز و فقیر فرزند معنوی کو اس کام کے لیے مامور کرتے۔

ص ۳۷۔ علامہ اقبال نے پچاس سال کشمیر کے لیے بے نظیر خدمات انجام دی ہیں۔ میں بھی اقبال شناسی اور اقبال شناسائی کے لیے کچھ خدمت انجام دوں۔

تاریخ فرشتہ میں معاشرتی جھلکیاں

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

برصغیر پاک و ہند میں لکھی گئیں فارسی کتب تاریخ کا تقریباً سارا مواد حاکمانِ وقت کے مختلف احوال اور ان کی فتوحات وغیرہ سے متعلق ہے، تاہم ان کتب میں کہیں کہیں متعلقہ دور کی معاشرتی زندگی کی بھی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں جو آج کے قاری کے لیے یقینی طور پر دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ راقم اس سے بیشتر ایسی چند ایک کتب سے یہ جھلکیاں، مختلف ادبی رسائل کے توسط سے، قارئین کو دکھا چکا ہے۔ اس مرتبہ مغلیہ دور کی مشہور تاریخ ''گلشن ابراہیمی'' عرف ''تاریخ فرشتہ'' ہمارے پیش نظر ہے۔

''گلشن ابراہیمی'' تاریخی نام ہے جس کے عدد ۱۰۱۵ھ (مطابق ۷-۱۶۰۶ء) بنتے ہیں، یعنی اس کتاب کی تکمیل مذکورہ سال میں ہوئی لیکن اس کتاب کی شہرت زیادہ تر تاریخ فرشتہ ہی کے نام سے ہے۔ اسی لیے عنوان بالا میں یہ نام لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ مؤرخ نے خود تصریح کر دی ہے، اس کا نام محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی المعروف فرشتہ تھا:

''.....امابعد بندۂ کمینہ درگاہ محمد قاسم ہندو شاہ المشہور بفرشتہ.....عرضہ میدارد.....[۱]''۔

وہ استرآباد (ایران) سے عنفوان جوانی میں احمد نگر آ کر مرتضیٰ نظام شاہ، والیٔ احمد نگر کے دربار سے وابستہ ہوا، جہاں اسے مسلمان بادشاہوں اور مشائخ کرام کے واقعات و حالات پر مشتمل ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن متعلقہ حوالے کی کتب کی عدم دستیابی کے باعث وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) میں وہ بیجاپور[۲] پہنچا جہاں ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) کے دربار میں اسے رسائی ملی۔ عادل شاہ کو تاریخ سے دلچسپی تھی، چنانچہ اسی کے ایما پر فرشتہ نے برصغیر کے بادشاہوں اور مشائخ کرام کی تاریخ لکھنا شروع کی[۳]۔ اس دوران میں، بقول سٹوری، اس نے بعض دوسری خدمات بھی انجام دیں، مثلاً ماہ صفر ۱۰۱۳ھ (جولائی ۱۶۰۴ء) میں وہ عادل شاہ ثانی کی بیٹی بیگم سلطان کی پالکی کے ساتھ گیا، جس کی شادی اکبر کے بیٹے دانیال سے ہوئی تھی۔ جہانگیر کے ابتدائی عہد میں وہ ابراہیم کی طرف سے لاہور بھیجا گیا[۴]۔ وہ ابراہیم عادل کے ہاں ''محافظت دربار'' پر بھی مامور تھا[۵]۔ وہ غالباً ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۲ء تک زندہ رہا۔ اس کے بعد کے حالات معلوم نہیں۔ فرشتہ نے گلشن ابراہیمی کے علاوہ ''دستور الطبا'' بھی لکھی تھی، جسے ''اختیارات قاسمی'' کا بھی نام دیا گیا ہے[۶]۔

تاریخ فرشتہ، پاکستان و ہند کی تواریخ میں ایک مستند کتاب ہے جس کا سبب اس کے مآخذ ہیں، نیز اپنی اعتدال پسند طبع کی بنا پر فرشتہ نے کہیں بھی تعصب سے کام نہیں لیا۔ اس نے شمالی ہند کے تنازعات اور ذہنی و جذباتی مناقشات سے خود کو دور رکھا۔ اس نے شخصیتوں کا تجزیہ معروضی طور پر کیا ہے اور مدح سرائی سے وہ کچھ اس طور احتراز کرتا ہے جیسے کسی شے کا تجزیہ کر رہا ہو۔ اس کے اسی انداز کے سبب مغرب میں بھی اس کتاب کو پذیرائی ملی، چنانچہ ۱۸۲۹ء میں لیفٹیننٹ کرنل جان برگز نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جس سے اکثر مستشرقین نے استفادہ کیا ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ (چونکہ فرشتہ کا تعلق سلاطین بہمنیہ سے تھا، اس لیے اس مقالے میں صرف ان سے متعلق حصے کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔)

تخت نشینی کے وقت اسباب تجمل اور آلات شوکت کا پورا دھیان رکھا جاتا تھا، چنانچہ جب سلطان محمد شاہ بن علاء الدین حسن کانکوی بہمنی (وفات ۷۷۶ھ/۱۳۷۴-۷۵) تخت نشین ہوا تو قبۂ چتر کو نفیس آبدار جواہر سے آراستہ اور اس قبہ (گنبد) کے اوپر ایک مرصع ہما نصب کیا گیا، نیز بیجانگر کے راجا نے جو ایک نہایت قیمتی یاقوت (جس کی قیمت کی تشخیص سے بھی جوہری عاجز تھے) تحفے کے طور پر بھیجا تھا، وہ اسی ہما کے اوپر رکھ دیا گیا ہے۔

تخت شاہی کو، تعظیم کے طور پر سجدہ کیا جاتا تھا۔ بقول فرشتہ: جمعے کے سوا باقی دنوں میں ایوان کے وسط میں ابریشمی قالین، پرتکلف انداز میں بچھائے جاتے، زربافت مخمل کے شامیانے لگائے جاتے اور دیگر اقمشۂ نفیسہ آگے کھڑی کی جاتیں اور سلطان علاء الدین حسن والا تخت نقرہ رکھ دیا جاتا۔ محمد شاہ بہمنی ایک پہر دن گزرنے کے بعد جب وہاں جاتا تو سب سے پہلے، تعظیم کے طور پر، اپنے مرحوم باپ کے مذکورہ تخت کو سجدہ کرتا اس کے بعد تخت پر بیٹھتا۸۔

منجمین کی اہمیت:

سلاطین بہمنیہ کو علم نجوم پر کچھ زیادہ ہی اعتبار و اعتماد تھا، جس کی بنا پر منجمین کو بڑی اہمیت حاصل رہی اور اس اہمیت کی بنا پر ان کے خوب ''وارے نیارے'' تھے۔ تخت نشینی سے قبل منجم سے مبارک گھڑی معلوم کی جاتی، اس کے بعد تخت نشینی کی رسم ادا ہوتی، چنانچہ سلطان علاء الدین حسن کانکوی، مخاطب بہ ظفر خان کی تخت نشینی کے لیے منجمین نے جمعہ ۱۴ ربیع الثانی ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ء کا دن مبارک قرار دیا اور یوں اس کی رسم تخت نشینی اس روز صبح کے وقت مسجد بادشاہ قطب الدین میں ادا کی گئی اور تیمن و تبرک کے طور پر اس کے سر پر چتر سیاہ رکھی گئی جو خلفائے عباسی کا نشان تھا۔ اس مبارک گھڑی کے سلسلے میں اس وقت کے دو بڑے منجم صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد منجم بدخشی کی ہندو منجمین سے خاصی بحث رہی لیکن چونکہ مؤخر الذکر منجمین کی اکثریت تھی، اس لیے ان کا فیصلہ مان لیا گیا اور مذکورہ رسم ادا کر دی گئی۔ بعد میں ان دو مسلمان نجومیوں نے بعض محفلوں میں بتکرار اس فیصلہ پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہماری مقرر کردہ گھڑی کو پیش نظر رکھا جاتا تو حالات بہتر رہتے، اب معاملہ گڑبڑ رہے گا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو اس کو توہمات نے گھیر لیا، چنانچہ اس نے دونوں کو طلب کر کے ان کی متذکرہ باتوں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ جس ساعت پر آپ تخت نشین ہوئے ہیں اس کی تاثیر سے آپ کے خاندان کے بادشاہوں کی تعداد بیس تک نہ پہنچے گی اور سالوں کی تعداد بھی دو سو (سال) سے نہ بڑھے گی، جبکہ ہماری مقرر کردہ ساعت کے حسن اثر سے اس خاندان میں سات سو سال تک بادشاہت رہتی اور ڈیڑھ سو کے قریب اس خاندان کے افراد بادشاہ بنتے۔ یہ واقعہ لکھ کر فرشتہ، جس نے تاریخ تحفۃ السلاطین کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے، کہتا ہے کہ مؤلف یہ ''حکایت بوالعجب'' بیان کرتا ہے کہ ایک سو ستر (۱۷۰) سال بعد آل بہمنیہ کی حکومت ختم ہو گئی، جس پر علماء و فضلا نے ان دو منجمین کی علم نجوم میں مہارت کا اعتراف کر لیا۹۔

نوبت شاہی، شاہی سکے:

سلطان محمد شاہ بہمنی نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ دن میں پانچ مرتبہ نوبت شاہی بجائی جائے اور دربار عام کے موقع پر تمام لوگ زانو زدہ سرزمین پر رکھیں اور یہ کہ سکے سونے سے تیار کیے جائیں (بہمنیوں کے بعد آنے والے دوسرے حکمرانوں نے پانچ مرتبہ نوبت شاہی اور سونے کے سکے والا معاملہ ختم کر دیا)۔ سلطان محمد شاہ کے دور کے سونے اور چاندی کے سکے، مختلف اوزان میں چار قسم کے ہوتے تھے۔ سب سے وزنی دو تولے کا اور کم سے کم ۴/۱ تولے کا ہوتا۔ اس کے ایک طرف کلمہ طیبہ شہادت اور

چاروں خلفائے کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے اسمائے گرامی ہوتے اور دوسری طرف بادشاہ عصر کا نام اور وقت ارتسام کی تاریخ۔ ہندو صراف کچھ تو تعصب کی بنا پر اور کچھ بیجانگر اور تلنگ کے راجاؤں کے اکسانے کے باعث سکہ زر محمد شاہی کو، جو ہر طرح کے کھوٹ سے پاک ہوتا، پگھلا کر بیجانگر اور تلنگ کے زر کفار کی نسبت سے دکن میں رائج کرنے کی کوشش کرتے۔ جب سلطان محمد کو علم ہوا تو اس نے ہندو صرافوں کو زر اسلام کے توڑنے اور پگھلانے سے منع کیا اور انہیں کچھ نصیحتیں کیں، لیکن جب ان سب باتوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ فلاں تاریخ کو متعلقہ صرافوں کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ ماہ رجب ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء میں انہیں قتل کر دیا گیا اور شاہی حکم کے مطابق لشکر دہلی کے ہمراہ آنے والے کھتریوں نے صرافی کا کام شروع کر دیا، چنانچہ شاہان بہمنیہ کے دور تک زر اسلام رائج رہا۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دکنی الاصل صرافوں نے اپنے آباواجداد کے اعمال سے اظہار نفرت کرتے ہوئے سب سکے سرکار کو واپس کر دیے اور کاروبار میں کفار کے زر مسکوک سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ البتہ سلطان محمود شاہ بہمنی کے دور کے وسط میں، جب اس خاندان کی حکومت میں خلل واقع ہوا تو وہ صراف سرگرم عمل ہو گئے اور چھ سات سال کے عرصے میں انہوں نے زر اسلام کا نام ونشان نہ چھوڑا اور بیجانگر اور تلنگ کے راجاؤں کے سکے جو بہون پرتاب کے نام سے مشہور تھے، تمام اسلامی ریاستوں میں رائج کر دیے۔ چنانچہ، بقول فرشتہ، آج بھی جبکہ ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء کا سال ہے، وہی کفار کے سکے مسلمانوں میں رواج پذیر ہیں۔ بعد میں مرتضیٰ نظام شاہ بحری کے مدار المہام شاہ قلی صلابت خان نے کوشش کی کہ پھر سے اسلامی سکے رائج ہوں اور اس کے لیے اس نے چند مقامات پر ٹکسالیں بھی بنوائیں اور سونے اور چاندی کے سکے ائمہ اثنا عشر اور بادشاہ مرتضیٰ نظام شاہ کے ناموں سے تیار کروائے، لیکن جلد ہی، خود شاہی عہدیداروں کے باہمی نفاق کے باعث بات بن نہ سکی۔ صلابت خان نے بعض صرافوں کو قتل بھی کروایا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بعد میں بھی بعض حکمرانوں نے اس ضمن میں کوششیں کیں لیکن جلد ہی ہندو صرافوں نے ان کی کوششیں ناکام بنا دیں[۱]۔

دربار میں خواجہ سراؤں کی ضرورت:

محمد شاہ بہمنی کی والدہ جب حج کو چلی تو اس نے معین خان خواجہ سرا کی زیر قیادت کئی دوسرے خواجہ سرا والدہ کی خدمت کے لیے مقرر کیے جو اس کے ہمراہ گئے۔ ان کے علاوہ اس عورت کے ہمراہ اپنی عزیز واقارب عورتیں، سرداروں اور امرا کی خواتین کے علاوہ آٹھ سو بیوہ اور مفلس عورتیں جہاز پر سوار ہوئیں۔ صدر الشریف (ان کے ہمراہ جانے والا معتبر درباری) نے مادر ملکہ کے ایما پر ان سب عورات سے کہا کہ تم اس سفر پر جانے اور آنے میں مادر ملکہ کی مہمان ہو اس لیے اپنی جیب سے کچھ خرچ نہیں کرنا (دراصل محمد شاہ نے سارا خزانہ اپنی والدہ کے سپرد کر دیا تھا) جس چیز کی ضرورت ہو سرکار سے لے کر خرچ کریں اور مانگنے کی تلخی کا نہ سوچیں، کیونکہ یہ مال وقف ہے اور تم سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ پورا گروہ بعد میں مدینہ منورہ بھی زیارت کے لیے گیا اور وہاں اس نے ایک برس قیام کیا۔ مادر ملکہ نے سادات مدینہ کے چار ہزار لڑکے لڑکیوں کی شادی کا اہتمام کیا اور اس کار خیر میں بہت سا روپیہ خرچ کیا۔ وہاں سے اس نے بہت سا مال واسباب معتبر افراد کے ہاتھ بغداد بھیجا تاکہ وہاں، جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے فرزند دفن ہیں، کھانا تقسیم کریں اور باقی روپیہ وہاں کے سادات، زائرین اور خادموں میں بانٹ دیں۔ خود مادر ملکہ اپنی جماعت کے ہمراہ جدہ سے دکن روانہ ہو گئی۔ سلطان نے بندر دابل پر اپنی والدہ کا استقبال کیا۔ بعد میں سلطان نے تیمن وتبرک کے طور پر والدہ کے لباس کعبہ سے چتر بنوالیا اور دو ماہ قصبہ گلبرگہ میں قیام کر کے خوب جشن منائے۔ پھر والدہ کے ہمراہ واپس حسن آباد گلبرگہ پہنچ کر وہاں بھی اس خوشی میں جشن برپا کیے[۱]۔

رقاص کنیزوں کی صورت میں باج:

سلطان علاء الدین بن حسن بہمنی نے باج کی صورت میں، مال وزر کے علاوہ، رقاص کنیزیں حاصل کرنے کا اہتمام کیا تھا، چنانچہ جب اس کی فوج نے کفار کے علاقوں آب تاولی اور بکری پر قبضہ کیا تو دو لاکھ اشرفی علائی، جو وزن میں ۲۰ لاکھ تولہ تھیں، کے علاوہ اور بہت سا دیگر مال و دولت، دوسو ہاتھی اور ایک ہزار رقاص کنیزیں اور گانے بجانے والیاں وہاں کے راجاؤں سے حاصل کیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان مذکور کو فن رقص، موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔

جشن اور دادِ عیش ونشاط:

مختلف جشنوں کے مواقع پر جہاں ''بادشاہ سلامت'' شراب خوری سے خوب دادِ عیش ونشاط دیتے وہاں قوالی کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ چنانچہ جب محمد شاہ بہمنی تخت فیروزہ پر جلوہ افروز ہوا تو چالیس روز تک بڑا زوردار جشن منایا گیا۔ اس نے ''قلم تکلیف شرعی وعرفی از میان برداشتہ'' حکم صادر فرمایا کہ ''ان دنوں میں ہر کوئی نفس امارہ کی ہوا وہوس کے مطابق عیش کرے''۔ چنانچہ تمام امرا اور اعیان مملکت نے اس حکم حاکم کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے گھروں میں ''لوازم عیش وعشرت'' کا سامان کیا۔

قوالوں کا معاوضہ انسانوں کی جانیں:

اس دوران میں بعض استادانِ موسیقی جو امیر خسرو اور میر حسن دہلوی کی سُر اور لے سے واقف تھے اور ان میں سے بعض نے براہ راست ان دو بزرگوں کو سنا تھا، تین سو قوالوں کے ساتھ دہلی سے گلبرگہ آئے۔ محمد شاہ بہمنی نے ان کی آمد کو غنیمت سمجھا اور جشن کے آخری دن ایک مجلس کی ترتیب کا اہتمام کروایا۔ ان قوالوں نے امیر خسرو کی ''دو بیتیاں''، جن میں بادشاہوں کی مدح اور حسن کی تعریف تھی، ''بہ نغمۂ روح افزا وحسن صوت'' گائیں۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے ملک نائب سے کہا کہ وہ ان قوالوں کا معاوضہ بیجانگر کے راجا سے حاصل کر کے انہیں دلا دے۔ جب سیف الدین غوری ملک نائب نے مذکورہ راجا کو اس ضمن میں لکھا تو اسے بہت طیش آیا۔ محمد شاہ کی یہ حرکت، بلکہ نادانی، مدکل کے مسلمانوں کے لیے قیامت ثابت ہوئی۔ راجا فی الفور لشکر لے کر چڑھ آیا اور حصار مدکل کے اندر، خود مسلمانوں کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس نے اس شہر کے تقریباً تمام مسلمانوں کو (مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت) قتل کر ڈالا۔ صرف ایک مسلمان کسی طرح بچ کر محمد شاہ کے پاس پہنچ گیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ چنانچہ محمد شاہ نے بدلہ چکانے کے لیے حملہ کر دیا اور کفار کے قتل عام کا حکم دے دیا جس کے نتیجے میں ستر ہزار افراد قتل ہوئے۔ بعد میں ہندو عوام کے اصرار پر راجا نے محمد شاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیج کر اپنی ندامت کا اظہار کیا اور معافی چاہی۔ محمد شاہ نے قوالوں کے معاوضہ کی ادائیگی کی بات منوا کر راجا سے صلح کر لی[۱۲]۔

دبنگ اور راست گو صوفی:

شیخ زین الدین، محمد شاہ بہمنی کے دور کے ایک صوفی باصفا تھے۔ اس دور کے دوسرے صوفیا نے محمد شاہ کے اوائل حکومت میں اس کی بیعت کی جب کہ شیخ زین الدین نے اجتناب کیا تھا، اس لیے کہ ''بادشاہ سلامت'' شراب خوری اور دیگر اعمال مناہی کا بری طرح شکار تھا اور زین کا کہنا تھا کہ بادشاہت خلق کے لائق صرف وہ شخص ہے جو شعار ملت محمدی (ﷺ) کے حفظ کی کوشش کرے اور ظاہری اور باطنی طور پر مناہی کا مرتکب نہ ہو۔ محمد شاہ نے اپنا ایک آدمی ان کے پاس بھیجا کہ ''یا میری مجلس میں حاضر ہو

یا پھر میری خلافت پر بیعت اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیج''۔ اس پیغام کے جواب میں اس دبنگ صوفی نے کہلا بھیجا کہ ''ایک موقع پر ایک دانش مند، ایک سید اور ایک مخنث کفار کے ہاتھ لگ گئے۔ کفار نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں بت خانہ لے چلو۔ اگر یہ بتوں کو سجدہ کر دیں تو ان کی جان بخشی کر دی جائے ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ دانش مند نے آیہ کریمہ (اس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ یزدانی) پر عمل کرتے ہوئے بتوں کو سجدہ کر دیا اور سید نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے یہ شرط پوری کر دی۔ جب مخنث کی باری آئی تو اس نے کہا: میں تمام عمر ناشائستہ اعمال میں مشغول رہا ہوں۔ میں نہ تو عالم ہوں اور نہ سید کہ ان دو امور میں سے ایک کی پناہ میں ایسا کام کروں اور یوں اس نے اپنی موت کا سامان کر لیا، یعنی بتوں کو سجدہ نہ کیا تو میرا (زین کا) معاملہ بھی اس مخنث کا سا ہے۔ میں نے تیری سختیاں برداشت کیں، لیکن میں نہ تو تیری مجلس میں حاضر ہوں گا اور نہ تیری خلافت کی بیعت کروں گا''۔ اس جواب پر محمد شاہ کو طیش آیا اور اس نے شیخ زین الدین کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے فوراً اپنا عصا اور سامان اٹھایا اور روضہ شیخ برہان الدین پہنچ گئے اور کہا کہ اب کوئی دلیر ہی مجھے یہاں سے ہلا سکتا ہے۔ محمد شاہ نے جب ان کا یہ اصرار دیکھا تو وہ اپنی اس سختی پر نادم ہوا اور اس نے یہ مصرع لکھ کر صدر الشریف کے ہاتھ انہیں بھیجا۔

من زان تو ام تو زان من باش (میں تیرا ہوں تو میرا بن جا)

شیخ نے جواب میں کہا کہ اگر سلطان محمد شاہ غازی مراسم شریعت محمدی کے مراتب کی حفاظت کی کوشش کرے اور اپنے باپ کی طرح ممالک محروسہ میں شراب خانے بند کرا دے اور خود لوگوں کی موجودگی میں، شراب نہ پیے، قضاۃ، علماء اور صدور کو حکم دے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ''جہد جمیل'' کریں تو زین الدین فقیر سے بڑھ کر کوئی اس کا دوست نہ ہوگا''۔ اس کے ساتھ شیخ نے اپنے دست مبارک سے یہ رباعی لکھ بھیجی:

تا من بزیم بجز نکوئی نکنم — جز نیک دلی و نیک خوئی نکنم
آنہا کہ بجای ما بدی ہا کردند — تا دست رسد، بجز نکوئی نکنم

(جب تک میں زندہ ہوں، نیکی کے سوا کچھ نہ کروں گا، سوائے نیک دلی اور نیک خصلتی کے کوئی اور عمل نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ برا سلوک کیا، میں ان کے ساتھ نیکی ہی کروں گا)

اس عظیم صوفی کی باتیں اور نصیحتیں کارگر ثابت ہوئیں، چنانچہ محمد شاہ کی ان سے ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن اس نے اپنی تمام مملکت میں شراب فروشی کی دکانیں بند کروا دیں اور شریعت محمدی کی ترویج میں مساعی جمیلہ بروئے کار لایا[۱۳]۔

چوروں اور ڈاکوؤں کا خاتمہ:

انسانیت کا یہ ناسور شروع ہی سے برسر کار ہے۔ خلفائے راشدین، بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی مکمل بیخ کنی کرنے کی کوشش کی لیکن بعد میں ان ظالموں نے پھر سر اٹھا لیا۔ تیمور لنگ نے ان کا خاتمہ کیا۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح عمری ''تزک تیمور جہانکشاہ'' میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میری مملکت میں جہاں کہیں ڈاکا پڑتا ہے، میں اس علاقے کے کوتوال کو سزا دیتا ہوں، اس لیے کہ یا تو اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کی ہے یا پھر وہ ڈاکوؤں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ میرے اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ میری پوری مملکت ان سے پاک ہو گئی ہے اور اس کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اگر کوئی سونا نقدی وغیرہ لے کر جائے تو کسی کی جرأت نہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اکبر کے دور میں بھی یہی طریقہ بروئے کار لایا

گیا جس سے رعایا سکون کی نیند سونے لگی۔

آمدم برسر مطلب۔ فرشتہ کے مطابق اس وقت دکن کے چور اور ڈاکو "مشہور آفاق" تھے۔ وہ قافلوں اور سامان لدی سواریوں کو لوٹ لیا کرتے جس کے سبب راستے غیر محفوظ تھے۔ محمد شاہ نے اپنی مملکت کو ان سے پاک کرنے پر کمر ہمت باندھی اور اپنے چار طرف دار حکمرانوں کو یہ کہلا بھیجا کہ وہ اپنے علاقوں کو چوروں سے پاک کر دیں اور دوسروں کی عبرت کی خاطر، چھوٹے بڑے کی تمیز کے بغیر، ان سب کے سر دربار کو بھیجے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے چھ ماہ کے اندر اندر ان رہزنوں اور ڈاکوؤں کا نام و نشان تک مٹا دیا[۱۴]۔

بقول ملا داؤد بیدری چھ ماہ کے عرصے میں، اطراف و جوانب سے تقریباً بیس ہزار چوروں اور ڈاکوؤں کے سر حسن آباد، گلبرگہ لائے گئے اور شہر کے باہر چاروں طرف ان ملعونوں کے سروں کے چبوترے بنائے گئے جس سے راستے پر امن ہو گئے اور اہل اسلام کے دل رہزنوں اور ڈاکوؤں کی لوٹ مار سے محفوظ ہو گئے۔

محمد شاہ بہمنی نے یہ سب کام شیخ زین الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خوشنودی کے لیے کیے۔ اس لیے کہ وہ ان سے خط و کتابت کرتا رہا اور وہ اس کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر خوش ہو کر اسے دوستانہ اور پند و نصائح پر مشتمل خطوط لکھتے رہے[۱۵]۔

آنکھوں میں سلائیاں پھرنا:

سلطان داؤد شاہ بن علاء الدین حسن کانکوی بہمنی (م ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء) نے اپنے برادر زادہ سلطان مجاہد شاہ کو، جو اس وقت تخت نشین تھا، قتل کروا دیا تھا۔ (فرشتہ نے شروع میں تو مجاہد کو مبارک تنبول دار کا قاتل بتایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہد نے جو خاصا قوی جثہ لڑکا تھا، باپ کے خزانے سے رقم اڑا کر اپنے ہم جولیوں میں بانٹ دی تھی۔ مبارک نے اس کی خبر اس کے باپ سلطان محمد شاہ کو دی تو اس نے مجاہد کو چابک لگائے۔ بعد میں کشتی کے بہانے مجاہد نے مبارک کو مار ڈالا[۱۶]۔ لیکن بعد میں، فرشتہ ہی کے مطابق، مبارک نے داؤد شاہ سے مل کر مجاہد کو قتل کیا، جبکہ بعض کے مطابق، مبارک خان کے بیٹے مسعود خان نے اسے قتل کیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب[۱۷])۔ بعد میں خود داؤد شاہ، صرف ایک ماہ پانچ روز تخت نشین رہ کر قتل کر دیا گیا۔ اس کا جانشین اس کے ۹ سالہ بیٹے محمد سنجر کو بنایا گیا، لیکن مجاہد کی بہن روح پرور آغا نے اسے قلعے میں بند رکھا اور کہا کہ ایسے "ناخدا ترس ظالم" کا بیٹا، جس نے میرے بھائی کو قتل کیا، خلافت کے لائق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ روح پرور نے موقع پا کر معصوم سنجر کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔ ایک واقعہ اور ملاحظہ ہو: سلطان فیروز شاہ بہمنی نے اپنی وفات (۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) سے قبل سلطنت اپنے بھائی احمد شاہ بہمنی کے سپرد کی اور ساتھ ہی اپنے عیاش بیٹے حسن خان کو بھی اس کی سرپرستی میں دے دیا۔ حسن خان کو کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی جس کے سبب ارکان سلطنت احمد شاہ کو اس کے حبس و قتل کا مشورہ دیتے رہے لیکن احمد شاہ نے ان کے مشورہ کے برعکس اسے پانصدی کا عہدہ دے کر ساتھ ہی فیروز آباد اور اس کے اقطاع دے دیے اور قلعہ فیروز آباد میں اسے عیاشی کرنے کی بھی اجازت دے دی اور یہ کہا کہ وہ وہاں چار کوس سے زیادہ آگے نہ بڑھے۔ چچا کی وفات تک حسن بچا رہا لیکن پھر جلد ہی اس کی آنکھوں میں بھی سلائیاں پھیر کر اسے اندھا اور قلعہ میں محبوس کر دیا گیا، جہاں وہ وفات تک قید رہا[۱۸]۔

تغلچین، بہمنی حکومت کا ایک ترک غلام تھا اور سلطان غیاث الدین بہمنی (۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء میں صرف ایک ماہ حکومت کر سکا) کے دربار سے وابستہ تھا۔ غیاث نے تخت نشینی کے وقت دیگر درباریوں کو تو نوازا لیکن تغلچین کو، جو غیاث کے باپ کا ایک معتبر غلام اور امیر تھا، نظر انداز کر دیا۔ جس کا اسے رنج ہوا، چنانچہ اس نے بدلہ لینے کے لیے ایک عجیب ترکیب نکالی۔ اس کی ایک

بنی اپنے حسن و جمال کے سبب مشہور تھی اور اسے برصغیر کی موسیقی پر بھی عبور تھا۔ تغلچین نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا جس میں سلطان غیاث کو خوب شراب پلا کر مدہوش کر دیا (غیاث کو اس لڑکی سے غائبانہ عشق تھا اور وہ اس خیال سے اس ضیافت میں شریک ہوا تھا کہ تغلچین اپنی یہ بیٹی اسے پیش کرے گا) تغلچین نے باقی حاضرین کو جانے کے لیے کہا۔ غیاث نے اس کا کچھ اور مطلب لے کر سب کو جانے کی اجازت دی۔ بعد میں اگرچہ وہ تغلچین کے ارادے کو بھانپ گیا لیکن اس کا بس نہ چل سکا اور تغلچین نے خنجر سے اس کی آنکھیں نکال دیں[19]۔ اسی طرح سلطان محمود شاہ بہمنی کے بیٹے سلطان شمس الدین کو بھی، درباری سازشوں کی بنا پر، آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اندھا کر دیا گیا۔ وہ پندرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور اس نے کل ستاون (۵۷) روز بادشاہت کی۔ بعد میں وہ مدینہ منورہ چلا گیا جہاں ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء میں فوت ہوا[20]۔

فرشتہ نے ''بہمن نامۂ دکنی'' اور ''فتوح السلاطین منظوم'' کے حوالے سے سلطان فیروز شاہ بہمنی عرف ''روز افزوں شاہ'' بن داؤد شاہ کے بارے میں دلچسپ باتیں لکھی ہیں، جن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس شعر کا ایک مجسم نمونہ تھا:

رات کو خوب ہی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

فرشتہ کے بقول وہ شوکت و عظمت میں دوسرے بہمنی فرمانرواؤں میں ممتاز تھا۔ بہمنی خاندان اسی کی بدولت بلند آواز ہوا۔ اس نے غزا و جہاد کے لوازم میں کوئی کمی نہ کی۔ بڑا سخی تھا وغیرہ..... الخ۔ لیکن محرمات میں استماع نغمہ اور شراب خوری کے سوا دیگر محرمات کے ارتکاب سے اجتناب برتتا۔ اکثر متبرک ایام صوم و صلوٰۃ میں گزارتا اور کوئی فریضہ اس سے نہ چھوٹتا۔ وہ، گویا اپنے دفاع میں، ہمیشہ یہ کہتا کہ ان شرعی مناہی کے ارتکاب سے دل گیر و آزردہ ہوں لیکن نغمہ مجھے چونکہ ذکر حق میں مشغول رکھتا اور دوسرا معاملہ (یعنی شراب خوری) میرے نفس میں فتنہ پیدا نہیں کرتا..... الخ۔

ان دو ''معاملات'' کے علاوہ اس کا دلچسپ معاملہ ''زن دوستی'' ہے۔ بقول مؤرخ چونکہ وہ ''رغبت و حرص تمام بفراہم آوردن زنان داشت'' اس لیے اس نے علما سے کہا کہ چار سے زیادہ اصیل عورتوں سے شادی نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اس سلسلے میں ''چارۂ کار'' کیا ہے؟'' جب حضرت ظلِ الٰہی سلطان نے اس ضمن میں فتوی چاہا تو علما حضرات نے اپنے اپنے علم (یا مزاج کہہ لیجیے) کے مطابق ظل الٰہی کی اس ''زن دوستی'' کا سامان کرنے کی سعی بلیغ کی۔ بعض نے ''فرمایا'': ''چار عورتوں میں سے مسلسل ایک کو طلاق دیتے رہو اور ایک نئی عورت سے شادی کر لو''۔ بعض نے اسے ایک اور راہ سجھائی جو اس ''شاہ اسلام پناہ'' کی طبیعت کے موافق نہ تھی۔ پھر اس نے میر فضل اللہ سے چارۂ کار پوچھا۔ اس نے کہا کہ ''متعہ حضور اکرم ﷺ اور خلیفہ اول کے دور تک جاری تھا۔ خلیفہ دوم نے اسے ختم کیا۔ تاہم فرقۂ امامیہ میں یہ اب بھی مباح ہے، اگر بادشاہ ان سے متعہ کر کے رکھے تو بہتر ہوگا''۔ بعض علمائے اہل سنت نے مخالفت کی، لیکن جب ''صحیح بخاری'' اور مشکوٰۃ حدیث'' لائی گئیں تو ان سے یہ بات ثابت ہوئی کہ متعہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں تھا۔ چنانچہ ''پادشاہ متشرع'' نے طائفۂ امامیہ کے شعار کو اپناتے ہوئے ایک دن میں آٹھ سو عورتوں[21] سے متعہ کیا۔ یہ عجیب الفطرت بادشاہ روزانہ ربع جزو قرآن کریم بھی اپنے ہاتھ سے لکھتا۔ وہ صوفیا کی اصطلاحات سے بھی آگاہ تھا۔ ہفتہ، اتوار اور بدھ کے روز درس دیا کرتا تھا۔

''زنانِ پری پیکر و طاؤس زیب'' سے بے حد ''رغبت'' کی بنا پر اس نے بھورہ نہر کے کنارے ایک خوبصورت شہر آباد کیا اور مختلف ملکوں کی عورتوں (بیویوں) کے لیے الگ الگ اور یکساں قسم کے کوشک تیار کروائے، نیز ان کی ہم زبان کنیزیں بھی

ان کو دیں۔ عرب کی ۹، ایران کی ۹ عورتیں اور ان کی متعلقہ کنیزوں کے علاوہ افغان، بنگالی، راجپوت، گجراتی، تلنگی، کھتری اور مرہٹی عورتیں اس کے عقد میں تھیں۔ ان سب کے حوالے سے ان کے محل ان کے حوالے سے موسوم ہوئے، عربی محل، ایرانی محل، دکنی محل وغیرہ ۲۲۔

حسن فتنہ ساماں:

اماں حوا نے بابا آدم کو جنت سے نکلوایا تھا، ایک فتنہ ساماں بُت یعنی ایک حسینہ نے، جنگ کروا کے کئی انسانوں کو دنیا سے نکلوا دیا۔ بقول فرشتہ، ہندو راجے سلطان فیروز شاہ کو خراج وغیرہ نہیں دے رہے تھے۔ سلطان بھی اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر تغافل سے کام لے رہا تھا، تا آنکہ مدکل کے ایک ہندو زرگر کی پرتھال نامی انتہائی حسین بُت "سرمایہ آشوب گشتہ فتنہ خوابیدہ را بیدار کرد" اور سلطان فیروز شاہ اس کے حصول میں کامیاب ٹھہرا۔ پرتھال کا باپ ایک مفلوک الحال زرگر تھا جو گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا، حتیٰ کہ اس کے ہمسایوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ پرتھال انتہائی حسین "پری پیکر، ماہ منظر کی نقاش قدرت در لطف ترکیب و آرایش چہرہ او کمال قدرت ظاہر ساختہ بود ۲۳" تھی۔ یہ لڑکی موسیقی میں بھی صاحب کمال تھی۔ ہوا یہ کہ ایک موقع پر ایک برہمن ان کے گھر آ کر سال بھر رہا۔ وہ اس لڑکی کے حسن سلوک اور حسن فتنہ ساماں سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے بیجانگر پہنچ کر اس کے حسن کا خوب چرچا کیا۔ بیجانگر کے راجا دیورائے نے اس کے والدین کو مال و زر عطا کر کے اس سے شادی کرنا چاہی، لیکن لڑکی نہ مانی اور ماں باپ سے کہنے لگی کہ مقدر کے فرشتے نے مجھے خوشخبری دی ہے کہ زیور اسلام سے آراستہ ہو کر میری عسرت، عشرت میں بدل جائے گی۔ آپ ذرا صبر کریں۔ برہمن راجا کی طرف سے آیا ہوا تھا، وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔ راجا کی کوشش کے باوصف جب بات نہ بن سکی تو بہت بڑا لشکر لے کر مدکل پر چڑھ دوڑا۔ پرتھال کے والدین اسے لے کر کہیں دور چلے گئے۔ راجا کی فوج نے مایوس ہو کر، واپسی کے دوران، فیروز شاہ کی مملکت کے کئی قصبے اور قریے خاک سیاہ کر ڈالے۔ بعد میں فیروز شاہ اور راجا میں زبردست جنگیں ہوئیں۔ ان میں ساٹھ ہزار ہندو لڑکے لڑکیاں گرفتار ہوئیں۔ بعد میں رائے بیجانگر کی التماس صلح پر فیروز شاہ نے یہ شرط ٹھہرائی کہ دیورائے اپنی دختر دے اور نقد و جنس کے علاوہ دو ہزار گانے والی، ساز بجانے اور ناچنے والی کنیزیں اور غلام پیش کرے اور جہیز کے طور پر قلعہ بنکاپور دے۔ اس نے مجبور ہو کر قبول کر لیا۔

جشن شادی:

شادی خانہ آبادی کے اہتمام کی صورت میں دونوں طرف سے جشن کی تیاری شروع ہوئی۔ چالیس روز تک یہ جشن برپا رہا۔ بیجانگر سے سلطان کی چھاؤنی تک، سات کوس کے فاصلے میں، تمام راستے کے دونوں طرف دکانیں سجائی گئیں اور مسلمان اور ہندو ہنرمندوں نے اس راستے میں کئی قسم کی نعمتیں سجائیں۔ نیز لولیوں (حسین و خوش اندام ناچنے گانے والی عورتوں) اور بازی گروں نے اپنے اپنے فن میں اپنے کمال کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ فیروز شاہ کی طرف سے دو امرا بیجانگر بھیجے گئے جو ایک ہفتہ وہاں قیام کر کے دلہن کو بہت بڑے جہیز اور مال و اسباب وغیرہ کے ساتھ لے آئے۔ بعد میں رائے بیجانگر کے ایما پر دولہا دولہن بیجانگر گئے جہاں ان کا زبردست استقبال ہوا۔ راجا نے شہر کے دروازے سے دارالامارۃ تک (تین کوس کے فاصلے میں) مخمل، اطلس مشجر (درختوں کی سی آرایش) اور دیگر اقمشہ نفیسہ زمین پر بچھوا دیں۔ جب دونوں حکمران شہر میں داخل ہوئے تو راجا کی طرف سے مامور حسین لڑکیوں اور لڑکوں نے سونے چاندی کے پھولوں کے طبق ان پر نچھاور کیے۔ بعد میں اہل بیجانگر، کیا رعایا کیا سپاہی اور زن و مرد، ان کو دیکھنے کے لیے ہجوم کر آئے اور ہر کسی نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ان پر کچھ نہ کچھ نچھاور کیا۔ جب یہ شاہانہ جلوس شہر

کے وسطی میدان سے دارالامارۃ کی طرف چلا تو راجا کے اعزہ واقربا فوج در فوج کوچہ و بازار کے دونوں طرف کھڑے ہو کر ''رسوم نثار'' بجالائے اور پیدل آگے آگے چلے۔ غرض دونوں دولہا دلہن کو ان کے لیے مقررہ جگہ ٹھہرایا گیا۔ تین دن بعد جب فیروز لوٹنے لگا تو دیورائے نے اس موقع پر بھی بے شمار چیزیں تحفۃً پیش کیں اور چار کوس تک وہ ساتھ گیا اور اجازت لے کر لوٹ آیا۔ سلطان فیروز رنجیدہ خاطر ہوا کہ راجا نے چھاؤنی تک ساتھ کیوں نہ دیا۔ یوں انتقام کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی، راجا کو بھی اس کی خبر ہوگئی لیکن صفائے قلب نہ ہوئی۔ بہرحال سلطان فیروز نے ایک جماعت مدکل بھیج کر پرتہال کو بلالیا۔ اس لڑکی کے بارے میں اس نے جو کچھ سنا تھا اسے صحیح پا کر اس کی تعریف کی اور یہ کہا کہ ''میں بوڑھا ہوں اور یہ لڑکی جوان ہے لہٰذا اسے اپنے بڑے بیٹے حسن خاں کو، جو ابھی عنفوان جوانی میں ہے، عطا کرتا ہوں''۔ بعد میں پرتہال کے والدین کو خوش کر کے اس کی شادی شہزادیوں کی طرح کی اور اسے حسن خان کی بیگمات میں شامل کر دیا۲۵۔

مشہور صوفی سید محمد گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کا ورود:

۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء کے لگ بھگ فیروز آباد میں فیروز شاہ کو بتایا گیا کہ دہلی سے اس دور کے مشہور صوفی سید محمد گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ، دکن تشریف لا کر حسن آباد گلبرگہ کے نواح میں مقیم ہیں۔ فیروز، جو ایسی عزیز شخصیات سے ملاقات کا خواہاں رہتا تھا، یہ خوشخبری سن کر محظوظ ہوا۔ اس نے فیروز آباد سے گلبرگہ پہنچ کر، تمام امرا، ارکان سلطنت اور اولاد کو ان کے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ موصوف کو پورے اعزاز واکرام کے ساتھ شہر لایا گیا۔ لیکن چونکہ فیروز ''حکیم طبیعت'' اور علم ریاضی و ہندسہ وغیرہ سے بخوبی واقف تھا، نیز اس ضمن میں سرآمد زمانہ علما اس کے گرد جمع رہتے تھے، اس لیے جب اس نے گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کو ظاہری علوم، خصوصاً معقولات سے عاری پایا تو اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ البتہ اس کے بھائی احمد خان خانخانان کو چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر پورا اعتماد تھا اس لیے اس نے ان کے لیے خانقاہ بنوائی اور ان کی مجلسوں اور محافل سماع میں باقاعدہ حاضر ہوتا رہا۔

فیروز شاہ کی حضرت گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ سے چپقلش:

فیروز شاہ نے جب اپنے عیاش اور خفیف العقل بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنایا اور گیسودراز کو کہلا بھیجا کہ ''میرے حق میں دعائے خیر کریں اور فاتحہ پڑھیں'' تو سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ''جب تم نے بادشاہت بیٹے کو دے دی ہے تو پھر تمہیں اس فقیر کی دعا اور فاتحہ کی کیا ضرورت ہے؟''۔ فیروز شاہ نے پھر آدمی بھیج کر عاجزی کا اظہار کیا۔ سید نے جواب میں کہا کہ ''عالم بالا سے تاج شاہی، تیرے بعد، تیرے بھائی احمد خان کے لیے نامزد ہو چکا ہے، اس لیے کسی دوسرے کے لیے کوشش کرنا بے فائدہ ہے''۔ فیروز ان کی اس بات سے ناراض ہو گیا اور انہیں پیغام بھیجا کہ ''تیری خانقاہ قلعہ کے نزدیک ہے اور یہاں لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے، لہٰذا تو شہر سے باہر چلا جا''۔ سید گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ عالم مجبوری میں اپنے اہل وعیال سمیت گلبرگہ سے باہر آ گئے اور شہر کے ایک طرف ٹھکانا بنالیا، جہاں اب ان کا مزار ہے۔

بتوں سے عجیب سلوک:

احمد شاہ بہمنی نے ہندوؤں کی مسلسل اشتعال انگیزی سے تنگ آ کر بیجانگر کے قریبی علاقوں پر حملہ کر کے کفار کی تباہی کا سامان کیا۔ بعد میں چار بت حسن آباد گلبرگہ بھیج کر وہاں حضرت سید محمد گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے کے سامنے نصب کرا دیے تاکہ زائرین آتے جاتے ان پر لکد کوبی کریں۲۶۔

اِمساک باراں، قحط عظیم۔ حکمران وقت کی نحوست کا نتیجہ؟

۸۴۸ھ/۱۴۴۵ء سے قبل دکن میں اِمساک باراں کے سبب شدید قحط پڑا۔ ملک کی اکثر نہریں اور کنوئیں خشک ہو گئے جس کے نتیجے میں بہت سے چار پائے اور جنگلی جانور ہلاک ہو گئے۔ اس موقع پر سلطان احمد شاہ نے خزانے کا منہ کھول دیا اور لشکر کو نوازا، نیز غلہ کے شاہی انبار سے مسکینوں اور غریبوں کو غلہ دیا۔ پورا ایک سال اسی صورت حال میں گزرا۔ اگلے سال جب پھر یہی صورت حال نظر آنے لگی تو سلطان نے عالم اضطراب میں علما و مشائخ اور زہاد کو نمازِ استسقا کے لیے جمع کیا لیکن جب اس نماز کا بھی کوئی مثبت اثر نظر نہ آیا تو عوام نے سلطان کو منحوس قرار دے کر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ سلطان اس کیفیت سے متاثر و محزون ہو کر خود جنگل کو نکل گیا اور وہاں بلندی پر تنہا چڑھ کر چند رکعت نماز پڑھی اور سر زمین پر رکھ کر اس قدر تضرع و زاری کی کہ قدرت کو جیسے جوش آ گیا اور جلد ہی بادل چھا گئے اور زور کی بارش شروع ہو گئی جس سے سلطان کی طبیعت خوش حال ہو گئی اور وہاں بارش رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ بارش اس شدت کی تھی کہ سلطان کے ہمراہی کانپنے لگے اور سب نے مل کر سلطان سے فریاد کی کہ وہ جلد واپس چلے۔ یہیں ان ہمراہیوں نے سلطان کو ''ولی'' کا خطاب دیا جس سے بعد میں وہ مشہور ہوا۔

عوام دوست، گداگر دشمن بادشاہ:

سلطان علاء الدین بہمنی (وفات ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء) نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کئی اہم کام کیے۔ حیدر آباد بیدر میں اس نے ایک بڑا عمدہ اور شفاف ہسپتال بنوایا جس کے لیے چند گاؤں وقف کر دیے تاکہ مریضوں کے لیے دواؤں، غذاؤں اور مشروبات وغیرہ کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ اس دار الشفا میں مریضوں کے علاج معالجے کے لیے مسلمان اور ہندو اطبا مقرر کیے۔

وہ پوری تاریخ برصغیر کا پہلا اور آخری حکمران ہے جس نے پیشہ ور بھک منگوں کے خلاف اپنے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور اس معاشرتی ناسور کا قلع قمع کیا۔ اس کے فرمان کے مطابق ان بھک منگوں کی گردنوں پر طوق آہنی رکھ کر انہیں گندگی کے ڈھیر اٹھانے، پتھر اور مٹی ڈھونے نیز دیگر محنت طلب کام کرنے کی سزا دی جاتی تاکہ وہ متنبہ ہو کر یا تو حصول معیشت میں مصروف ہو جائیں یا پھر اس کی سلطنت سے باہر چلے جائیں [۲۸]۔ ظاہر ہے اس صورت میں مزید بھک منگے کیوں کر جنم لے سکتے تھے۔

سلطان نے قضاۃ امین اور خدا ترس محتسب مقرر کیے تاکہ عوام کو پورے طور پر انصاف مل سکے اور معاشرہ ظلم و عداوت سے پاک رہے۔ چنانچہ بقول فرشتہ لوگ قدیم ایران کے بادشاہ فریدون کے احسان کا اثر اور نوشیرواں کے انصاف کا شہرہ بھول گئے۔

اگرچہ وہ خود شراب پیتا تھا لیکن اس نے اپنی قلمرو میں یہ فرمان جاری کر رکھا تھا کہ کوئی شراب نوشی نہ کرے اور نہ ہی جوا کھیلے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اس ضبط و گرفتگی کے باوجود بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شراب خوری یا کوئی دوسری نشہ آور شے استعمال کرتا تو سیسہ پگھلا کر اس کے حلق میں انڈیلا جاتا اور اس ضمن میں کسی کا لحاظ نہ کیا جاتا۔ چنانچہ ایک موقع پر حضرت سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے ایک پوتے نے کسی بازاری عورت سے تعلق قائم کر کے ایک رات اس کی خاطر شراب پی لی۔ پھر حالت مستی میں اس عورت کے بال کاٹ کر اسے بہت سے چابک مارے۔ جب یہ خبر کوتوال تک پہنچی تو اس نے اس مخدوم زادہ اور قحبہ دونوں کو قید میں ڈال دیا۔ دوسرے دن موقع پا کر کوتوال نے سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی۔ سلطان کو بہت غصہ آیا اس نے حکم دیا کہ مخدوم زادہ کو بازار کے وسط میں کھڑا کر کے، جہاں اسے سب دیکھ سکیں اور عبرت پکڑیں، دو سو تازیانے اس کے تلووں پر مارے جائیں اور اسے قسم دیں کہ وہ پھر کبھی شراب نوشی نہیں کرے گا۔ نیز اس قحبہ کو گدھے کی کھال میں ڈال کر شہر میں پھرایا

جائے اور پھر شہر سے نکال دیا جائے ۲۹۔

قطب سے چور:

یہی سلطان علاء الدین شاہ جس نے ملک میں انصاف پھیلایا، عوامی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے، جو جمعہ اور عیدین کے مواقع پر مسجد میں منبر کے قریب بیٹھ کر وعظ سنتا بلکہ کبھی خطبہ بھی دیتا لیکن جب وہ یورش بیجانگر سے لوٹا تو بری طرح عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔ اس نے تمام جزوی وکلی ملکی و مالی معاملات درباریوں کے سپرد کر کے کوئی ایک ہزار حسیناؤں کو سراپردۂ شاہی میں جمع کر لیا اور دریائے نعمت آباد کے کنارے ایک ایسا بے مثال جنت نظیر باغ اور فردوس بریں کی مانند محل تعمیر کر لیا کہ ''استادان خطہ کون وفساد مثل آن باغ وعمارت در معمورۂ آب وگل طرح نیفگندہ اند'' (ص ۳۳۴)۔ وہ اکثر اوقات اس باغ میں ''بادۂ لعل فام'' کے گھونٹ چڑھا کر ان ''دلبران سیم اندام'' کے ''لعل لب'' سے لذت اندوز ہونے اور ''شیریں کلام'' مطربوں کے نغمات سننے میں مشغول رہتا اور عوام کے امور مصالح کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا۔ اس عرصہ عیش ونشاط میں وہ ہر چار پانچ ماہ بعد ''سلام عام'' لیتا۔

BACK TO THE PAVILION

بہر حال حالات نے پھر کروٹ بدلی جس کے سبب وہ پھر سلطنت کے امور اور عوام کی فلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ ہوا یوں کہ دکنی مسلمانوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے ہزاروں اہل سادات کو شہید کر ڈالا ۳۰۔ ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں شیخ آذری نے، جو مقتدائے سلطان تھا اور ایام شاہزادگی میں اس سے بہت محبت کرتا تھا، اس واقعہ کے بارے میں ایک طویل عریضہ اسے (علاء الدین شاہ بہمنی کو) لکھا، جسے پڑھ کر وہ بے حد متاثر ہوا۔ اس نے شراب نوشی سے توبہ کی اور مذکورہ قتل عام کے سلسلے میں مقید دکنیوں کو قتل کروا دیا اور ہر روز مہمات سلطنت کی طرف توجہ کرنے لگا اور دکنیوں کو بڑے بڑے عہدوں سے معزول کر دیا ۳۱۔

ایک جرأت مند عرب تاجر:

اسی سلطان علاء الدین شاہ کے دور میں گھوڑوں کے ایک عرب تاجر نے اپنے چند لحسائی گھوڑے سلطان کے اہل دیوان کے ہاتھ فروخت کیے۔ یہ لوگ قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ تاجر پہلے ہی سادات اور دوسرے مسلمانوں کے قتل کے واقعہ سے آزردہ خاطر تھا، جب اس کے ساتھ یہ معاملہ ہوا تو ایک روز وہ مسجد میں پہنچا اور منبر کے قریب بیٹھ گیا۔ جب سلطان حسب معمول منبر پر چڑھ کر خطبہ دینے لگا اور ان القابات سے اس نے اپنی ستایش کی: ''السلطان العادل الکریم الحلیم الرؤف علی عباداللہ الغنی علاء الدنیا والدین علاء الدین بن اعظم السلاطین احمد شاہ ولی''، تو عرب تاجر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: ''لا، واللہ لا عادل ولا کریم ولا رحیم ولا رؤف، ایھا الظالم الکذاب تقتل الذریۃ الطاھرہ و تتکلم بھذاہ الکلمات علی منابر المسلمین؟'' ۳۲۔ (نہیں، خدا کی قسم نہ تو عادل ہے اور نہ کریم، اور نہ رحیم اور نہ مہربان ہے۔ اے بے حد جھوٹے ظالم تو نے سادات کی اولاد کو قتل کیا کرایا اور اب مسلمانوں کے منبر پر اس قسم کی باتیں کرتا ہے؟)

سلطان بے حد متاثر ہو کر زار زار رونے لگا اور اسی وقت گھوڑوں کی قیمت ادا کر کے بولا ''جن لوگوں نے یزید کی طرح مجھے دنیا و آخرت میں بدنام کیا ہے وہ غضب الٰہی کی آگ سے بچ نہ سکیں گے''۔

برصغیر کی تاریخ کا ظالم ترین اور بدمعاش ترین بادشاہ:

علاء الدین شاہ بہمنی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے انتہائی ظلم وستم کے باعث ''ظالم'' کے عرف سے مشہور ہوا۔ اس کے ظلم وستم کے واقعات پڑھ کر قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اپنے مخالفین تو ایک طرف، عام لوگوں پر اس نے وہ ظلم ڈھائے کہ تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی اور بقول مورخین، قبل از اسلام کے ظالم ایرانی بادشاہ ضحاک نے بھی ایسے ظلم نہیں ڈھائے ہوں گے اور یہ کہ اس (ہمایوں شاہ) کے مقابلے میں حجاج بن یوسف جیسا ظالم فرماں روا گویا نوشیرواں جیسا عادل بادشاہ تھا۳۳۔ فرشتہ نے مختلف حوالوں سے اس کے غیظ وغضب کی حیران کن تصویر کشی کی ہے۔ شہزادہ حسن خان اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ جب ہمایوں کو رنگل سے اس کے خروج کی خبر ملی تو اس (ہمایوں) پر خشم وغضب کچھ اس زور سے طاری ہوا کہ وہ منہ موڑ موڑ کر اپنے کپڑے پھاڑنے لگا۔ پھر اس نے زمین اور دری کو دانتوں میں اس زور سے پکڑ کر دبایا کہ اس کے ہونٹ اور منہ لہولہان ہو گئے۔ اور جب وہ احمد آباد بیدر پہنچا تو جو ظلم وستم اس نے وہاں کے عوام پر ڈھائے وہ ''از ہیچ یک جبارہ سلف صدور نیافتہ وتیغ درآشناو بیگانہ نہادہ از وظلمی بظہور آمدہ کہ حجاج ظالم، انوشیروان عادل شد۳۴۔ (ایسے ظلم گزشتہ بڑے بڑے جابروں نے بھی نہیں کیے ہوں گے۔ اپنوں اور بیگانوں پر اس نے وہ تیغ زنی کی اور ظلم ڈھائے کہ اس کے مقابلے میں حجاج جیسا ظالم گویا انوشیروان عادل بن گیا)۔

اس کے حکم پر احمد آباد بیدر کے بازار میں پھانسیاں لٹکائی گئیں اور حلقے نصب کیے گئے، جگہ جگہ مست ہاتھی اور ہر قسم کے درندے چھوڑے گئے۔ کئی مقامات پر گرم پانی اور ابلتے ہوئے تیل سے بھری ہوئی دیگیں اور قرابے لائے گئے۔ پھر خود دیوان خانہ پر بیٹھ کر سب سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی حسن خان کو شیر کے آگے ڈالا جس نے اس کی ہڈی بوٹی نوچ کر اس کا وجود ختم کر دیا۔ اس کے بعد یوسف ترک کچل اور اس کے سات ساتھیوں کی گردنیں اڑا دیں اور ان کے بے گناہ بیوی بچوں کو، انتہائی زشت انداز میں ان کے گھروں سے نکال کر، ایسی جگہ لایا گیا جہاں عوام کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم کے سامنے ان عورتوں اور بچوں پر ایسے قبیح اور شنیع انداز میں ظلم ڈھایا گیا کہ بقول مورخ: ''تصرتکش از حسن ادب دوراست''۳۵۔ (اس ظلم کی وضاحت حسن ادب سے دور ہے یعنی انتہائی شرمناک ظلم تھا)۔ پھر سب مردوں اور عورتوں کو اپنے اختراع کردہ شکنجوں اور عقوبتوں میں کس کر، چھوٹوں بڑوں سب کو قتل کر دیا۔ اس پر بھی اس کا غصہ فرو نہ ہوا۔ چنانچہ اب اس نے شاہزادہ کے متعلقین اور منسوبین نیز دوسرے لوگوں کو، جن کی تعداد کوئی سات سو تھی، اور جن میں باورچی، طبّاخی اور دیگیں دھونے والے بھی تھے، اور یہ سب لوگ اصل معاملے سے بے خبر تھے، شاہ بازار بھجوا دیا جہاں ان میں سے بعض کو پھانسی پر لٹکایا گیا، بعض کو بھوکے شیروں اور مست ہاتھیوں کے آگے اور بعض کو ابلتی دیگوں میں ڈالا گیا تو بعض کو خنجروں، چھریوں اور تیروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔

اپنے چھوٹے بھائی حسن خان اور اس کے وابستگان پر مذکورہ مظالم کے باوجود اس کی آتش غضب سرد نہ ہوئی، چنانچہ اکثر شاہزادوں اور وارثان مملکت کو، جو قلعوں اور کونوں کھدروں میں فقر وفاقہ پر قناعت کرتے ہوئے اپنے حال میں مست تھے، پکڑ کر قتل کر دیا۔ اپنی اس قسم کی سیاست کے باوجود وہ تقریباً تمام رعایا سے بدگمان رہا اور مسلم وکافر، چھوٹے بڑے سب پر غیظ وغضب اور ظلم وستم کی تلوار چلاتا رہا۔

اس ظلم وستم کے علاوہ وہ بدمعاشی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ لوگوں کی آل اولاد پر دست درازی کر کے اپنے نفس کی آگ بجھاتا۔ اس ضمن میں بعض دفعہ تو وہ اس انتہا کو پہنچ جاتا کہ اس کے حکم پر راستے میں سے کسی بارات سے دلہن کو اٹھا کر اس کے حرم میں

لایا جاتا جہاں وہ اس مظلومہ کے ساتھ ناز یبا سلوک کر کے اسے اس کے شوہر کے پاس بھجوا دیتا۔ کبھی اچانک، کسی وجہ کے بغیر، اہل حرم کو قتل کر دیتا۔ غرض یہ ظالم وسفاک مسلمان، ملت اسلامیہ کے لیے کفار سے بھی زیادہ دشمن ثابت ہوا۔ ظالم کو کب تک ڈھیل ملتی، آخر اسے جہنم رسید ہونا تھا۔ چنانچہ شہاب خان نامی ایک خواجہ سرانے، جو ضابطہ حرم تھا، چند حبشی کنیزوں کے ساتھ مل کر ایک سکیم تیار کی۔ سو ایک شب جب وہ سفاک ترین سلطان شراب پینے کے بعد عالم مستی میں غرق خواب تھا، ایک حبشی کنیز نے اس زور سے اس کے سر پر ڈنڈا مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ''الظالم فی النّار جھنم'' یہ واقعہ ۲۸ ذیقعدہ ۸۶۵ھ/ ۱۴۶۱ء ۴راگست، کو پیش آیا۔ ملا نظیری نے اس کے بارے میں یہ رباعی کہی تھی اور بعد میں اس کی تاریخ وفات بھی کہی:

اے ظالم از آہ دل شب خیز بترس   وز نفس بد شوم شر انگیز بترس
مژگان دم آلودۂ مظلومان بین   وز خنجر آبدار خونریز بترس

(اے ظالم: راتوں کو جاگنے والے دل کی آہ سے ڈر اور شر انگیز، بد اور شوم و منحوس نفس سے ڈر۔ مظلوموں کی خون آلود پلکیں دیکھ اور خونریز تیز خنجر سے ڈر)

تاریخ وفات: (یہ رباعی طنز کی عمدہ مثال ہے):

ہمایون شاہ مرد و رست عالم   تعالی اللہ ز ہے مرگ ''ہمایون''
جہان پُر ذوق شد، تاریخ فوتش   ہم از ''ذوق جہان'' آرید بیرون

(ہمایوں شاہ مر گیا اور دنیا والوں نے نجات پالی۔ سبحان اللہ، واہ وا کیسی ''مبارک'' موت ہے۔ اس کی موت پر جہان پر ذوق ہو گیا، لہٰذا ''ذوقِ جہان'' (۸۶۵) ہی سے اس کی تاریخ وفات نکال لو)

فرشتہ نے ہمایوں کے بیٹے کی تخت نشینی کے ذکر سے پہلے پُر طنز جملہ استعمال کیا ہے: ''چون ہمایون شاہ برخلایق ترحم کردہ فوت شد'' ۳۶۔ (جب ہمایون شاہ عوام پر رحم کرتے ہوئے مر گیا)۔

جابر حاکم کے آگے کلمہ حق، ایک راست گو بے باک مولانا:

جب سلطان محمود خلجی نے شہر حیدر آباد بیدر کا محاصرہ کر کے اسے مسخر کیا تو وہاں کی عمارات کو جلا دیا، لوگوں کو لوٹا تباہ کیا اور دیگر کئی تباہیاں مچائیں۔ ازاں بعد وہ تسخیر دکن کو جانا چاہتا تھا لیکن یہ خیال ترک کر کے اپنی رعایا کی دلجوئی اور معموری ولایت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا طریق کار یہ تھا کہ اپنا لباس اور اپنی غذا رزق حلال سے تیار کرتا۔ ہر سفر میں رزق حلال ہی سے چاول، گندم، گھی اور لباس لے کر چلتا۔ کئی تختوں پر قسم قسم کی سبزیاں کاشت کر کے ساتھ رکھتا۔ جب اسے ایک مدت تک بہمنی پایہ تخت احمد آباد بیدر میں رکنا پڑا تو اس نے مولانا شمس الدین حق گو کرمانی کو طلب کیا جو شاہ خلیل اللہ کے مقبرہ سے وابستہ تھے، اور ان سے کہا: ''کسی سبزر ہگذر سے گزرتے ہوئے مجھے تشویش لاحق ہوتی ہے اور تختوں پر اگائی ہوئی سبزی مطبخ کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ اگر کسی شخص کے پاس روزی حلال کی زمین ہو جہاں سبزی اگائی جاتی ہو تو ہماری رہنمائی کر تا کہ وہاں جا کر حلال کی روزی سے بڑی قیمت پر سبزی خرید کر مطبخ تک پہنچائی جائے''۔ ''حلال کی روزی'' میں ڈوبے ہوئے اس ''عالم پناہ'' کے اس ''ارشاد عالیہ'' کے جواب میں اس بے باک و بے خوف مرد مجاہد مولانا شمس حق گو نے کیا خوب کہا: ''اے سلطان! ایسی بات نہ کر جو تمسخر اور استہزاء کا باعث بنے، اس لیے کہ مسلمانوں کی مملکت میں داخل ہو کر (یعنی فتح کر کے) ان کے گھروں اور مساکن کو تباہ کرنا اور اموال و اسباب کی لوٹ مار کرنا لیکن سبزی اور اشیائے خوردنی و پوشیدنی کے لیے شرع کا پابند ہونا عقل سے دور اور خدا ترسی سے بعید ہے'' ۳۷

ہے''۔انسانی نفس کس طرح اپنی خباثتوں اور ظلم وتعدی کو جائز قرار دینے کے لیے مختلف دلیلیں لاتا ہے، اس کی ایک مثال سلطان مذکور کی ہے۔ مولانا کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے لیکن ساتھ ہی بولا: ''تو صحیح کہتا ہے لیکن جہانگیری اس کے بغیر میسر نہیں آتی''۔تاہم یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ مولانا کی بات سن کر طیش میں نہیں آیا اور اس بات کا خاطر خواہ اثر لیا۳۸۔

انسانی فطرت میں عظیم انقلاب:

محمود گاوان ایک ملک التجار اور بہمنی دربار سے وابستہ ہونے کے سبب چند ایک بہمنی بادشاہوں کا دور دیکھ چکا تھا، وہ اپنے کارناموں کے سبب ایک تاریخی شخصیت قرار پایا۔ اسے ایک ملکہ کی طرف سے خلعت خاص کے علاوہ ''خواجہ جہاں'' کے خطاب اور امیر الامرائی اور وکالتِ امور شاہی کے منصب سے نوازا گیا۔ شروع شروع میں اس کے لیے یہ القاب لکھے گئے: ''مخدوم جہانیاں، معتمد درگاہ سلطان آصف جم نشان، امیر الامرا، ملک نائب، مخدوم، خواجہ جہان'' بلاشبہ اسے بڑا مرتبہ ملا، لیکن جب قدرت کو کسی کی طبیعت وفطرت میں کوئی عظیم انقلاب لانا مقصود ہو تو کوئی ایسا بہانہ پیدا کر دیتی ہے جس سے بظاہر اس انقلاب کی توقع ممکن نہیں ہوتی۔ ہوا یوں کہ ایک موقع پر مختلف سلطنتی کام انجام دے کر وہ تین سال بعد دار الخلافہ احمد آباد بیدر لوٹا۔ سلطان محمد شاہ اس کی رہائش گاہ پر گیا جہاں وہ اپنے ایک ہفتہ کے قیام تک عیش وعشرت میں مشغول رہا اور محمود کو خلعت خاصہ سے نوازا۔ سلطان کی والدہ ساتھ تھی، اس نے محمود کو اپنا بھائی کہا۔ سلطان نے اس کے القاب میں ان الفاظ کا اضافہ کیا: ''حضرت مجلس کریم، سید عظیم، ہمایوں اعظم، صاحب السیف والقلم، مخدوم جہانیاں، معتمد درگاہ شاہان، آصف جم نشان، امیر الامرا ملک نائب، مخدوم ملک التجار محمود گاوان المخاطب بہ خواجہ جہان''۔سلطان نے دربار کے منشیوں اور طغرا نویسوں کو یہ حکم دیا کہ وہ مناشیر میں یہ عبارت لکھیں ۳۹۔ظاہر ہے یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو ہر طرح کے عجب وتکبر کا باعث بن سکتا تھا لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہوا، یہ گویا قدرت کا کرشمہ تھا، یعنی جب سلطان محمد شاہ بہمنی ایک ہفتہ اس کے یہاں قیام کر کے واپس گیا تو اسی وقت محمود گاواں کمرے میں چلا گیا، اس نے دروازہ بند کر لیا، اپنا نفیس اور انتہائی قیمتی لباس اتارا اور گریہ وزاری کرتے ہوئے زمین پر لیٹ کر اتنی عاجزی اور فروتنی کی کہ اس کے رخسار گرد آلود ہو گئے اور جب وہ کمرے سے باہر آیا تو اس نے درویشانہ لباس پہن کر احمد آباد بیدر کے تمام حق دار علما وفضلا اور سادات کو بلایا۔ اس وقت اس کے پاس جس قدر نقد وجنس، جواہر اور قیمتی قسم کی متاع اور اس مدت میں تجارت اور امیر الامرائی کی صورت میں کمائی ہوئی تمام دولت تھی، سب ان میں تقسیم کر دی، البتہ کتب، گھوڑے اور ہاتھی اپنے پاس رکھے اور کہا: ''الحمد للہ میں نفسِ امارہ کے ہاتھوں بچ گیا اور اس کے وسوسہ سے مجھے رہائی مل گئی''۔ایک عالم ملا شمس الدین محمد نے اس سے سوال کیا کہ اس میں کیا راز ہے کہ تو نے اپنی تمام دولت وغیرہ، جس سے تجھے محبت تھی، تو لوگوں میں تقسیم کر دی اور یہ تین اشیا (کتب، ہاتھی وغیرہ) اپنے پاس رکھ لی ہیں؟ اس نے سلطان محمد شاہ کی اس کے گھر آمد اور اس کی والدہ کا محمود کو بھائی کہنے کا ماجرا سنایا اور کہا کہ ''اسی وقت میرے نفس امارہ نے سرکشی شروع کر دی اور مجھ پر اس قدر عُجب وتکبر کا غلبہ ہوا کہ میں سراسیمہ وحیران رہ گیا، تاہم میں نے وہیں اپنی طرف توجہ کی اور میں نفسِ امارہ کی سرزنش میں کھو گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی بات پر میں ہوش میں آیا۔اس نے مجھ میں یہ تبدیلی دیکھ کر پوچھا: ''طبیعت کیسی ہے؟''۔میں نے کہا: ''دردِ دل کے سبب خفقان کا شکار ہو گیا ہوں''۔ بادشاہ نے اسے میرے بدنی عوارض پر محمول کیا اور مجھے آرام کرنے کا فرمایا اور خود واپس چلا گیا۔ سو یہ تمام اسباب تجمل جو عجب وتکبر کا باعث بن رہے تھے، ان سے میں نے جان چھڑا لی، رہی کتابوں کی بات تو کتابیں طالبانِ علم کے لیے وقف ہیں، میری ملکیت نہیں اور اسپ وفیل خود سلطان سے متعلق ہیں جو چند روز کے لیے بطور عاریت میرے پاس ہیں اور جو آخر کار ادھر واپس لے جائے

جائیں گے''۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اس نے ہمیشہ سادہ لباس پہنا اور جب مہمات سلطنت سے فارغ ہوتا تو مسجد اور اپنے مدرسے میں جاتا جہاں وہ فقرا اور صاحبان دل سے صحبت رکھتا۔ ان کی احوال پرسی کرتا اور ان کی دیکھ بھال میں ذرا کوتاہی نہ کرتا۔ نیز جمعہ کی اور دوسری متبرک راتوں میں زرسرخ وسفید کی تھیلیاں اپنے ساتھ رکھتا اور لباس مجہولاں (جو پہچانے نہ جائیں کہ وہ کون ہیں) میں شہر کی گلی گلی میں جاتا جہاں وہ دردمندوں اور عاجز وبیکس لوگوں کو نوازتا اور کہتا: ''یہ عطیہ شاہ کی طرف سے ہے۔ اس کی سلطنت کے دوام کی دعا کرو''۔

شیر خواری میں شادی:

۹۰۳ھ/۸-۱۴۹۷ء میں سلطان محمود شاہ بہمنی نے یہ ارادہ کیا کہ یوسف عادل خان کی ایک سالہ بیٹی بی بی ستی سے احمد نگر[۴۰] کے چار سالہ شہزادے کی منگنی کی جائے۔ چنانچہ دونوں طرف سے گفت وشنید اور آدمیوں کے باہمی ربط سے یہ بات طے پائی کہ حسن آباد گلبرگہ میں جشن کا سامان کر کے نکاح کی رسم ادا کی جائے۔ لہٰذا محمود شاہ اور ''خان والا شان'' یوسف عادل، حسن آباد گلبرگہ پہنچے اور دعوت کا اہتمام کیا۔ جشن وسرور کے دوران چندامرا اڑیسہ سے قاسم برید اور قلعہ نریدہ سے خواجہ جہان خدمت شاہ میں حاضر ہوئے۔ ان کی موجودگی میں فوج کے قاضی عبدالسمیع نے نکاح خوانی کی۔ بعد میں یہ طے پایا کہ جب دلہن دس سال کی ہو گی (یہ عمر بھی عدم بلوغت کی ہے) تو اسے شہزادے کے سپرد کر دیا جائے گا۔ چنانچہ بعد میں مختلف جنگوں سے فارغ ہو کر ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں حسن آباد گلبرگہ میں عظیم جشن منا کر بی بی مشی کو شہزادہ احمد کے سپرد کر دیا گیا[۴۱]۔

حواشی

۱۔ تاریخ فرشتہ، مطبوعہ مطبع منشی نولکشور، کانپور، ۱۸۸۲ء، جلد ۱، ص ۳
۲۔ ایضاً، ص ۴
۳۔ ایضاً
۴۔ سنوری: پرشین لٹریچر، سیکشن ۲، حصہ ۳، ص ۴۴۵
۵۔ ایضاً، ص ۴۴۴
۶۔ تاریخ فرشتہ، بحوالہ سنوری، ص ۴۴۶
۷۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۲۸۲
۸۔ ایضاً
۹۔ ایضاً، ص ۲۷۷ (جلد اول)
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۸۳
۱۱۔ ایضاً ص ۲۸۴
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۸۹، ۲۹۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۹۴، ۲۹۵
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۹۵
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۲۹۶
۱۷۔ ایضاً، ص ۳۰۰
۱۸۔ ایضاً، ص ۳۰۱، ۳۲۰
۱۹۔ ایضاً، ص ۳۰۴
۲۰۔ ایضاً، ص ۳۰۶
۲۱۔ آٹھ سو کی تعداد پر یقین نہیں آتا۔ ممکن ہے کاتب کی لغزش قلم ہو۔
۲۲۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۳۰۷-۳۰۹
۲۳۔ ایضاً، ص ۳۱۲ (وہ لڑکی پری پیکر اور چاند ایسی صورت والی تھی جس کی لطف ترکیب اور چہرے کی آرائش میں نقاش قدرت نے اپنی قدرت کا کمال ظاہر کیا تھا)

۲۴ ایضاً، ص ۳۱۵ ۲۵ ایضاً، ص ۳۱۶

۲۶ ایضاً، ص ۳۲۱ ۲۷ ایضاً، ص ۳۲۲

۲۸ ایضاً، ص ۳۲۳ ۲۹ ایضاً، ص ۳۲۴

۳۰ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کا صفحہ ۳۳۶۔۳۳۷

۳۱ ایضاً، ص ۳۳۷ ۳۲ ایضاً، ص ۳۳۸

۳۳ ایضاً، ص ۳۴۲ ۳۴ ایضاً

۳۵ ایضاً، ص ۳۴۳

۳۶ ایضاً یہ ملا نظیری غالباً اسی دور کا کوئی شاعر ہے کیونکہ نظیری نیشاپوری کا تعلق بہت بعد کے زمانے سے ہے۔

۳۷ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۴۳

۳۸ ایضاً، ص ۳۴۶۔۳۴۷

فرشتہ نے یہ واقعہ بیان کر کے کتاب ''فتوحات'' یا کسی دوسری کتاب کے حوالے سے ایسا ہی ایک واقعہ بیان کیا ہے جو کچھ یوں ہے۔ کسی عرب ملک کا ایک بادشاہ یحییٰ بن نعمان تھا۔ اس کے عہد میں ابو عبداللہ نامی ایک شیخ تھے جو لوگوں سے کٹے ہوئے اور آنے جانے والوں سے دوری اختیار کیے ہوئے تھے۔ ایک روز یحییٰ بن نعمان کہیں سے گزر رہا تھا۔ اتفاق سے شیخ بھی اپنے مریدوں کے ساتھ ادھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے سلطان کو سلام کیا۔ سلطان نے جواباً سلام کہہ کر ان سے پوچھا ''یہ جو میں نے ریشمی لباس پہن رکھا ہے کیا اس سے نماز پڑھنا جائز ہے، یا نہیں؟'' شیخ نے تبسم فرماتے ہوئے جواب دیا ''تیرا حال اس شخص جیسا ہے جس کا سر تا پا نجاست سے آلودہ ہے لیکن وہ پیشاب کے قطرے سے بچتا ہے۔ تیرا شکم حرام سے پُر ہے، پھر انسانوں پر مظالم تیری گردن میں ہیں، اس حالت میں تو ریشم اور صحت صلوٰۃ کے بارے میں پوچھ رہا ہے؟''۔ اس جواب پر یحییٰ رو پڑا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے شیخ کا دامن تھام لیا اور ترک سلطنت کر کے بقیہ عمر شیخ کی خدمت میں گزار دی۔ (صفحہ ۔ ۳۴۶)

۳۹ تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۳۵۰

۴۰ فرشتہ نے پہلے شاہزادہ احمد نگر لکھا ہے (جلد اول صفحہ ۳۷۱) لیکن آگے چل کر شاہزادہ احمد لکھا ہے (ص ۳۷۳)

۴۱ ایضاً، ص ۳۷۱، ۳۷۵

''ادارۂ یادگارِ غالب'' کراچی کی چند نئی مطبوعات

محمد سعید

ادارہ یادگارِ غالب (کراچی) کے قیام و استحکام اور انتظام و انصرام کے لیے مرزا ظفر الحسن (ولادت: ۳۰ جون ۱۹۱۶ء، وفات ۴ ستمبر ۱۹۸۴ء) کی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس ادارے کو مرزا صاحب کے فیض احمد فیض سے تعلق خاطر اور غالب سے عقیدت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر، کراچی میں تقریبات کے اہتمام کے لیے انہوں نے فیض احمد فیض کے تعاون سے ۱۹۶۸ء میں اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ فیض احمد فیض پہلے صدر اور مرزا ظفر الحسن پہلے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ انہوں نے مختلف مگر مثبت طریقوں سے اہل ذوق سے فنڈز اور عطیات لیے مگر ادارے کی خودداری، خود مختاری اور انفرادیت میں کسی مرحلے پر، حرف اور ضعف نہیں آنے دیا۔

ادارہ یادگارِ غالب، کسی نہ کسی صورت، دیرسویر، اپنے اغراض و مقاصد پر پورا اترتا رہا ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر وسیع پیمانے پر تقریبات منعقد کروائیں، غالب اور غالب سے متعلق اسی دوران میں چودہ پندرہ کتابیں بھی شائع کیں۔ ادارہ ہی کے تحت ۱۹۷۱ء میں ''غالب لائبریری'' کا قیام و استحکام عمل میں آیا۔ ۱۹۷۵ء میں رسالہ ''غالب'' شائع کرنا شروع کیا۔ غرض غالب اور غالبیات کے سلسلے میں اس نوع کے کام اور اقدامات، مرزا ظفر الحسن اور ادارے کے دیگر متعلقین کی محنت، لگن، شوق اور جنون کا مظہر ہیں۔ مرزا صاحب کی وفات کے بعد ادارہ اور رسالہ کچھ عرصہ تعطل کا شکار رہے، لیکن نئے منتظمین کی توجہ سے اب ادارہ پھر، انہیں راہوں پر گامزن نظر آتا ہے جو مرزا صاحب نے متعین اور ہموار کی تھیں۔ اس کے موجودہ منتظمین میں درج ذیل ناموں کی کہکشاں نظر آتی ہے جو اپنے علم و فضل کی بدولت اسے یادگار بناتے چلے جا رہے ہیں۔

بیگم آمنہ مجید ملک (صدر نشین) مختار زمن (معتمد عمومی)، رعنا فاروقی (معتمد)، ڈاکٹر مشرف احمد (شریک معتمد) اور سید اعجاز حسین (خازن)۔

پچھلے چند برسوں میں ادارہ یادگارِ غالب (کراچی) کی طرف سے درج ذیل نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مقالات ممتاز، از ڈاکٹر ممتاز حسن (مرتبہ: شان الحق حقی)، نامہ ہائے فارسی غالب (اردو ترجمہ: پرتو روہیلہ)، غالب کی اردو نثر اور دوسرے مضامین، از حامد حسن قادری (مرتبہ: ڈاکٹر خالد حسن قادری) اور انشائے غالب (رشید حسن خان) ان کے ساتھ اور اسی دوران میں سات دیگر کتب اور ''غالب'' کا ایک نیا شمارہ بھی ادارے نے شائع کیا ہے۔ یہاں ادارے کی درج ذیل مطبوعات کا تعارف اور تذکرہ مقصود ہے:۔

۱۔ یادگارِ غالب (طبع اول کی عکسی بازیافت) مولانا الطاف حسین حالی، ۱۹۹۷ء، صفحات ۴۳۸، قیمت ۲۰۰ روپے

۲۔ غالب: شخصیت و کردار، پروفیسر لطیف اللہ، ۱۹۹۸ء، صفحات ۱۳۴، قیمت ۸۰ روپے

۳۔ رموز غالب، ڈاکٹر گیان چند، ۱۹۹۹ء، صفحات ۴۵۱، قیمت ۲۵۰ روپے

۴۔ تذکرۃ الشعرا (مولانا حسرت موہانی) مرتبہ: شفقت رضوی، ۱۹۹۹ء، صفحات: ۶۸۶، قیمت ۳۰۰ روپے
۵۔ مآثر غالب (قاضی عبدالودود) مرتبہ: ڈاکٹر حنیف نقوی، ۲۰۰۰ء، صفحات ۲۵۶، قیمت ۱۵۰ روپے
۶۔ املائے غالب، رشید حسن خان، ۲۰۰۰ء، صفحات ۲۱۶، قیمت ۱۴۰ روپے
۷۔ تصحیح و تحقیق متن، پروفیسر نذیر احمد، ۲۰۰۰ء، صفحات ۹۵، قیمت ۸۰ روپے
۸۔ غالب (رسالہ)، شمارہ ۱۹، ۲۰۰۰ء، صفحات ۳۵۰ + ۱۲۷ = ۴۷۷، قیمت ۲۰۰ روپے

مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب ''یادگار غالب'' کو غالب شناسی کا نقطۂ آغاز متصور کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ تفہیم غالب اور غالب شناسی کو عام کرنے، پھیلانے اور اس طرف تحریک و ترغیب اور توجہ دلانے میں اس کتاب کا اہم اور بنیادی کردار ہے۔ غالب پر یہ پہلی باقاعدہ اور مبسوط کتاب ہے جس میں غالب کی سوانح و شخصیت کے علاوہ، ان کے کلام نظم و نثر، اردو و فارسی کا جائزہ اور انتخاب شامل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۷ء میں، ۱۷ اسطری مسطر پر، محمد رحمت اللہ رعد کے نامی پریس، کانپور سے شائع ہوئی۔

ادارہ یادگار غالب کی طرف سے ''یادگار غالب'' کی پہلی اشاعت (۱۸۹۷ء) کے پورے سو برس بعد، ۱۹۹۷ء میں غالب کے دوصد سالہ جشن ولادت کی مناسبت سے، اس پہلے ایڈیشن کی عکسی بازیافت سامنے آئی ہے۔ جس کے جملہ مصارف، ایک علم پرور خاتون شکیلہ رحمٰن نے ادا کیے ہیں۔ سرورق، کوائف، اظہار تشکر اور حالی کی تصویر کے بعد ''یادگار غالب'' طبع اول کا سرورق، غالب کی تصویر، فہرست مضامین، دیباچہ اور پھر متن کا آغاز ہوتا ہے۔ طبع اول کے عین مطابق اس عکسی اشاعت کا متن بھی ۴۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ پس جلد ادارے کی طرف سے اس تازہ عکسی بازیافت کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔

''یادگار غالب'' حالی کی زندگی میں صرف دو بار شائع ہوئی۔ دوسری بار، مطبع فیض عام، علی گڑھ سے چھپی، جس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ ادارہ یادگار غالب (کراچی) سے پہلے ۱۹۸۶ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی طرف سے بھی، اس کے پہلے ایڈیشن کی عکسی بازیافت سامنے آ چکی ہے۔ جس میں سیکرٹری ادارہ، محمد شفیع قریشی کا دو صفحے کا ''پیش لفظ'' ہے۔ مذکورہ صدر ہر دو اداروں سے شائع شدہ ''یادگار غالب'' کے پہلے ایڈیشن کی عکسی اشاعتیں، کسی غالب شناس یا حالی شناس کے مقدمے سے محروم رہی ہیں۔ طبع اول کے آخر میں حالی نے اشاعت کے بعد دو صفحات (۴۳۹۔۴۴۰) کا غلط نامہ بھی شامل اور شائع کیا تھا۔ مذکورہ دونوں عکسی اشاعتوں میں غلط نامہ کے عکس بھی دکھائی نہیں دیتے۔ ادارہ یادگار غالب (کراچی) نے اپنی اشاعت کے مختصر تعارف میں بتایا ہے کہ ''زیر نظر عکسی طباعت میں غلط نامہ کے مطابق غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے'' لیکن کتابت یا طباعت کی غلطیاں ان دونوں اشاعتوں میں جوں کی توں اور یکساں ہیں۔

''یادگار غالب'' اب تک شائع ہونے والے اہم ایڈیشنوں میں اور طبع اول کے متن اور مباحث میں کوئی بڑی ترمیم یا اضافہ دکھائی نہیں دیتا۔ ۱۹۷۱ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے مالک رام کی تصحیح و ترتیب اور مقدمے کے ساتھ ''یادگار غالب'' دو حصوں (جلدوں) میں شائع ہوئی۔ حالی کی یادگار غالب کے بعض واقعات یا مباحث سے محققین اختلافات کرتے رہے ہیں۔ مثلاً اس میں درج بعض اشعار دیوان غالب کے مطابق نہیں ہیں۔ یا اس کے علاوہ قیام کلکتہ و لکھنو کے سلسلے میں مولانا مہر کا

اختلاف، ''ابر گہر بار'' کے بارے میں شیخ محمد اکرام کا اختلاف، بہادر شاہ ظفر کے شیعہ ہونے کے بارے میں مسعود حسن رضوی ادیب کی وضاحت اور حالی سے اختلاف یا غالب کی استعداد عربی اور لغت سے، قاضی عبدالودود کا اختلاف وغیرہ۔ مالک رام نے اس نوع کے تحقیقی مباحث کو مقدمے کا حصہ بنایا ہے نہ کہیں حاشیے میں جگہ دی ہے۔ یہ وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ انہوں نے حالی کی زندگی کی دونوں اشاعتوں میں سے کسے بنیاد بنایا ہے۔ ''یادگار غالب'' کا دوسرا ایڈیشن چونکہ مصنف کی زندگی کا آخری ہے اس لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔

ادارہ یادگار غالب کی طرف سے یہ تازہ عکسی بازیافت ایک خوش آئند اور مبارک عمل ہے۔ اس کے ذریعے سے یہ ایڈیشن پاکستان میں بھی عام رسائی میں آ گیا ہے، اور ''یادگار غالب'' کی تدوین و تحقیق کا ایک مرحلہ طے ہو گیا ہے۔ اس کی تدوین اور تصحیح و ترتیب، اب کسی باہمت مگر صاحب نظر کی توجہ کی منتظر ہے۔

﴿۲﴾

غالب کے فکر و فن کے علاوہ ان کی شخصیت کا معاملہ بھی ممتاز غالب شناس حلقے کی ترجیحات میں سے رہا ہے اور انہوں نے تحقیقی اور تنقیدی ہر دو لحاظ سے غالب کی شخصیت اور کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

پروفیسر لطیف اللہ کی کتاب ''غالب: شخصیت و کردار'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں تنقیدی تناظر میں غالب کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مشمولات کے اعتبار سے شروع میں ''تمہید'' اور آخر میں ''کتابیات'' کے علاوہ یہ کتاب بالترتیب، نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے: (۱) تعلیم و تربیت، (۲) صلاحیت کا صحیح استعمال، (۳) انفرادیت کا احساس، (۴) تقلید محض سے اجتناب، (۵) خذ ما صفا ودع ما کدر کا اصول، (۶) احباب اور قرابت داروں سے سلوک، (۷) انسانی نقطۂ نظر سے مسائل حیات کا مشاہدہ، (۸) غالب اور ظرافت اور (۹) بازگشت۔

غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا یہ مطالعہ ۱۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہاں زیادہ تر مصنف نے غالب کو ان کے اردو و فارسی اشعار کے تناظر میں دیکھا ہے۔ خطوط کے حوالے اور دیگر ناقدین کی آرا سے بھی کام لیا گیا ہے۔

غالب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، پروفیسر لطیف اللہ کو بھی اس بات کا کامل احساس ہے۔ اس لیے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ''ہم نے مطالعے کے لیے غالب کی شخصیت کے معدودے چند پہلو منتخب کر لیے ہیں اور انہی کو پیش بھی کرتے ہیں''۔ (ص: ۱۴) غالب کے اس محدود شخصی مطالعے میں تحقیقی اور معروضی انداز کی معلومات تلاش نہیں کرنا چاہئیں۔ یہاں مصنف نے اپنے دائرہ کار اور بساط کے مطابق غالب کی شخصیت اور کردار کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

یہاں دو ایک موقعوں پر پروفیسر لطیف اللہ کے انداز نظر اور غالب کی شخصیت شناسی کے طریقۂ کار میں یکسانی برقرار نہیں رہ سکی۔ کسی شاعر کی شخصیت و کردار کا مطالعہ دو انداز سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کی حقیقی اور عملی زندگی کے پیش نظر یا پھر اس کی شاعری اور شعری کائنات کے حوالے سے۔ شاعری میں شاعر کی شخصیت کو تلاش کرنے کا عمل احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ پروفیسر لطیف اللہ نے زیادہ تر غالب کو ان کی شاعری ہی کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن ایک جگہ وہ غالب کے شخصی تضاد پر بات کرتے ہوئے، غالب کی قصیدہ نگاری کو فارسی اور اردو قصیدے کی روایت کا حصہ قرار دے کر، انہیں شخصی تضاد سے ماورا سمجھتے ہیں:

''اس اعتبار سے ان کے (غالب) قول و عمل میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا'' (ص:۵۰) یعنی شاعری کو شاعری قرار دیتے ہیں حقیقت نہیں۔ آگے چل کر ایک دوسرے موقع پر غالب کی جرأت رندانہ (جو غالب کی عملی زندگی میں بھی کمال پائی جاتی ہے) کے بارے میں لکھتے ہیں: ''وہ (غالب) انتہائی جرأت کے ساتھ اپنی خامیوں کا اعتراف کرتے ہیں''۔ (ص:۹۴) اس جملے کے بعد غالب کے رندانہ انداز کے فارسی اور اردو اشعار کو بطور مثال اور دلیل نقل کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں آ کر شاعری حقیقت کیوں بن جاتی ہے؟ امر واقعہ یہ ہے کہ شاعری شخصیت میں تضاد پیدا کرتی ہے نہ رفع ہی کرتی ہے۔ خود غالب بڑی پختہ شخصیت کے مالک تھے۔ وہ عملی طور پر کسی سے کچھ مانگیں یا شاعری میں، ان کی انا کہیں مجروح نہیں ہوتی بلکہ اسی شان اور تمکنت سے برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں یا نہ کریں وہ اندر سے پختہ اور کامل ہیں۔ مانگنا اور گناہ کرنا (یا محض اعتراف کرتے رہنا) تو پردے ہیں جو غالب نے اپنے گرد پھیلا اور گرا رکھے ہیں اور خود ان میں چھپے بیٹھے ہیں اور حقیقت میں وہ غالب کچھ اور ہیں جنہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر لطیف اللہ کا بنیادی موضوع تصوف ہے، امید کی جا سکتی ہے کہ وہ غالب پر اس حوالے سے بھی قلم اٹھائیں گے۔

زیر نظر کتاب میں پروفیسر لطیف اللہ نے غالب کے بیشتر اشعار حافظے کی بنا پر نقل کیے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مندرج ''کتابیات'' میں ''دیوان غالب نسخۂ عرشی'' کا پہلا ایڈیشن (۱۹۵۸ء) شامل ہے۔ ذیل میں ''نسخۂ عرشی'' کے ایڈیشن کے متن سے مختلف کچھ مصرعے ملاحظہ کیجیے۔ مصرعے کی پہلی صورت زیر نظر کتاب میں درج ہے اور دوسری صورت ''نسخۂ عرشی'' میں:

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب (ص:۸)
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب (ص:۲۳۴)
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں (ص:۸)
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں (ص:۱۹۲)
سو پشت سے ہے شیوۂ آبا سپہ گری (ص:۵۰)
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری (ص:۱۲۴)
ہے کیا ضرور سب کو ملے ایک سا جواب (ص:۶۷)
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب (ص:۲۴۴)
طرز بیدل میں ریختہ لکھنا (ص:۷۲)
طرز بیدل میں ریختہ کہنا (ص:۳۰۵)

مجموعی طور پر ''غالب: شخصیت و کردار'' اچھی اور ایسی کاوش ہے، جو مطالعۂ غالب میں کسی بڑے اضافے کا باعث ہو یا نہ، لیکن اس کے لکھنے والے کی محنت، خلوص نیت اور غالب سے عقیدت کے بارے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔

۳

بال کی کھال اتارنے والے، باریک بین اور کہنا مشق محقق ڈاکٹر گیان چند کی تحقیقی کاوشیں، اردو تحقیق کا بیش قیمت

سرمایہ اور نمونہ ہیں۔ غالب سے ان کی دلچسپی زیادہ پرانی ہے نہ غالب ان کی ترجیحات میں سے رہے ہیں۔ اس کے باوجود غالب سے متعلق ان کی کتابیں ''تفسیر غالب'' اور ''رموز غالب'' غالب پیمائی کی قابل لحاظ کاوشوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

غالب اور غالبیات سے متعلق ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''رموز غالب'' پہلی بار ۱۹۷۶ء میں ہندوستان سے شائع ہوا تھا۔ اب اس کتاب کا پہلا پاکستانی ایڈیشن، اضافوں کے ساتھ، ادارہ یادگار غالب (کراچی) سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا ہے۔ فہرست مضامین کے بعد، کتاب کے شروع میں، ڈاکٹر گیان چند کا ''پیش لفظ'' ہے جو زیر نظر پاکستانی ایڈیشن کے لیے ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو لکھا گیا۔ اس کے بعد دوسرا ''پیش لفظ'' ہے جو پہلے ہندوستانی ایڈیشن کے لیے ۲۳۔ اگست ۱۹۷۲ء کو لکھا گیا تھا۔

مشمولات کے لحاظ سے اس کتاب میں کل سترہ (۱۷) تحریریں شامل ہیں، جنہیں چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ (الف) غالب اور غالبیات سے متعلق درج ذیل گیارہ (۱۱) تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے:۔

(۱) غالب کی زبان، ابتدائی کلام کی روشنی میں،
(۲) غالب کا خودنوشت دیوان
(۳) خودنوشت مخطوطۂ دیوان غالب اور اس کی اصلاحیں
(۴) نسخۂ عرشی زادہ، ایک جائزہ
(۵) دیوان غالب کا متنازع مخطوطہ
(۶) دیوان غالب کے متنازع مخطوطے پر مزید مشاہدات
(۷) ''بیاض غالب، تحقیقی جائزہ'' کا تحقیقی جائزہ
(۸) نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے
(۹) نسخۂ عرشی، طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات
(۱۰) نسخۂ عرشی کچھ اشعار کی قرأتیں
(۱۱) مالک رام: بحیثیت ماہر غالبیات

دوسرے حصے (ب) میں تین تنقیدی تحریریں شامل ہیں:

(۱۲) غالب کا صحیفہ منسوخ
(۱۳) غالب کے نقاد
(۱۴) غالب کے طرفدار نہیں۔

اسی طرح تیسرے حصے (ج) میں غالب سے متعلق چار کتب پر تبصرے ہیں:

(۱۵) کالی داس گپتا رضا کی تین کتابیں: ''دیوان غالب کامل''، ''غالب درون خانہ''، ''غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں''
(۱۶) ''مآثر غالب'' مؤلفہ قاضی عبدالودود کی نئی تدوین از حنیف نقوی

چوتھا اور آخری حصہ (د) صرف ''غالب کے منسوخ کلام میں سے سو منتخب اشعار'' پر مشتمل ہے، جو نسخۂ عرشی کے جزو ''گنجینۂ معنی'' سے لیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند کے بقول: ''اس مجموعے کے جملہ مضامین ۱۹۶۸ء یا اس سے بعد کے ہیں'' (ص:۳) یہاں کچھ مضامین پر اشاعت کی تواریخ درج ہیں ان میں سے پہلے مضمون ''غالب کی زبان، ابتدائی کلام کی روشنی میں''، پر جنوری ۱۹۶۶ء کی پہلی اشاعت کا حوالہ درج ہے۔ باقی مضامین پر بھی اگر تواریخ درج ہوسکتیں تو ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ غالب سے متعلق اپنے کچھ ''بدرنگ'' مضامین کو ڈاکٹر گیان چند نے شامل اشاعت نہیں کیا۔ اس طرح ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ''رموز غالب'' میں ان کے تئیں اچھے مضامین شامل ہوئے لیکن ان کے متروک اور ''بدرنگ'' مضامین کی فہرست بھی مفید ہوتی اور بعض کے نزدیک شاید وہی، یا وہ بھی ''خوش رنگ'' قرار پاتی۔ نظری قرار دیے جانے والے مضامین خود گیان چند کے تحقیقی مزاج و معیار اور ارتقاء کے بارے میں معلومات کا باعث بنتے۔ یہ طرز نہ اپنا کر ڈاکٹر گیان چند اپنے افتادِ مزاج کے لحاظ سے، غالب سے

زیادہ متاثر نہ ہونے کے باوجود انہیں کے معتقد اور مقلد نظر آتے ہیں۔

﴿۴﴾

مولانا حسرت موہانی کا ایک اہم اور قابل قدر کام ان کی تذکرہ نگاری ہے۔ انہوں نے متعدد معروف اور کم معروف اور بعض گم نام شعرا کے تراجم (تذکرے) لکھ کر اردو شعر و ادب کی تاریخ کو باثمر اور بارآور کیا۔ ان کے یہ تراجم (تذکرے) ان کی ادارت میں نکلنے والے رسائل، ماہنامہ، ''اردوئے معلیٰ''[۵] اور سہ ماہی ''تذکرۃ الشعرا''[۶] میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہ تراجم اور کچھ دیگر ان کی بعض کتب ''ارباب سخن''[۷] مختلف شعرا کے الگ الگ دواوین کے انتخابات[۸] اور پھر ''انتخاب سخن'' (گیارہ جلدیں) کا حصہ بھی بنے ہیں۔ حسرت کے ان منتشر تراجم کا ایک انتخاب ۱۹۷۲ء میں، انڈیا سے، ڈاکٹر احمر لاری بھی مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔

اس پس منظر میں دیکھیں تو حسرت کے تمام مطبوعہ تراجم تا حال کتابی صورت میں یک جا نہیں ہو سکے تھے۔ جناب شفقت رضوی نے ایک مبارک عمل اور لائق صد تحسین کام یہ کیا ہے کہ حسرت کے ان منتشر تراجم کو ''تذکرۃ الشعرا'' کے نام سے مرتب اور شائع کر دیا ہے۔ ان کی زیر نظر کتاب میں فہرست کے مطابق حسرت کے لکھے ہوئے ۱۲۰ شعرا کے تراجم (تذکرے) شامل ہیں۔ جن کو مرتب نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے ''سلسلۂ شاہ حاتم اور شاگردان شاہ حاتم'' کے تحت اکہتر (۷۱) شعرا کا تذکرہ آیا ہے۔ حسرت کے تذکرہ نگاری کے خاص طریقۂ کار کے مطابق ان کے آٹھ طبقے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے طبقہ پنجم، ''شاگردان غفلت'' کے تحت آٹھ شعرا فہرست میں شامل ہیں۔ حسرت نے ان کے الگ الگ تذکرے نہیں لکھے تھے صرف غفلت ہی کے تذکرے میں ان کے ان آٹھ شاگردوں کے نام بھی مختصر ترین حالات کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ حصہ کتاب کے صفحہ ۴۰۴ تک پھیلا ہوا ہے۔

کتاب کے ''حصہ دوم'' میں چار سلاسل (مرزا مظہر جانجاناں، میر سوز، مصحفی اور غالب) کے تحت ستائیس (۲۷) شعرا کا تذکرہ ہے۔ یہاں بھی ''سلسلۂ میر سوز دہلوی'' میں نو (۹) شعرا کا الگ الگ تذکرہ نہیں بلکہ سوز ہی کے تذکرے میں ان کے نو شاگردوں کا ذکر آ گیا ہے۔ یہ دوسرا حصہ کتاب کے صفحہ ۵۴۱ تک ہے۔ تیسرے اور آخری حصے میں بائیس (۲۲) ''ایسے شعرا ہیں جن کے سلسلے کے دیگر تراجم موجود نہیں۔ اس حصے کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے''۔ اس طرح زیر نظر ''تذکرۃ الشعرا'' میں شامل تمام تراجم کتاب کے صفحہ ۶۵۶ پر ختم ہوتے ہیں۔

شروع میں مرتب کا ''کہنے کی باتیں'' کے عنوان سے پانچ صفحات پر مشتمل مقدمہ بھی ہے جس میں انہوں نے صرف ''کہنے'' کی باتیں ہی کہی ہیں پھر ''تذکرۃ الشعرا کے منصوبے'' کے عنوان کے تحت حسرت موہانی کے چار مضامین شامل ہیں جن سے ان کے تذکرہ لکھنے کے منصوبے اور طریقۂ کار کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے بعد تراجم ہیں جن کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ سب سے آخر میں صفحہ ۶۵۷ سے ۶۸۶ تک ''اشاریہ'' ہے جس میں رجال، کتب و رسائل، مقامات اور ادارے شامل ہیں۔

شفقت رضوی کے مرتبہ ''تذکرۃ الشعرا'' کے مشمولات کے تعارف کے بعد، چند گزارشات اور مشاہدات:۔

❁ زیر نظر ''تذکرۃ الشعرا'' کو اب صرف ''تذکرہ'' لکھا جائے گا۔

❁ فاضل مرتب اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''تذکرۃ الشعرا کے لیے لکھے گئے تراجم (سوائے دو ایک کے) سب کے سب 'اردوئے معلیٰ' میں چھپے''۔ (ص:۱۱)

شفقت رضوی صاحب کی یہ بات محل نظر ہے۔ حسرت کے تراجم (تذکرے) بیشتر ''اردوئے معلیٰ'' میں اور ''دو ایک'' سے کہیں زیادہ سہ ماہی ''تذکرۃ الشعرا'' اور ''ارباب سخن'' وغیرہ میں شائع ہوئے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو صرف شعرا کے دواوین کے انتخابات کے ساتھ پہلی بار سامنے آئے۔ ''تذکرہ'' میں بیس (۲۰) تراجم ایسے ہیں جو ''اردوئے معلیٰ'' کے علاوہ چھپے اور اس کا ماخذ بنے۔ ان میں سے دس (۱۰) سہ ماہی ''تذکرۃ الشعراء'' سے لیے گئے ہیں اور باقی دس حسرت کے مرتب کردہ شعرا کے دواوین کے مقدمے اور محمڈن اورینٹیل میگزین علی گڑھ سے لیے ہیں۔

❁ شفقت رضوی صاحب ایک دوسری جگہ مقدمے میں فرماتے ہیں کہ:

''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زیر نظر کتاب میں مولانا حسرت موہانی کے تحریر کردہ تمام کے تمام تراجم شامل ہیں''۔ (ص:۱۴)

تحقیق میں کوئی بات حرف آخر اور فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' کے شمارہ:۲، جلد:۱۲، فروری ۱۹۱۱ء میں بھی ''سلسلہ شاہ حاتم کا ایک مکمل شجرہ مع مجمل حالات شعرا'' شائع کیا تھا۔ مذکورہ شمارے میں صفحہ پانچ سے ان شعرا کا مجمل تعارف حسب ذیل گراف کی صورت میں درج ہے:

''تخلص، نام مع مختصر حال، فہرست تصانیف، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ، معلوم یا نامعلوم، کیفیت (نسخہ)''

پھر ان عنوانات کے نیچے شعرا کے حالات درج ہیں۔ اسی صفحے پر حاشیے میں حسرت لکھتے ہیں:

''جن شاعروں کے تخلص پر نشان (ـــــ) لگا ہے ان کا حال درج اردوئے معلیٰ ہو چکا ہے'' (اردوئے معلیٰ، فروری ۱۹۱۱ء، ص:۵)

حسرت کی دی ہوئی فہرست میں تخلص پر لگے ہوئے نشان (ـــــ) والے شعرا کا موازنہ شفقت رضوی کے مرتبہ ''تذکرہ'' سے کریں تو سلسلۂ شاہ حاتم، سودا اور شاہ نصیر میں سے درج ذیل سات شعرا کے تراجم زیر نظر ''تذکرہ'' میں نظر نہیں آتے:

مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ
مکند لال فارغ دہلوی ساکن بریلی
مرزا پھجو اکبر دہلوی
مرزا عظیم بیگ عظیم دہلوی
میر غلام علی عشرت بریلوی
خدا بخش خاں تنویر دہلوی
حافظ قطب الدین مشیر دہلوی

گمان غالب ہے کہ کم از کم ''اردوئے معلیٰ'' کا یہ شمارہ (فروری ۱۹۱۱ء) مرتب ''تذکرہ'' کے سامنے نہیں رہا۔ اس کے کئی شواہد ہیں۔ ایک یہ کہ ''تذکرہ'' میں حسرت کے تذکرہ لکھنے کے منصوبے کے تحت شمارہ مذکورہ میں موجود حسرت کا بنایا ہوا، منصوبہ، طریقہ کار اور شجرۂ شعرا شامل نہیں کیا جا سکا۔ اس کے برعکس بہت پہلے کے ۱۹۰۳ء کے ایک شمارے سے حسرت کے طریقۂ

کاروائی تحریر شامل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''تذکرہ'' میں شامل نوحؔ ناروی کے تذکرے کا متن، اس شمارے میں موجود نوحؔ کے تذکرے کے مطابق نہیں (اس کی وضاحت آگے آئے گی) تیسری بات یہ ہے کہ مذکورہ صدر شعرا کے تذکرے جن کے بارے حسرتؔ نے لکھا کہ اردوئے معلیٰ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اگر مرتب کے سامنے یہ شمارہ ہوتا تو وہ ان شعرا کے تراجم تک ضرور رسائی حاصل کرتے۹۔

❁ شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور سے ڈاکٹر احمر لاری نے ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر محمود الٰہی کی نگرانی میں ''حسرت موہانی پر پی ایچ۔ ڈی کی سطح کا کام کیا۔ ان کا یہ مقالہ ''حسرت موہانی: حیات اور کارنامے'' کے عنوان سے پاکستان میں پہلی مرتبہ مغربی اردو اکیڈمی (لاہور) نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا ہے۔ اس مقالے کے صفحہ ۴۶۸ پر ضمیمہ (الف) کے تحت ''ان شعرا کی فہرست جن کا تذکرہ حسرت نے لکھا'' درج ہے۔ اس فہرست کو دیکھیں تو اردوئے معلیٰ میں شامل مندرجہ ذیل تین شعرا کے تراجم ''تذکرہ'' میں شامل نہیں ہیں۔

سید محمد خاں رندؔ، نومبر ۱۹۰۴ء

بیباکؔ شاہ جہانپوری، اکتوبر ۱۹۱۲ء

قاضی محمد حسین رضیؔ، دسمبر ۱۹۱۲ء

ان کے علاوہ ڈاکٹر احمر لاری ہی کے مقالے کی مدد سے، سہ ماہی ''تذکرۃ الشعرا'' (حصہ اول، جزو پنجم، دسمبر ۱۹۱۵ء) میں چھپنے والا سجاد حسین کا تذکرہ بھی یہاں شامل نہیں ہو سکا۔

❁ ''تذکرہ'' میں شامل تراجم میں سے بیشتر کے حوالے نامکمل اور کچھ غلط بھی ہیں جو ڈاکٹر احمر لاری کے مذکورہ بالا ضمیمے کی فہرست کی مدد سے مکمل اور درست کیے جا سکتے ہیں۱۱۔ یہاں کسی بھی ثانوی ماخذ کو بنیاد بنائے بغیر صرف ایک حوالے کی تصحیح کی جاتی ہے۔

شفقت رضوی صاحب نے حبیب کنتوری کے ترجمے کا حوالہ یوں درج کیا ہے:

''اردوئے معلیٰ، اپریل ۱۹۰۸ء، ص: ۱ تا ۱۰'' (ص: ۵۷۴)

جبکہ میرے پیش نظر اردوئے معلیٰ میں شامل اس ترجمے کا درست اور مکمل حوالہ یہ ہے:

''حبیب کنتوری، اردوئے معلیٰ علی گڑھ، جلد: ۱۰، شمارہ: ۱، جنوری ۱۹۰۸ء، ص: ۱ تا ۸

❁ ''اردوئے معلیٰ'' فروری ۱۹۱۱ء کے شمارے میں، حسرت کا نوشتہ، اپنے ہم عصر نوحؔ ناروی کا تذکرہ میرے پیش نظر ہے، جس کے مطابق ذیل میں ''تذکرہ'' کے چند مقامات کی تصحیح کی جاتی ہے:

☆ ''تذکرہ'' میں نوحؔ ناروی کا سن ولادت حاشیے میں بھی درج نہیں جبکہ ''اردوئے معلیٰ'' میں ۱۸۷۹ء درج ہے۔ (ص: ۹)

☆ نوحؔ کے والد مولوی عبدالمجید نہ کہ عبدالحمید (''تذکرہ'' میں یہ نام دو بار عبدالحمید ہی درج ہوا ہے)

☆ حسرت نے نوحؔ کے دو اساتذہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی ''پہلے حضرت امیرؔ و جلالؔ سے خط و کتابت رہی''۔ حاشیے میں حسرت نے اس بات کا مآخذ نوحؔ کے ایک خط کو قرار دیا ہے۔

''از نامہ جناب نوحؔ بنام حضرت احسن مارہروی'' (ایضاً)

☆ نوحؔ کے ایک مصرعے ''میں عمر بھر کے رنج و الم سے نبٹ گیا'' میں سے ''نبٹ گیا'' پر نمبر دے کر حاشیے میں حسرت نے

لکھا ہے:

''یہ محاورہ غلط ہے (حسرت)'' (ص:۱۰)

تذکرہ میں مذکورہ دونوں حاشیے درج نہیں ہیں۔

☆ ''تذکرہ'' میں نوحؔ کا نمونۂ کلام درج کرنے سے پہلے، ''یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے'' کے فوراً بعد پورا ایک جملہ، ''کیونکہ ہر کسی..... کلام ملاحظہ ہو'' حذف ہے۔

❁ ''اردوئے معلیٰ'' کے مئی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں شوق رام پوری کے چار شاگردوں کے تراجم درج ہیں۔ ''تذکرہ'' میں ان چاروں کے سن ولادت اور وفات درج نہیں ''انتخاب یادگار''، از امیر مینائی کے حوالے سے حواشی میں صرف تواریخ وفیات درج ہیں) جبکہ ''اردوئے معلیٰ'' کے مذکورہ شمارے میں، ان میں سے تین کی تواریخ ولادت ووفات یوں درج ہیں:۔

کرم رام پوری (از ۱۱۹۲ھ تا ۱۲۵۳ھ) ص:۴

غفلت رام پوری (از ۱۱۹۵ھ تا ۱۲۹۵ھ) ص:۵

صنعت رام پوری (از ۱۱۹۰ھ تا ۱۲۶۵ھ) ص:۹

''تذکرہ'' میں اس نوع کے محولہ بالا مقامات سے صرف نظر ہونے پر گمان ہوتا ہے کہ متعدد اصل ماخذ مرتب کے سامنے نہیں رہے، جبکہ انہوں نے ''اردوئے معلیٰ'' ہی کے مذکورہ شماروں کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

❁ ''اردوئے معلیٰ'' ۱۹۴۲ء تک دیر سویر شائع ہوتا رہا۔ زیر نظر ''تذکرہ'' میں ۱۹۳۶ء کے بعد کا کوئی ترجمہ شامل نہیں۔ شاید اس کے بعد حسرت نے کوئی ترجمہ نہ لکھا اور شائع کیا ہو۔ یہ وضاحت مقدمے میں ضرور ہونی چاہیے تھی۔

❁ ''تذکرہ'' میں صفحہ ۵۹۔۱۵۸ پر شامل حسن لکھنوی (شاگرد ناصر) کے ترجمے کا حوالہ مفقود ہے۔

شفقت رضوی صاحب ہمارے عہد کے قابل احترام بزرگ ناقدین میں سے ہیں اور حسرت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ میں نے بہ ادب یہاں چند تسامحات یا صرف نظر مقامات کی طرف اشارے کرنے کی جسارت کی ہے اگر وہ ان کی تصحیح یا تصدیق فرما لیں تو مجھے خوشی ہوگی اور دل بڑھے گا۔ اب یہاں کتابت (پروف) کی چند قابلِ ذکر غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو ''تذکرہ'' میں باقی رہ گئی ہیں:

☆ صفحہ ۵، فہرست میں محمد یار خاں افسر رام پوری بجائے امیر رام پوری

☆ صفحہ ۶، فہرست میں مذاق دہلوی بجائے مذاق بدایونی

☆ صفحہ ۱۱۵، نوائے بدایونی بجائے نوا بدایونی (فہرست میں درست ہے)

☆ صفحہ ۲۷۹، حیات بخشی رسا بجائے حیات بخش رسا (فہرست میں درست ہے)

☆ صفحہ ۵۸۳، پرسحر لکھنوی کی تاریخ وفات ۱۸۸۵ء بجائے ۱۸۵۸ء

(آخر الذکر، بحوالہ: اردوئے معلیٰ، جلد:۹، شمارہ:۹، ستمبر ۱۹۰۷ء، ص:۱)

شفقت رضوی صاحب کی یہ کاوش اردو ادب کی تاریخ میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اس سے تحقیق کے کئی در وا ہوں گے۔ حسرت کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لینے والے محقق اور نقاد کے لیے یہ کاوش، کتاب رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ بیشتر تراجم کو جمع کر دینا اور وقت نظر سے انہیں ترتیب دے کر مفید حواشی کا اضافہ بڑا قابل تحسین ہے۔ ''اردوئے معلیٰ'' کے بیشتر شمارے شفقت رضوی

صاحب کی دسترس میں ہیں یا پھر مکمل فائل دیکھنے کا دعویٰ ڈاکٹر احمر لاری کو ہے۔ کیا ہی اچھا ہوا گر کسی صورت ''اردوئے معلیٰ'' کا اشاریہ مرتب کرالیا جائے۔ ''اردوئے معلیٰ'' میں حسرت نے دوسرے احباب سے بھی تذکرے لکھوائے تھے انہیں بھی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

۵

اردو تحقیق و تدوین میں قاضی عبدالودود کا نام اور کام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ''مآثر غالب'' ان کی تحقیقی کاوشوں کی ایک منفرد مثال ہے۔ جس میں غالب کی کچھ کمیاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں کو جمع و مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۹ء) کا حصہ بنی۔ کتابی صورت میں اس کا پہلا ایڈیشن، انجمن ترقی اردو، بہار (بھارت) کی طرف سے ۱۹۴۹ء ہی میں شائع ہوا۔ قاضی عبدالودود کے بعد ''ماثر غالب'' پر ڈاکٹر حنیف نقوی نے کچھ مزید کام کیا اور ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ کی طرف سے ۱۹۹۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کی نظر ثانی اور جدید اصول ترتیب و تدوین کے مطابق، تصحیح و اضافہ کے ساتھ ''مآثر غالب'' کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے جو پاکستان میں پہلی بار ادارہ یادگار غالب (کراچی) کی طرف سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔

''ماثر غالب'' کے زیر نظر ایڈیشن کی اہم خصوصیت اور انفرادیت جو اسے پہلی دونوں اشاعتوں سے ممتاز بناتی ہے وہ یہ کہ اس میں موجود غالب کے فارسی خطوط کے اردو تراجم بھی شامل ہیں۔ یہ تراجم جناب پرتو روھیلہ کی کاوش علمی کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے اپنے اردو تراجم پر مفید حواشی بھی لکھے ہیں اور فرہنگ بھی تیار کی ہے۔

مشمولات کے اعتبار سے ''ماثر غالب'' کا زیر نظر ایڈیشن کئی اجزا پر مشتمل ہے۔ شروع میں ادارے کی طرف سے ''ابتدائیہ'' ہے جس میں ڈاکٹر حنیف نقوی اور ''ماثر غالب'' کی اس تازہ اشاعت کا مختصر تعارف ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر حنیف نقوی کا ''پیش گفتار'' ہے جو صفحہ ۱۳ سے ۲۴ تک ہے۔ اس میں انہوں نے ''ماثر غالب'' (۱۹۴۹ء) کے مندرجات کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ اور آخر میں ۱۲ شقوں کے تحت اپنی اس تدوینی کاوش کی جزئیات بیان کی ہیں۔ صفحہ ۲۵ پر انتساب ہے جو قاضی عبدالودود نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام کیا ہے۔ صفحہ ۲۶ پر قاضی صاحب کا ''عرض حال'' ہے۔

صفحہ ۲۷ سے غالب کی متفرقات نظم و نثر اردو و فارسی شروع ہوتی ہیں جنہیں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ''حصہ اول'' کے تحت چار اجزا ہیں۔ ''اردو نثر'' کے تحت پانچ تحریریں، ''اردو نظم'' کے تحت چار، ''فارسی نثر'' تین اور ''فارسی نظم'' کے تحت چار تحریریں شامل ہیں۔ ''حصہ دوم'' میں غالب کے بتیس (۳۲) فارسی خطوط ہیں جو انہوں نے قیام کلکتہ کے دوران مختلف احباب کو لکھے۔ غالب کی مذکورہ تمام مختلف اور متفرق تحریروں کا سلسلہ صفحہ ۶۹ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۷۱ سے ۱۲۵ تک ''حواشی 'ماثر غالب' از قاضی عبدالودود'' ہیں۔ یہاں شروع میں قاضی صاحب نے اپنے حواشی میں استعمال ہونے والے حوالوں کے مخففات (رموز) کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ پھر غالب کی مندرج تحریروں کی ترتیب کے مطابق حصہ اول و دوم اور ان کے مختلف اجزا کے تحت نہایت وضاحت سے حواشی تحریر کیے ہیں۔ جو اصلاً تعلیقات کی ذیل میں آتے ہیں۔ حواشی کے بعد صفحہ ۱۳۳ تک قاضی صاحب کا دو صفحات پر مشتمل ''التماس'' اور کچھ نوادر کے عکس دیے گئے ہیں۔ صفحہ ۱۳۵ سے ۱۴۷ تک ''حواشی ماثر غالب، از ڈاکٹر حنیف

نقوی'' ہیں۔ یہ وہ حواشی ہیں جو نقوی صاحب کے خیال میں، غالب کی تحریروں پر ہونے چاہییں اور قاضی صاحب نہیں بڑھا سکے۔ یہاں حواشی سے زیادہ اصل مآخذ کے پیش نظر اختلاف نسخ درج ہیں۔ وہ بھی صرف غالب کی ان تحریروں کے جو کسی نہ کسی صورت ''مآثر غالب'' (۱۹۴۹ء) سے پہلے طبع ہو چکی تھیں۔ غالب کے فارسی خطوط جو قاضی صاحب نے ''مآثر'' میں پہلی بار شائع کیے تھے، ان کی اصل (یا قاضی صاحب کے نقل کردہ) سامنے نہ ہونے کی وجہ سے، نقوی صاحب نے ثانوی مآخذ میں قیاسی تصحیح سے کام لیا ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے ''پیش گفتار'' میں کیا ہے۔ صفحہ ۱۴۸ پر نقوی صاحب کا ''استدراک'' ہے جس میں انہوں نے ''ماثر غالب'' طبع اول (۱۹۴۹ء) میں غالب کے ایک خط کے غلط انتساب کی تصحیح ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۱۴۹ سے ۲۱۶ تک نقوی صاحب کے ''حواشی بر حواشی قاضی عبدالودود'' ہیں، جسے ڈاکٹر حنیف نقوی کا اصل کارنامہ خیال کرنا چاہیے۔ یہاں صرف قاضی صاحب کے حواشی پر حواشی ہی نہیں بلکہ انہوں نے اضافے اور توضیحات بھی پیش کی ہیں۔ ان کی واقعی ضرورت بھی تھی کیونکہ قاضی صاحب نے یہ کام ''بڑی عجلت'' میں کیا اور انہیں احساس تھا کہ وہ ''بعض امور کی حسب دل خواہ تحقیق قلت وقت کی وجہ سے'' نہیں کر سکے ہیں۔ چھپنے کے بعد وہ ناشر سے بھی مطمئن نہ تھے اور نظر ثانی کے بعد اپنی نگرانی میں اسے چھپوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب نے کمال تحقیق و تلاش سے بعض اصل مآخذ تک رسائی حاصل کی اور بعض کے حصول میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ''ماثر غالب'' میں موجود غالب کے نو دریافت فارسی خطوط والی اصلی بیاض کی بھی انہیں بہت جستجو رہی۔ لیکن اگر نقوی صاحب، قاضی صاحب کے ''ماثر غالب'' کے پورے مسودے کو تلاش کر پاتے تو شاید انہیں اتنی زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔ کیونکہ انہوں نے بیشتر حواشی اور اختلاف نسخ کے اندراج سے تو اس وجہ سے بچ جانا تھا کہ کتابت و طباعت، قاضی صاحب کے مسودے کے مطابق درست نہ ہو سکی تھی اور پھر اس دوران میں خود قاضی صاحب نے بھی کچھ نظر ثانی کر لی ہوگی۔ بہر حال یہ تو ایک ایسا ضروری، علمی و تحقیقی کام تھا جسے مکمل ہونا چاہیے تھا۔ اچھا ہوا کہ یہ ڈاکٹر حنیف نقوی جیسے صاحب نظر محقق کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچا۔

''حواشی بر حواشی'' کے بعد صفحہ ۲۱۷ تا ۲۲۰، نقوی صاحب نے فہرست مآخذ بھی درج کی ہے۔ کتاب کے آخر میں صفحہ ۲۲۱ سے ۲۵۶ تک ''مآثر غالب'' میں موجود غالب کے بتیس (۳۲) فارسی خطوط کا اردو ترجمہ اور توضیحات و حواشی و فرہنگ شامل ہے۔

اب ''ماثر غالب'' کے اس نظر ثانی شدہ، پہلے پاکستانی ایڈیشن کے بارے میں چند گزارشات:

- ڈاکٹر حنیف نقوی کا ''پیش گفتار'' ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۷ء کا تحریر کردہ ہے، جو لگتا ہے کہ اس اشاعت ہی کے لیے لکھا ہے۔ وہ یہاں اپنے مرتب کردہ ۱۹۹۵ء والے اور اس تازہ ایڈیشن کا فرق اور ترمیم و اضافہ کی وضاحت کر دیتے تو اچھا ہوتا۔
- ۱۹۹۵ء والے ایڈیشن میں مختار الدین احمد کا ''پس گفتار۔۲'' شامل ہے، جس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> ''مختار صاحب 'ماثر غالب' کی ترتیب اول کے وقت سے قاضی صاحب کے شریک یا مشیر تھے۔ چونکہ وہ عینی شاہد تھے۔ اس لیے انہوں نے شان نزول کی جو تفصیلات دی ہیں، وہ باوثوق ہیں۔ اس تحریر کو ''پیش لفظ۔۱'' کے طور پر آنا چاہیے''۔[۱۳]

لیکن ''ماثر غالب'' کے زیر نظر ایڈیشن میں مختار صاحب کا ''پس گفتار۔۲'' یا ''پیش لفظ۔۱'' شامل نہیں ہو سکا، جس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

- نقوی صاحب نے ''استدراک'' کے تحت غالب کے تپاں کے نام خط نمبر ۷ (''جناب مرزا صاحب، والا مناقب، ستودہ شیم، مجمع لطف وکرم'') کو غلط انتساب قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اس خط کے مکتوب الیہ مرزا افضل بیگ ہیں۔ اس خط کا زمانہ تحریر بھی متعین کیا گیا ہے جو ان کے مطابق اکتوبر ۱۸۲۸ء ہے۔ لیکن زیر نظر ایڈیشن میں یہ خط نمبر ۷ تپاں ہی کے نام خطوط (ص: ۵۰) میں شامل ہے اور اس کی تاریخ تحریر بھی اصل فارسی خط (ص: ۵۱) اور پرتو روہیلہ کے اردو ترجمے (ص: ۲۲۸) دونوں جگہ اگست ۱۸۲۸ء ہی درج رہ گئی ہے۔ حالانکہ انہوں نے ۱۹۴۹ء کے ایڈیشن میں تپاں ہی کے نام ایک خط (موجودہ خط نمبر ۲۵) کو بھی غلط انتساب قرار دے کر نئے مکتوب الیہ نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے نام سے الگ درج کیا ہے۔

طباعت اور پروف کی چند غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں جو قابل ذکر ہیں:۔

- اپنے ''حواشی'' سے پہلے نقوی صاحب نے صفحہ ۱۳۶ پر اپنے کچھ ماخذ کے رموز اور مخففات وضع اور مقرر کیے ہیں۔ لیکن اس صفحے پر ایک بے محل حاشیہ بھی چھپ گیا ہے جس میں انہوں نے ''غالب اور صفیر بلگرامی'' کے حوالے سے کسی خط کے زمانہ تحریر کا تعین کیا ہے۔
- پرتو روہیلہ کے تراجم میں کچھ خطوط کی تاریخیں اصل فارسی خطوط کی تواریخ کے مطابق نہیں ہیں۔ مثلاً:

ص: ۲۲۳، ۱۸۲۹ء بجائے ۱۸۲۸ء

ص: ۲۲۵، ۱۸۲۹ء بجائے ۱۸۲۸ء

ص: ۲۲۷، ۱۲۵۵ھ بجائے ۱۲۴۴ھ

ص: ۲۳۰، ۲۷ فروری بجائے ۷ فروری

ص: ۲۳۲، ۱۲۴۰ھ بجائے ۱۲۴۴ھ

ص: ۲۳۵، ۱۸۲۹ء بجائے ۱۸۳۰ء

- ایک فارسی خط کا نمبر غلط چھپ گیا ہے، ص: ۵۴ پر خط نمبر ۱۲ بجائے ۱۴
- کچھ صفحات کے نمبر غلط ہیں۔ ان کے درست نمبر یہ ہونے چاہئیں تھے۔ ص ۱۱۰، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۲۱، ۲۴۵، ۲۴۶

(۶)

جناب رشید حسن خاں کی کتب، اصول تدوین، کلاسیکی متون کی تدوین اور اردو املا کے سلسلے میں حوالے کی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ نہ صرف اول درجے کے مدون تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ ان کی علمی و ادبی کاوشیں، تحقیق و تدوین کے اصول، مقرر اور متعین کرنے میں بھی راہ کشا ثابت ہوتی ہیں۔ غالب کے بارے میں ان کی تازہ کتاب ''املائے غالب'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ادارہ یادگار غالب کی طرف سے، انڈیا کی طبع شدہ اہم کتب کے پاکستانی ایڈیشن شائع ہونے کے سلسلے میں اس کتاب کا ایک امتیاز خاص یہ ہے کہ، انڈیا میں بھی غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) کے سلسلۂ اشاعت میں یہ تازہ کتاب ہے۔ انڈین ایڈیشن کے لیے لکھا گیا رشید حسن خان کا ''ابتدائیہ'' ۱۰ دسمبر ۱۹۹۹ء کا ہے، جبکہ پاکستانی ایڈیشن کے لیے لکھی گئی ایک صفحے کی مختصر عکسی تحریر جون ۲۰۰۰ء کی ہے۔

''املائے غالب'' کا زیر نظر ایڈیشن ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''ابتدائیہ'' ۱۴ صفحہ ۹ سے ۲۸ تک ہے جس میں رشید حسن

خان نے اپنی اس تحقیقی کاوش کی ضرورت واہمیت کی وضاحت اور اپنے مآخذ کی تفصیل درج کی ہے۔ اس کے بعد ''الفاظ'' اور ''قاعدے'' کے عنوانات سے مصنف نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے ''الفاظ'' کے تحت صفحہ ۲۹ سے ۱۵۲ تک، غالب کے اپنی، اردو فارسی نظم ونثر میں استعمال کردہ دوسو (۲۰۰) کے قریب الفاظ کو حروف تہجی کے لحاظ سے درج کرتے ہوئے ان کی املا کا تعین کیا ہے۔ دوسرے حصے ''قاعدے'' کے تحت صفحہ ۲۱۶ تک انہوں نے ''املا سے متعلق مرزا صاحب کی مختلف وضاحتوں کی روشنی اور ان کے حوالے سے، املا کے اصولوں اور قاعدوں کو ترتیب دیا ہے''۔ اسی حصے میں الگ سے ''املائے فارسی'' کے ذیلی عنوان سے ''فارسی طریق املا اور متعلقات املا کو'' بھی درج کیا ہے۔

شعرا اور ادبا کی تخلیقات کو دیکھا جائے تو خود مصنف یا کاتب کی وجہ سے ان میں اکثر املا کی دورنگی پائی جاتی ہے۔ غالب کی اردو فارسی نظم ونثر کی تقریباً تمام پیش کشوں میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ غالب املا کے سلسلے میں بہت محتاط رہتے تھے۔ اگر ایک لفظ بھی کہیں ان کی مرضی کے خلاف چھپ جاتا تو بہت بدمزہ ہوتے، کاتب کو یا چھاپنے والے کو برا بھلا کہتے اور غلطی کو درست کروا کر یا کر کے ہی دم لیتے یا پھر خطوط میں اس کی وضاحتیں کرتے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو رشید حسن خان کی یہ کتاب املائے غالب کو منشائے غالب کے مطابق پیش کرنے کی ایک کامیاب امتیازی کوشش ہے۔ یہاں انہوں نے مختلف کتب میں شامل غالب کی عکسی تحریروں اور خطوط میں کی جانے والی وضاحتوں اور مثالوں کو بنیاد بنایا ہے۔

''املائے غالب'' کے بارے میں دو ایک معلمانہ گزارشات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں:۔

❁ بعض الفاظ کے بارے میں خود غالب کے ہاں املا کی دورنگی پائی جاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں رشید حسن خان نے ان الفاظ کے املا کے تعین کے دو طریقے اختیار کیے ہیں ایک تو یہ کہ اگر غالب زیادہ عرصہ کسی مروج لفظ کے برعکس لکھتے رہے مگر آخر میں رجوع کر لیا تو رشید حسن خان اس 'نقش آخر' (جو مروج بھی تھا اور غالب کا نقش آخر بھی ٹھہرا) کو اپنا لینے کی سفارش کرتے ہیں۔ انہوں نے دوسرا طریقہ یہ اپنایا ہے کہ ایک لفظ مروج بھی تھا اور غالب نے بھی اسے زیادہ لکھا، تو اسے اپنانے کو کہتے ہیں یہاں غالب کا نقش آخر (چاہے غیر مروج ہو) اہم نہیں۔ جیسا کہ غالب زیادہ عرصے تک ''ہاتھ'' (مروج) کو ''ہات'' لکھتے رہے لیکن آخر میں ''ہاتھہ'' (ہاتھ) لکھنے لگے۔ یا ''روانہ'' (مروج) اور ''روانا'' میں سے ''روانہ'' کو زیادہ لکھا۔ یہاں ''املائے غالب'' میں رشید حسن خاں نے چند ایسے الفاظ کے حتمی املا کا تعین نہیں کیا جو غالب کی املا میں دورنگ یا سہ رنگ رہے۔ مثلاً:

''مطمئنہ'' اور ''مطمینہ'' یا ''مولانا''، ''مولنا'' اور ''مولینا'' وغیرہ اس نوع کے چند الفاظ کے بارے میں رشید حسن خان نے اپنے اختیار کردہ مذکورہ صدر دونوں طریقوں میں سے کسی کو نہیں اپنایا بلکہ یہ بات مرتبین پر چھوڑ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ بات مرتب یا مرتبین کے طے کرنے کی ہے کہ ان لفظوں کی کن صورتوں کو ترجیح دی جائے'' (ص:۱۳۳) جبکہ یہ طے ہے کہ غالب نے اپنے قلم سے جو لفظ جس طرح لکھا اسے اسی طرح پیش کیا جائے۔ پھر یہ حق مرتبین کو کیوں بخشا ہے؟

❁ بعض الفاظ اور حروف کے املا میں غالب اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہے اور مروج املا کو تسلیم نہ کیا جیسے ''ذ'' بجائے ''ز''، یا فارسی میں وہ ''ط'' لکھنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح ایک لفظ ''تپانچہ'' اور ''طمانچہ'' (مروج) میں سے منشائے غالب کے مطابق، رشید حسن خاں ''تپانچہ'' کو درست قرار دیتے ہیں۔ یہاں اس فارسی لفظ ''طمانچہ'' میں سے ''ط'' تو غالب کے مطابق ''ت'' بنی، لیکن یہ بات کہیں حاشیے میں بھی نہیں آئی کہ اس لفظ کا دوسرا حرف ''م''، ''پ'' میں کیونکر تبدیل ہوا؟

کلاسیکی متون کی تصحیح وترتیب اور تدوین میں املا کا تعین، ایک نزاعی موضوع رہا ہے۔ قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی

عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر خلیق انجم، کلاسیکی متون کی تدوین کرتے ہوئے، مروج املا کو اپنا لینے پر زور دیتے ہیں، جبکہ رشید حسن خان اور ڈاکٹر نیر مسعود املا کو، منشائے مصنف کے مطابق درج کے شدید حامی ہیں۔ زیر نظر ''املائے غالب'' کے سلسلے میں بھی ایسے مباحث سامنے آ سکتے ہیں، مثلاً غالب کے درج ذیل الفاظ جو اس وقت بھی اور بالخصوص آج کل، غیر مروج ہیں، انہیں اگر غالب کی تحریروں میں اسی طرح شائع کیا جائے تو عام قاری بدک سکتا ہے:۔

پانو (پاؤں)، پچتانا (پچھتانا)، ٹہرنا (ٹھہرنا)، چاکو (چاقو)، چانول (چاول)، تڑپھنا (تڑپنا)، جاداد (جائیداد)، چڑھانا (منہ: چڑانا)، سپارش (سفارش)، سونچنا (سوچنا)، کمل (کمبل) وغیرہ۔

یا بالخصوص انگریزی کے یہ الفاظ:

رپوٹ (رپورٹ)، پنسن (پینشن)، اسٹیسن (اسٹیشن)، برگڈیر (برگیڈیر)، رزیڈنٹ (ریزیڈنٹ)، سارتی فکٹ (سرٹیفکیٹ)، کنپ (کیمپ)، لفٹنٹ (لیفٹیننٹ) اور لمبر (نمبر) وغیرہ۔

آج کا عام قاری ان الفاظ سے نا آشنا ہے۔ وہ انہیں غالب کے کلام میں، اس صورت میں دیکھ کر یقیناً الجھن اور بے کیفی کا شکار ہوگا اور ممکن ہے دیوان غالب کو دوبارہ ہاتھ لگانے سے تائب ہو جائے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ تدوین کے سائنٹیفک طریقہ کار اور مسلمہ اصول کے مطابق ان الفاظ کو غالب کی تحریروں میں اسی طرح درج اور پیش کرنا چاہیے۔ جہاں غالب کے سینکڑوں متداول دیوان اور کلیات نظم و نثر یا کئی ایک مستند مگر مختلف المتن مجموعے چھپے اور چھپ رہے ہیں وہاں اگر رشید حسن خان کی ''املائے غالب'' کے پیش نظر (املائی لحاظ سے نہ کہ روش کتابت) منشائے غالب کے مطابق، اگر ان کی تحریروں کو کم از کم ایک بار ضرور شائع کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس امر سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ غالب کی متداول تحریروں کے ہر ایڈیشن کو اس تقاضے کا بار نہ بنایا جائے بلکہ متداول کلام کے بارے میں تو یوں ہونا چاہیے کہ مستقبل میں ہر دور کی مروج اور بدلتی املائی صورتوں کے مطابق کلام غالب کو پیش کیا جاتا رہے تاکہ تفہیم غالب کا دائرہ وسیع اور جدید تر ہوتا رہے۔

۷

اصول تحقیق اور تدوین متن کے مسائل و مباحث، تحقیق و تدوین کی روایت کو پختہ اور کارآمد بنانے میں بے حد اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اردو میں اصول تحقیق پر تو کسی قدر ناقدین اصول تحقیق نے توجہ دی ہے، مگر تدوین کی پرخار وادی میں سیر کرنے کے لیے ابھی راہیں زیادہ ہموار نہیں ہوئیں۔ اس سلسلے میں اب تک صرف چند کتب ہی راہ نما اور راہ کشا دکھائی دیتی ہیں جن میں خلیق انجم کی ''متنی تنقید''، ڈاکٹر تنویر علوی کی ''اصول تحقیق و ترتیب متن''، رشید حسن خان کی ''تحقیق، متن اور روایت'' اور پروفیسر نذیر احمد کی ''تصحیح و تحقیق متن'' قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام کتابیں بھارت سے شائع ہوئیں اور پاکستان میں عام رسائی سے باہر ہیں۔ خوش کن بات یہ ہے کہ ان میں سے، پروفیسر نذیر احمد کی کتاب ''تصحیح و تحقیق متن'' کا ''مصنف کی نظر ثانی اور تصحیح کے بعد پہلا پاکستانی ایڈیشن، ادارہ یادگار غالب نے شائع کر دیا ہے۔ شروع میں ''عرض مولف'' کے بعد ڈاکٹر عبدالستار دلوی کا ''پیش لفظ'' ہے جس میں انہوں نے نذیر احمد کے علمی و ادبی کمالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب بالترتیب آٹھ (۸) ابواب پر مشتمل ہے۔ تصحیح و تحقیق متن، اسناد تحقیق، اسناد کا استعمال، ترتیب متن، تعلیقات و حواشی، تخریج، انتقادی متن کا مقدمہ، فہرست سازی۔

''تصحیح وتحقیق متن'' ڈاکٹر نذیر احمد کے تین لیکچروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۸۸ء میں بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں خطاب کیے اور عبدالستار دلوی کے پیش لفظ کے ساتھ شعبہ اردو، بمبئی یونیورسٹی ہی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئے۔ زیر نظر پہلے پاکستانی مگر دوسرے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں یہ تین لیکچرز آٹھ ابواب میں صورت پذیر ہوئے ہیں۔ پہلے تین ابواب کے حوالے اور حواشی مسلسل ہیں اور سب، تیسرے باب کے آخر میں۔ اس کے بعد ہر چھوٹے بڑے باب کے آخر میں اس کے حواشی درج ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ پہلے تین ابواب الگ الگ ہیں یا ایک ہی ہیں۔ معنوی حسن ترتیب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کتاب کے پہلے چار عنوانات کو ایک ہی باب بننا چاہیے۔ اسی طرح پانچواں اور چھٹا باب بھی ایک ہی نوع کے مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔ پانچویں باب میں صفحہ ۵۹ اور ۶۱ پر دو جگہ نیچے حاشیہ میں متن کے کسی لفظ یا جزو کی وضاحت ہے اور اس سے آگے قوسین میں لفظ ''مدیر'' لکھا ہے۔ مصنف کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں نہ جانے یہ کس مدیر نے حاشیہ بڑھایا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی مختصر کتاب تصحیح وتحقیق متن، تدوین کے تمام اصولی، نظری اور عملی مباحث کا احاطہ نہیں کرتی۔ مثلاً ''اسناد تحقیق'' کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ یہاں بنیادی اور ثانوی ماخذ سے بحث کرنا مقصود ہے، لیکن یہاں ثانوی ماخذ کے بارے میں مباحث جگہ نہیں لے پائے۔ اصل میں یہ تمام مضامین زبانی دیے گئے لیکچرز ہیں جو بغیر کسی بڑی ترمیم واضافہ کے شائع ہوئے ہیں۔ اس بات کا اظہار ''عرض مولف'' کے تحت مصنف نے کیا ہے۔

مجموعی طور پر ۹۵ صفحات پر مشتمل اس مختصر کتاب میں پروفیسر نذیر احمد نے بڑے جامع اور مدلل انداز سے ترتیب وتصحیح متن کے بیشتر بنیادی مسائل کو سمیٹ لیا ہے۔ ان کا طرز اظہار عام فہم، سادہ اور رواں ہے البتہ فارسی زبان وادب کی مثالیں زیادہ آئیں ہیں کیونکہ ڈاکٹر نذیر احمد بنیادی طور پر فارسی کے استاد ہیں۔

۸

ادارہ یادگار غالب کے یادگار رسالے ''غالب'' کا نیا شمارہ (۱۹) بھی اپنے مشمولات کے اعتبار سے پاک وہند کے معروف اہل قلم کی نادر ونایاب تحقیقی وتنقیدی تحریروں کا مرقع ہے۔ ''غالب'' کے مرتبین، مختار زمن، رعنا فاروقی اور ڈاکٹر مشرف احمد ہیں جبکہ مجلس ادارت میں بیگم آمنہ مجید ملک، ڈاکٹر شان الحق حقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، افتخار احمد عدنی اور آفتاب احمد خاں کے نام شامل ہیں۔ خوبصورت بیک پیپر کے سرورق پر ''مرقع راگ مالا'' میں سے ایک تصویر اور دوسری طرف غالب کی تصویر رسالے کے صوری حسن میں اضافہ کر رہی ہیں۔ کتاب سائز کے پانچ سو (۵۰۰) کے قریب صفحات پر پھیلی ہوئی ان تحریروں میں سے مرتبین کے ''حرف سادہ'' کے بعد ''مہملات غالب'' (۱۹۲۱ء کی ایک فراموش شدہ بحث) کے عنوان سے، غالب سے متعلق ایک سلسلہ بحث ہے جو مختلف اہل قلم کے مضامین کی صورت میں ماہنامہ ''شباب اردو'' (لاہور) میں شائع ہوتا رہا۔ جواب الجواب کا یہ سلسلہ آٹھ (۸) اہل قلم کے بارہ (۱۲) مقالات پر مشتمل ہے۔ جو ''شباب اردو'' کے ۱۹۲۱ء ومابعد کے چند شماروں سے لیا گیا ہے۔ ''مہملات غالب'' کے سلسلہ مضامین اور ان کے مصنفین کا تعارف مشفق خواجہ نے شروع میں ''تمہید'' اور ''حواشی'' کے تحت کروایا ہے۔ اس بحث کا آغاز محمد عبدالمالک نے فروری ۱۹۲۱ء کے شمارے میں کیا تھا۔ عبدالمالک نامور انشا پرداز اور مزاح نگار محمد خالد اختر کے دادا تھے۔ یہاں محمد خالد اختر کے قلم سے ''حالات مولوی عبدالمالک'' کے عنوان سے ''ضمیمہ'' کے طور پر، ان کا

تفصیلی تعارف بھی شامل اشاعت ہے۔

اس بحث کے دیگر سات (۷) شرکا میں، یگانہ چنگیزی، گہر جائسی، ابوعزیز حکیم غلام غوث، الف دین (وکیل)، ابوالعطا عالم الہ آبادی، چراغ حسن حسرت، شیر علی خاں سرخوش، شامل ہیں۔ ''مہملات غالب'' کے سلسلے کے مضامین صفحہ ۵ سے ۱۱۴ تک ہیں۔ ''غالب'' کے زیر نظر شمارے میں درج ذیل دیگر مضامین صفحہ ۳۵۴ تک پھیلے ہوئے ہیں: غالب اور معارضۂ کلکتہ (ڈاکٹر حنیف نقوی)، غالب اور علی گڑھ (ڈاکٹر اصغر عباس)، کلام غالب کا لسانی تجزیہ (ڈاکٹر شان الحق حقی)، غالب کی ایک کم یاب تصنیف ''تیغ تیز'' (ڈاکٹر مختار الدین احمد) لب پہ حرف غزل (ڈاکٹر آفتاب احمد)، مثنوی ''خموش خاتون'' پر ایک نظر (پرتو روہیلہ) میرے شب و روز (آپ بیتی: ڈاکٹر مختار الدین احمد) اور حکایت گل و بلبل (سو سال پہلے کی اردو نثر کا ایک نمونہ: ڈاکٹر سید اسلم) اس کے بعد صفحات کی نئی ترتیب کے ساتھ صفحہ ۱ سے آخر (ص: ۱۲۸) تک ''میرے جیون کی کچھ یادیں'' (پہلی قسط) ہے۔ یہ بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کے صف اول کے راہنما ڈاکٹر زید۔ اے احمد کی، ہندی زبان میں مطبوعہ خودنوشت سوانح عمری کا اردو ترجمہ ہے، جو یعقوب خاور نے کیا ہے۔ اس آپ بیتی کا یہ پہلا حصہ بارہ (۱۲) ابواب پر مشتمل ہے۔ شروع میں مشفق خواجہ کا ''ابتدائیہ'' اور بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری اے۔ بی۔ برد ھن کا ''دیباچہ'' بھی شامل ہے۔ ''غالب'' کا یہ تازہ شمارہ اپنے گوناگوں مندرجات کے مطابق اپنے اندر کشش کا سامان رکھتا ہے جس کے لیے مرتبین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اردو تحقیق و تنقید اور بالخصوص غالب و غالبیات کے فروغ میں ادارہ یادگار غالب (کراچی) کی خدمات کو ہمیشہ سراہا جاتا رہے گا[۱]۔ انڈیا سے شائع ہونے والی کتب، پاکستان میں عام رسائی سے دور رہتی ہیں۔ ادارہ کی طرف سے یہ مبارک عمل، اہمیت کا حامل ہے کہ وہ بھارتی کتب کو شائع کر کے ضیافت علمی کے مواقع فراہم کر رہا ہے۔ کیا ترجیحاً ''مطبوعہ'' کتابوں کو چھاپنے سے بہتر یہ نہیں کہ ''غیر مطبوعہ'' تحریریں چھاپی جائیں، خواہ وہ بھارتی اہل قلم ہی کی کیوں نہ ہوں!؟ پچھلے صفحات میں جن کتب کا تذکرہ آیا ہے۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی اہمیت کو دیکھ کر، یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ادارۂ یادگار غالب کے اس سلسلۂ اشاعت کو سنجیدہ قارئین کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور یہ کتب ہر لائبریری کی زینت، بنیں گی اور بڑھائیں گی۔

حوالے اور حواشی

۱۔ میری خبر و نظر کی حد تک مرزا ظفر الحسن پر تا حال کتابی حجم کا کوئی کام شائع نہیں ہوا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ادارۂ یادگار غالب، مرزا ظفر الحسن کے بارے میں کوئی خاص نمبر مرتب کر ڈالے۔

۲ ''یادگار غالب'' مرتبہ مالک رام کے حصہ اول (اردو) پر سال اشاعت ۱۹۷۷ درج ہے جو غلط ہے۔

۳ ''یادگار غالب'' سے متعلق دیگر تحقیقی مباحث کے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی کا مقالہ ''یادگار غالب۔ ایک تحقیقی مطالعہ'' (مشمولہ: سہ ماہی ''سویرا'' لاہور، شمارہ ۲۲) بھی اہم ہے۔

۴ ڈاکٹر گیان چند نے صرف مضامین کی تعداد میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ پچھلے مضامین میں ترمیم و اضافہ یا ان پر نظر ثانی نہیں کی۔

۵،۶ حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے ''اردوئے معلیٰ'' کا اجرا کیا، جو اپریل ۱۹۰۸ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ مئی ۱۹۰۸ء سے ستمبر ۱۹۰۹ء تک بند رہنے کے بعد، اکتوبر ۱۹۰۹ء سے مئی / جون ۱۹۱۳ء تک دوبارہ جاری رہا۔ یہ ''اردوئے معلیٰ'' کا علی گڑھ کا زمانہ ہے۔

جولائی ۱۹۱۳ء سے دسمبر ۱۹۲۴ء تک پھر یہ اشاعت سے محروم رہا۔ اس دوران میں، حسرت نے ۱۹۲۰ء میں کانپور سکونت اختیار کر لی اور یہیں سے جنوری / فروری ۱۹۲۵ء، ''اردوئے معلّی'' کا پھر سے اجرا کیا۔ کانپور کے زمانے میں یہ رسالہ فروری ۱۹۲۵ء سے دسمبر ۱۹۴۲ء تک جاری رہا، لیکن ۱۹۳۴ء کے بعد اس کی اشاعت میں تسلسل اور باقاعدگی باقی نہیں رہی تھی۔ علی گڑھ کے زمانے ہی میں حسرت نے ۱۹۱۳ء میں ''اردوئے معلّی'' کے بند ہو جانے پر جولائی ۱۹۱۴ء میں، کتابی صورت میں سہ ماہی ''تذکرۃ الشعرا'' نکالنا شروع کیا تھا۔ اگست ۱۹۱۹ء تک اس کے صرف سات (۷) شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد یہ رسالہ بھی ختم ہو گیا۔

۷۔ ''ارباب سخن'' (حصہ اول و دوم)، حسرت موہانی، رئیس المطابع، کانپور، ۱۹۲۹ء

۸۔ حسرت نے کچھ شعرا کی دواوین ''اردوئے معلّی'' کے بعض شماروں کے ساتھ ضمیمے کے طور پر بھی شائع کیے اور الگ کتابی صورت میں بھی، پھر انہیں ''انتخاب سخن'' کے نام سے گیارہ جلدوں میں بھی مرتب اور شائع کیا۔

۹۔ مجھے ''اردوئے معلّی'' کے درج ذیل چند برسوں کے شمارے دیکھنے کا موقع مل سکا ہے۔ ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۷ء، ۱۹۰۸ء، ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء، اور ۱۹۱۳ء۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حسرت نے اپنے تذکرے کے منصوبے کی تکمیل کے لیے بیشتر شعرا کے خود تراجم لکھے اور بعض کے دیگر احباب سے بھی لکھوائے اور ''اردوئے معلّی'' وغیرہ میں شائع کیے۔ فروری ۱۹۱۱ء کے مذکورہ شمارے سے جن آٹھ شعرا کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے یہ تراجم شائع تو ہوئے ہوں لیکن حسرت کے علاوہ دوسروں نے لکھے ہوں اور یہاں مرتب ''تذکرہ'' نے تو صرف حسرت کے تراجم (تذکروں) کو جمع کیا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت اگر مقدمے میں کر دیتے تو اچھا تھا۔ یہی نہیں بلکہ حسرت کے تذکرہ لکھنے کے منصوبے کے مطابق دوسرے لوگوں سے لکھوائے گئے تراجم بھی شامل کر لینا چاہیے تھے تبھی حسرت کے منصوبے کی تکمیل ممکن تھی تاکہ شعرا کے تمام سلسلے مکمل ہوتے۔ ''تذکرہ'' میں اگر ایسا ممکن نہیں تھا تو مقدمے میں اس کی جانب کو اشارہ کر دینا چاہیے تھا۔

۱۰۔ ڈاکٹر احمر لاری کی فہرست میں ایسے چار شعرا کے نام شامل ہیں، لیکن ان سے سہو ہوا کہ انہوں نے احسن مارہروی کے تذکرے کو بھی حسرت کا نوشتہ سمجھ کر اس فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ احسن، حسرت کے ہم عصر احباب میں سے تھے۔ ان کا تذکرہ حسرت نے نہیں لکھا بلکہ خود احسن نے اپنے کوائف، حالات اور نمونہ کلام لکھ کر دیا جو انہیں کے نام سے ''اردوئے معلّی'' کے جلد: ۱۳، شمارہ ۲-۳، فروری، مارچ ۱۹۱۲ء کے صفحہ ۳ سے ۷ تک شامل ہے۔

۱۱۔ ''تذکرۃ الشعرا'' (شفقت رضوی) کی مدد سے ڈاکٹر احمر لاری کو بھی اپنے کچھ حوالے مکمل اور درست کرنا پڑیں گے۔

۱۲۔ شاید یہ کارِ خیر کوئی شخص بڑے ''احسن'' طریقے سے انجام دے رہا ہے۔ مجھے پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ''اردوئے معلّی'' کے جو چند شمارے دیکھنے کا موقع ملا، ان میں حسرت کے علاوہ دوسروں کے لکھے ہوئے تراجم میں سے کچھ موجود ہیں اور درج ذیل تین تراش لیے گئے ہیں۔

دلیر مارہروی از احسن مارہروی، شمارہ: ۲-۳، جلد: ۱۵، فروری مارچ ۱۹۱۳ء، ص: ۳-۱۰

طپش مارہروی، از احسن مارہروی، شمارہ ۴، جلد: ۱۵، اپریل ۱۹۱۳ء، ص: ۳-۸

جوہر شاہجہانپوری از حضرت رسا، شمارہ: ۵-۶، جلد ۱۵، مئی جون، ۱۹۱۳ء، ص: ۳-۷

۱۳۔ گیان چند، ڈاکٹر، رموز غالب، کراچی، ادارہ یادگارِ غالب، ۱۹۹۹ء، ص: ۴۳۶

۱۴۔ ''ابتدائیہ'' میں ایک جگہ رشید حسن خان نے سید وزیر الحسن عابدی کو ڈاکٹر لکھا ہے۔ عابدی صاحب کا نام اور کام بہت سے ''نام نہاد'' ڈاکٹر حضرات سے بڑھ کر ہے لیکن وہ پی ایچ۔ ڈی نہیں تھے۔

۱۵۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن کی نگرانی میں، ادارہ یادگارِ غالب سے متعلق، حالیہ برسوں میں دو تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں جن پر مقالہ نگاران کو ڈگریاں مل چکی ہیں۔

۱۔ مرزا ظفر الحسن کی خدمات (غالب کے خصوصی حوالے سے)، نسیمہ رحمن، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۹ء، (ایم۔ اے اردو: غیر مطبوعہ) ص: ۳۳۸

۲۔ رسالہ ''غالب'' کی ادبی خدمات مع اشاریہ، ساجدہ پروین، شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء (ایم فل اردو، غیر مطبوعہ)

مختصر تبصرے

کتابی سلسلہ دنیازاد۔ فلسطین نمبر

ڈاکٹر انور سدید

اس خوفناک حقیقت سے دنیا کا کوئی ذی عقل انکار نہیں کرسکتا کہ مشرق وسطیٰ میں آگ لگی ہوئی ہے اور فلسطین جل رہا ہے۔ ''جنوبی ایشیا سے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور کشمیر جل رہا ہے''۔ ایسی ہی ایک آگ بوسنیا ہرزگووینا سے اٹھی تھی جس میں مسلمانوں کو جلایا گیا تھا اور ان کی ہڈیاں اب اجتماعی قبروں سے برآمد کی جاتی ہیں تو اقوام متحدہ کا ضمیر ہرگز نہیں جاگتا بلکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سوال اٹھا کر ظلم اور وحشت اور قتل وغارت گری کی آگ چند اور مسلمان ممالک تک بڑھا دی جاتی ہے۔ عراق اس کی ایک بڑی مثال ہے جس پر امریکہ اور برطانیہ کے طیارے بم برسا رہے ہیں، پاکستان اس کی ایک اور مثال بن رہا ہے، جس کی مشرقی سرحد پر بھارت نے اپنی فوجیں جمع کر رکھی ہیں اور کبھی چتی سنگھ پورہ میں اور کبھی قاسم نگر (جموں) میں اپنے ہندو ہم وطنوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کر الزام پاکستان کے سر مڑھ رہا ہے اور ہر لحہ ایٹمی جنگ کا خطرہ بڑھا رہا ہے۔ پاکستان کی مغربی سرحد کے علاوہ پاکستان کے اندر دن ہوائی اڈوں پر نام نہاد امریکی امن فوج موجود ہے جو اسامہ بن لادن، ملا عمر اور طالبان والقاعدہ کے ارکان کی تلاش میں پاکستانی عوام کو روندرہی ہے۔ مسلم کشی کے اس دور میں اردو کے نوجوان افسانہ نگار آصف فرخی کی تشویش یہ ہے کہ ہم جس اہم مسئلے کو عالمی مسئلہ بنا دیتے ہیں اور جس مسئلے کے بارے میں روزانہ بہت کچھ سنتے ہیں، اخباروں میں خبریں پڑھتے ہیں اور ٹیلی ویژن پر تصویریں دیکھتے ہیں، اسی مسئلہ کے بارے میں ''ہم بہت کچھ'' نہیں جانتے اور نہ ہم اس مسئلہ کے ''کچھ نہ کچھ'' سے باخبر ہونے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ آصف فرخی کی یہ تشویش جب گھمبیر ہوگئی تو انہوں نے اپنے فکری اور نظری کتابی سلسلے ''دنیازاد'' کا ''عاشق من الفلسطین'' نمبر شائع کرنے اور پاکستان کے علاوہ اردو دنیا کو اس اہم ترین مسئلے کے داخلی حقائق سے باخبر کرنے کا فیصلہ کیا، آصف فرخی کا بنیادی مقصد اس دہان زخم کو وا کرنا تھا جس سے ہم بے خبر ہیں۔

کتابی سلسلہ ''دنیازاد'' کا ''فلسطین نمبر'' دو جلدوں میں چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ ان معرکہ آرا اور اپنی مثال آپ کتابوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان میں فلسطین کے سیاسی، سماجی اور تاریخی تناظر میں اس مسئلہ کے حامیوں کے ساتھ اس کے مخالفوں کی تحریریں بھی جمع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ''دنیازاد'' میں خبریں بھی ہیں لیکن ان کا پس منظر بھی پیش کیا گیا ہے۔ ''دنیازاد'' میں تاریخ پیش کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ مسلم دشمنی کے اس سلسلے تک رسائی بھی حاصل کی گئی ہے جو صلاح الدین ایوبی سے شروع ہوا تھا اور اب امریکی صدر جارج ڈبلیو بش تک آپہنچا ہے۔ اس میں دانشوروں کے تجزیے، شاعروں کی نظمیں اور

افسانہ نگاروں کی کہانیاں بھی ہیں جن کی حقیقت خون کے آنسوؤں سے لکھی گئی ہے اور یہ تاریخ بیسویں صدی کی سائنسی ترقی پر بھی نوحہ کناں ہے جس نے انسانی بربریت سے امریکہ کو ابھارا ہے اور وہ آج ساری اسلامی دنیا کو روندرہا ہے۔

''دنیازاد'' کا پہلا حصہ ۴۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نظری تاریخ اور تنقید پیش کی گئی ہے۔ امریکی اور اسرائیلی بربریت کے خلاف پہلی آواز مصر کے نوبل انعام یافتہ ادیب نجیب محفوظ نے اٹھائی ہے اور وہ اپنے خشت بردار بچوں کو دیکھ رہے ہیں جنہوں نے اب اپنے پیٹ کے ساتھ بم باندھ کر خودکش حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے وہ کہہ رہے ہیں:

''ہم فلسطینیوں سے مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ مزاحمت کرنا چھوڑ دیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم ان ظالموں سے کس طرح مختلف ہو سکیں گے جو بلا کسی سزا کے اب پوری قوم کے وحشیانہ قتل عام کو قبول کرتے یا اس کی توثیق کرتے ہیں''۔

نجیب محفوظ کی تنقید کا رخ نہ امریکہ کی طرف ہے نہ یورپین یونین کی طرف، نہ کسی اور صیہونی طاقت کی طرف، ان کا رخ عرب دنیا، او آئی سی اور عرب لیگ کی طرف ہے جو کھلی آنکھوں سے فلسطین پر ٹینکوں کی چڑھائی دیکھ رہے ہیں۔ اور بمبار ہیلی کاپٹروں کی بمباری کا مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن لب بستہ اور ''چپ'' ہیں خود اپنے قتل پر خاموش ہیں۔

ڈاکٹر آصف فرخی نے مسئلہ فلسطین پر یہ ایک بے حد حساس دستاویز مرتب کی ہے۔ اس میں سب سے پہلے ''ماجرا کیا ہے؟'' کے تحت فلسطین کی فرہنگ پیش کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں عہد اسلامی سے لے کر عہد حاضر تک تاریخی ماجرا بیان کیا گیا ہے۔ تازہ واقعات کی روداد اور محرومی کے خدوخال کے علاوہ افراد اور معاشرے کے بدلتے ہوئے رشتوں کا احوال پیش کیا گیا ہے۔ سفرناموں سے فلسطین کا آنکھوں دیکھا حال اور اس سرزمین سے نکالے ہوئے عوام کی جگرخراش داستانیں درج کی گئی ہیں۔ یہ سب خون کے آنسو ہیں جن کی ندی اکیسویں صدی میں بہہ رہی ہے۔

''دنیازاد'' کا دوسرا حصہ اہل فن کی تخلیقی اور تجزیاتی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے دس ابواب ہیں۔ مسئلہ فلسطین کی شہادتیں ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے پیش کی ہیں، ایک باب محمود درویش کے تعارف کے لیے وقف ہے۔ فلسطین کے بارے میں لکھے جانے والے ناولوں، افسانوں اور نظموں کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ ایک اہم باب ''اردو ادب اور فلسطین'' ہے جس کے ساتھ فلسطین کے بارے میں دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔ اس اجمال میں جن لوگوں نے فکر و نظر کے رنگ بھرے ہیں ان میں نجیب محفوظ، ایڈورڈ سعید، حنان اثراوی، نادیہ حجاب، عزمی اشارہ، لیلیٰ خالد، معین لبھیو، رابرٹ فسک، اسماعیل شموط، فدوی طوقان، توشیق زیاد، سمیرہ عظام اور متعدد دوسرے نام ہیں جو عالمی سطح پر بھی شہرت یافتہ ہیں، ان کی تحریروں کو جن ادیبوں نے اردو میں پیش کیا ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر مبارک علی، شاہد حمید، الطاف فاطمہ، محمد ناظم، انور زاہدی، ڈاکٹر اسلم فرخی، منیر الدین احمد، خالد سہیل، کشور ناہید، انور سن رائے، انتظار حسین، مسعود اشعر اور امجد طفیل۔ سب سے زیادہ تراجم آصف فرخی نے خود کیے ہیں اور بلاشبہ انہیں اس خدمت پر ''تمغہ اعزاز'' عطا کرنا چاہیے۔ فلسطین کے موضوع پر اردو میں جو تخلیقی ادب پیش کیا گیا ہے اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ بس اتنا جان لیجیے کہ چند ادب پارے فیض احمد فیض، ادا جعفری، غیب الرحمٰن، فتح محمد ملک، عشرت ظفر، ذیشان ساحل نے پیش کیے ہیں۔ ان سب پر مستزاد علامہ اقبال ہیں جو اپنی زندگی میں ارشاد فرما گئے تھے:

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے

قریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ''دنیازاد'' کی یہ دو کتابیں خالصتاً آصف فرخی صاحب کے عشق فلسطین کا حاصل ہیں۔ ان کتابوں کا

مطالعہ جذبہ جہاد کو تقویت دیتا اور فلسطین کے علاوہ کشمیر کے لیے بھی نذرانہ جاں پیش کرنے کی ترغیب پیدا کرتا ہے۔ یہ دو کتابیں مرتب کر کے آصف فرخی خود بھی میدانِ عمل میں شامل نظر آتے ہیں اور سوئے ہوؤں کو جگا رہے ہیں۔ ان کتابوں کو بار بار پڑھنے کے لیے اپنے گھر میں ہر وقت رکھنا بے حد ضروری نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر (کوائف/کتابیات/اشاریہ)

محمد ہارون عثمانی

علم کتاب داری (لائبریری سائنس) میں اشاریہ کو ثانوی ذریعہ معلومات کہا جاتا ہے لیکن اپنی اہمیت اور استعمال کے پیش نظر بعض اوقات یہ ابتدائی ماخذ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اشاریہ روشنی کی وہ باریک سی کرن ہے جس کی مدد سے محقق تحقیق کے اندھیرے کمرے میں چیزیں ٹٹولنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ نقاد کو بھی ایک بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر تنقید کی باقی عمارت اساری جاتی ہے۔ اشاریہ دراصل کسی بھی قابل مطالعہ مواد یا مجموعہ دستاویزات اور اس کے مندرجات کی سرخیوں کے ساتھ کسی خاص ترتیب سے دی گئی فہرست کا نام ہے۔ اشاریے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ناموں کا اشاریہ، موضوعی اشاریہ، شخصی اشاریہ وغیرہ۔ پہلے دو قسم کے اشاریے عموماً ضمیمے کے طور پر کتاب کے آخر میں دیے جاتے ہیں۔ یہ کتاب میں موجود مختلف ناموں اور موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کتاب میں کہاں کہاں یہ نام اور موضوعات موجود ہیں۔ شخصی اشاریہ ان سے قدرے مختلف ہے۔ یہ اپنی بناوٹ اور استعمال کے اعتبار سے کچھ حد تک شخصی کتابیات سے ملتا جلتا ہے۔ فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ شخصی کتابیات کسی خاص شخص کی اپنی تمام کتب اور اس پر لکھی گئی تمام کتب کی منظم فہرست ہوتی ہے جب کہ شخصی اشاریے میں کتابیات کے علاوہ اس شخص کی تحریر کردہ تمام تحریروں، اس پر لکھی گئی تمام تحریروں، مضامین، تذکروں اور کوائف وغیرہ کی تفاصیل بھی منظم انداز میں دی جاتی ہیں۔

اردو میں اشاریہ سازی کی روایت بہت کمزور ہے۔ ہمارے ہاں تو اردو کتب کے آخر میں کتابیات کا تکلف اب جا کر کہیں گوارا کیا جانے لگا ہے۔ چہ جائیکہ ناموں کے اور موضوعی اشاریے دیے جائیں۔ شخصی اشاریے کی بات کی جائے تو اردو کا دامن اور بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ سوائے ڈاکٹر معین الرحمٰن کے سید وقار عظیم اور ڈاکٹر نسیم فاطمہ کے ڈاکٹر جمیل جالبی پر مرتب کردہ شخصی اشاریوں کے کوئی قابل ذکر اشاریہ دستیاب نہیں ہے۔ ان میں سے بھی ڈاکٹر نسیم فاطمہ لائبریری سائنس کی پروفیسر ہیں۔ اس صورت حال میں جب محمد سعید کا ڈاکٹر سلیم اختر پر ترتیب دیا ہوا اشاریہ سامنے آیا تو خوش گوار حیرت نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا نام کوئی معمولی نام نہیں ہے۔ ان کا شمار موجودہ دور کے ان بڑے ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا ہے جن کی حیثیت مسلم الثبوت ہے۔ جب تک اردو زبان و ادب زندہ ہے ان کا فن بھی زندہ رہے گا۔ نفسیاتی تنقید اور افسانہ نگاری ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ وسیع مطالعہ، ذہانت، انفرادیت، توازن، بے خوفی اور دل آویز اسلوب اظہار ہی کی بنا پر احمد ندیم قاسمی نے ڈاکٹر سلیم اختر کو نسل نو کا سب سے مسلح نقاد قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی رہی ہے کہ انہیں ہر دور میں ایسے شاگرد میسر رہے ہیں جنہوں نے اپنے اس نام ور استاد کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے بعد اب محمد سعید شاگرد ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اپنی ضخامت کے اعتبار سے مختصر لیکن افادیت کے لحاظ سے بہت بڑی ہے۔ مرتب نے مواد کو سات

ابواب (یا عنوانات کہہ لیں) میں تقسیم کیا ہے۔ مرتب کا دیباچہ ''حرفے چند'' اس کے علاوہ ہے۔ پہلا باب ڈاکٹر سلیم اختر کے سوانحی کوائف بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پیدائشی لاہوری ہیں۔ اسی باب سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایم اے اردو کرنے سے قبل لائبریری سائنس میں ڈپلوما کیا تھا، یعنی وہ ایک پیشہ ور لائبریرین بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کام میں خاص حسن ترتیب نظر آتا ہے۔ باقاعدہ پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بھی انہوں نے بطور لائبریرین ہی کیا۔ اگرچہ اس سے قبل وہ بطور نائب مدیر روزنامہ شہباز پشاور میں کام کر چکے تھے۔ ایک چیز اور بھی بڑی حیران کن ہے کہ اپنے بتیس سالہ تدریسی زندگی میں وہ ایسوسی ایٹ پروفیسری کا ہی پتھر چوم سکے مکمل پروفیسر نہ بن سکے۔ ہمارے ملازمتی ڈھانچے پر اس سے بڑی طنز اور کیا ہوگی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے زیر نگرانی ایم اے اردو کے نو، ایم فل اردو کے چار اور پی ایچ ڈی اردو کے تین مقالے تحریر کیے جا چکے ہیں، جبکہ ایم فل اردو کے دس اور پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ زیر تکمیل ہے۔ اعزازات میں ۱۹۷۲ء میں ''ادب اور لاشعور'' پر داؤد ادبی انعام برائے تحقیق و تنقید، ۱۹۸۲ء میں ''اقبال اور ہمارے فکری رویے'' پر گلڈ انعام برائے تنقید، ۸۹۔۱۹۸۸ء میں نقوش ایوارڈ برائے سفرنامہ بھارت اور ۱۹۹۳ء میں نیاز فتح پوری ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

تصنیفات و تالیفات کے باب کو مرتب نے تنقید، غالبیات، اقبالیات، مختصر افسانہ، سفرنامے، طنز و مزاح، نفسیات اور نصابی کتب کے ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کل تصانیف کی تعداد ۶۲ ہے جبکہ ۹ نصابی کتب اس کے علاوہ ہیں۔ تنقیدی کتب کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۳۰ ہے۔ ان میں ڈاکٹر صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالے ''نفسیاتی تنقید'' کے علاوہ ''تنقیدی دبستان''، ''تخلیق۔ تخلیقی شخصیات اور تنقید'' اور مشہور زمانہ ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' بھی شامل ہیں۔ ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے ۱۲۱ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن مرتب نے صرف پہلے ایڈیشن ۱۹۷۱ء کا ذکر کے فٹ نوٹ میں یہ اطلاع دے دی ہے۔

''سنگ میل کی طرف سے مستقل اشاعت کا اکیسواں ایڈیشن ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا''

شخصی اشاریہ کا تقاضا تھا کہ تمام ایڈیشنوں کا سن وار تذکرہ کیا جاتا۔

اعترافات والا باب ڈاکٹر صاحب کے فن اور شخصیت پر طبع شدہ کتب، جامعات میں موضوع، رسائل میں گوشے، خاکے، کتب پر مضامین و تبصرے، فن اور شخصیت سے متعلق کتب پر تبصرے، کتب میں تذکرہ، انتسابات، افسانوں کے انگریزی تراجم اور متفرقات کے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے فن اور شخصیت پر طبع شدہ کتب میں سب سے اہم ''ڈاکٹر سلیم اختر: بحیثیت نقاد'' ہے جو دراصل ڈاکٹر جلیل اشرف کی پی ایچ ڈی کے مقالے کی مطبوعہ شکل ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۹۹ء میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی (کلکتہ۔ بھارت) نے ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا۔ دیگر کتب میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی ''ہم سفر بگولوں کا'' اور ''ڈاکٹر سلیم اختر۔ شخصیت و تخلیقی شخصیت'' اہم ہیں۔ یہاں مرتب نے کتب کے ابواب کی تفاصیل اور ذیلی عنوانات دے کر اشاریہ سازی کا حق تو ادا کر دیا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ زحمت ڈاکٹر سلیم اختر کی اپنی تصانیف کے ضمن میں بھی اٹھالی جاتی۔ باب نمبر چار، پانچ، چھ اور سات بالترتیب کتب میں مقالات، کتب میں افسانے، پیش لفظ / دیباچے / مقدمے اور انٹرویوز کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اگرچہ اس کتاب کے مواد کی فراہمی میں مرتب محمد سعید کو ڈاکٹر طاہر تونسوی اور خود ڈاکٹر سلیم اختر کی عادت حاصل رہی ہے لیکن ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کسی بھی فرد کے بارے میں اس قسم کی تفاصیل پیش کرنا فرد واحد کے بس کا کام نہیں، اس میں یقیناً دوسروں کی معاونت درکار ہوتی ہے۔ مرتب نے محنت سے کام کیا ہے جس کا ثبوت کتاب کا ہر ورق ہے۔

کہیں کہیں حوالے نامکمل ضرور رہ گئے ہیں مثلاً صفحہ ۵۷ پر متفرقات کے عنوان کے تحت خواجہ اعجاز احمد بٹ کا حوالہ ادھورا ہے۔ پروف بھی احتیاط سے نہیں پڑھے گئے ہیں۔ سرورق پر ہی ڈاکٹر سلیم اختر کا نام غلط چھپا ہوا ہے۔ لیکن ان چند چھوٹی چھوٹی خامیوں سے قطع نظر ڈاکٹر سلیم اختر (کوائف رکتابیات راشاریہ) ایک اہم دستاویز ہے۔ محمد سعید نے قابل تقلید طرح ڈالی ہے۔ اسی نوعیت کا کام ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور اسی سطح کے دیگر محققین، نقاد و ادبا پر بھی ہونا چاہیے۔ جامعات اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر شخصی اشاریے مقالے کے بہترین موضوعات بن سکتے ہیں۔

ادب کہانی ۱۹۹۷

جاوید اختر بھٹی

ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ مختلف ادبی محاذوں پر فتح حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔ آج سے دس پندرہ برس پہلے تک ایک طرف ڈاکٹر انور سدید تنہا کھڑے تھے تو دوسری طرف ایک ہجوم ہاتھ میں پتھر اٹھائے ہوئے تھا۔ لیکن ایک ایک کر کے سب میدان چھوڑ گئے۔ انور سدید نے اپنی فتح کا جشن نہیں منایا وہ اپنے ادھورے کام مکمل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ انور سدید کا ذکر جب بھی کسی محفل میں آتا ہے تو ان کے ادبی معرکوں کا تذکرہ ضرور کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید میرے محسن ہیں۔ میں نے حق گوئی کا شعور انہی سے حاصل کیا۔ ورنہ اس سے پہلے میرا خیال تھا کہ ناانصافی ادیب کا مقدر ہے۔ اسے چاہیے کہ ناانصافی کرنے والے کے لیے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے اور اس کے کاروبار میں ترقی دے۔ ظالم کے ہاتھ مضبوط ہوں تا کہ اسے ظلم کرنے میں آسانی ہو۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ حق بات کہتے ہوئے خوف محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر انور سدید نے ملازمت سے تو ریٹائرمنٹ حاصل کر لی لیکن بطور ادیب، شاعر، نقاد، محقق، جائزہ نگار اور صحافی، ان کے لیے ریٹائر ہونا ممکن نہیں۔ انجینئر کی جگہ کوئی دوسرا انجینئر لے سکتا ہے۔ جب کہ بطور قلم کار، انہوں نے علم و ادب کی جو بستیاں آباد کی ہیں وہ کوئی اور آباد نہیں کر سکتا۔ دعا کرنی چاہیے کہ یہ مقام مدتوں آباد رہے۔

ڈاکٹر انور سدید زندگی کے کسی شعبے میں ناکام نہیں ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ کامیابی حاصل کی ہے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اس قدر کامیاب صحافی ہوں گے۔ عام رائے یہ تھی کہ اب وہ اپنی باقی زندگی کسی ادبی رسالے کے لیے وقف کر دیں گے۔ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے اردو صحافت میں نام پیدا کیا۔ غالباً یہی ایک شعبہ تھا جسے انہوں نے آزمایا نہیں تھا (ملازمت کے دوران ڈاکٹر صاحب مختلف ناموں سے اخبارات میں ادبی کالم لکھتے رہے، لیکن اس کو باقاعدہ صحافت نہیں کہا جا سکتا) اور آج بطور صحافی ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس قدر مصروف زندگی بسر کرنے کے باوجود، ان کی انتھک محنت کی دلیل یہ ہے کہ ان کی کتابوں کی تعداد ۵۳ تک پہنچ چکی ہے۔

ان کتابوں میں سے چند اردو ادب میں گراں قدر سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں:۔

۱۔ اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش (اس موضوع پر اب تک کوئی دوسری کتاب سامنے نہیں آئی)

۲۔ اردو ادب کی تحریکیں (یہ کتاب ڈاکٹر انور سدید کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ اردو ادب کے طالب علم مسلسل اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں)۔

۳۔ اردو ادب میں انشائیہ (یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب اسی موضوع پر آئی)۔

۴۔ اردو ادب میں سفر نامہ (اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے)۔

۵۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ (اسے اردو ادب کی ایک معیاری تاریخ کہا جا سکتا ہے)۔

۶۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے)۔

یہ ایسی کتابیں ہیں کہ جن سے اردو ادب میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے مقابلے کی کتاب تا حال منظر عام پر نہیں آئی۔ اور نہ ہی کسی نے سفر نامے اور ادبی رسائل پر اس انداز سے کام کیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کا کام اتنا زیادہ ہے کہ اس کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا جائے تو دو تین سو صفحات کی کتاب مکمل ہوتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان کی تمام کتابوں کا تعارف ممکن نہیں۔

میری نظر میں مولوی عبدالحق مرحوم کے چند جائزے گزرے ہیں۔ (ڈاکٹر صاحب گارساں دتاسی کو پہلا جائزہ نگار قرار دیتے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ درست بھی ہے۔ لیکن ہندوستان کے پہلے جائزہ نگار مولوی صاحب ہی ہے) یہ سالانہ جائزے انجمن ترقی اردو ہند کی مطبوعات تک ہی محدود ہوتے تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر انور سدید نے جائزہ نگاری کے اس تصور کو تبدیل کر دیا۔ ان کے نزدیک اگر کوئی شاعر چند غزلیں یا نظمیں کہتا ہے اور کوئی ادیب چند تحریریں شائع کراتا ہے تو اس کا حق ہے کہ سالانہ جائزے میں اس کا ذکر کیا جائے۔ یوں جائزہ نگاری میں وسعت آ گئی۔ انہوں نے جائزہ نگاری کو کتب شماری سے آزاد کرا لیا۔ مستقبل کے مورخ کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ ڈاکٹر انور سدید سے رہنمائی حاصل کرے۔

روزنامہ جنگ کے ادبی ایڈیشن میں ایک عرصے تک دو جائزے آمنے سامنے شائع ہوتے رہے۔ لکھنے والے دونوں جائزوں میں اپنا نام تلاش کرتے تھے۔ بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو اپنا نام انور سدید کے جائزے میں مل جاتا تھا اور پھر کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ انور سدید اپنے جائزے میں ناموں کی بھرمار کر دیتے ہیں، گویا ان کی خواہش تھی کہ جائزہ چند افراد کے گرد اس طرح گھومتا رہے کہ ایک دائرہ بن کر رہ جائے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ انور سدید دائرے بنانے والے نہیں، توڑنے والے ہیں اور پھر تمام دائرے توڑتا ہوا ادبی جائزہ اردو ادب کے افق پر کتابی صورت میں طلوع ہوا۔ ۱۹۹۶ء کی ادب کہانی ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آئی اور ۲۰۰۱ء میں ادب کہانی ۱۹۹۷ء طلوع ہوئی۔ یہ کتاب تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جائزہ نگاری اخباری دنیا سے نکل کر کتابی دنیا میں آ گئی۔

رحمان مذنب (مرحوم) کی رائے اہمیت رکھتی ہے کہ ''انور سدید مثبت سوچ رکھتے ہیں۔ جائزے کے معاملے میں گروہ بندی یا عصبیت کا کوئی عنصر انہیں گمراہ نہیں کرتا۔ ایسے وہ کسی کو نظر انداز نہیں کرتے کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتے''۔

یہ رائے ان دانشوروں کے سامنے ہونی چاہیے جو اعتراض کرتے ہیں کہ انور سدید کے جائزے میں ناموں کی بھرمار ہوتی ہے۔

اس کتاب (ادب کہانی ۱۹۹۷ء) میں بہت سی آراء موجود ہیں۔ ان میں پرانے اور نئے لکھنے والے بہت سے لوگ نظر آ رہے ہیں۔ سب کی ایک ہی رائے ہے۔ ان کے نزدیک ڈاکٹر انور سدید انصاف کرنے والے نقاد اور جائزہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں

دانستہ کسی کو نظر انداز کرنے کی خواہش نہیں ہے۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں قابل اعتبار اور علم و ہنر کے ہر شعبے میں کامیاب قرار پاتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی ایوارڈ کا لالچ اور ستائش کی خواہش نہیں کی۔ وہ اپنی دھن میں مگن ہیں اور لکھتے چلے جا رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب (ادب کہانی ۱۹۹۷ء) ان کے کمال فن کا مظہر ہے۔ شاعری کی وہ کون سی صنف ہے جو موجود نہیں۔ نظم، غزل، ہائیکو، ثلاثی، نثری نظم، ماہیا، ڈھولا، چھلا، رباعی، قطعہ، دوہا، گیت، سانیٹ، ترائیلے، شاعری کے نئے تجربات تروینی، نیم پابند غزل، تمثالیہ، مثلثات، کہہ مکرنی، چوبالا، کنڈلی، دوہکا اور بولیاں کے علاوہ حمد، نعت، سلام اور مرثیہ شامل ہے۔

نثر میں افسانہ، انشائیہ، ناول، سفرنامہ و رپورتاژ، طنز و مزاح، تنقید، اقبالیات، افسانے کی تنقید، اردو کی تنقیدی کتابیں، ادبی رسائل کے اداریے، تحقیق، تبصراتی تنقید، شخصیت نگاری، خود نوشت و یاد نگاری، رسائل کے خطوط، ادبی رسائل ایسے موضوعات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس میں رفتگان اور ایوارڈ یافتگان کا بھی ذکر ہے۔

ادب کہانی ۱۹۹۷ء میں چند ادبی شخصیات اور رسائل کا ذکر بار بار دکھائی دیتا ہے۔ انسان جن لوگوں کے ذہنی طور پر قریب ہوتا ہے ان کا تذکرہ بھی بار بار کرتا ہے۔

اگر اس بات پر حیرت کا اظہار کیا جائے کہ کیا ایک شخص کے لیے ایک برس میں اتنا زیادہ پڑھ لینا ممکن ہے؟ تو ہمیں ایک بار پھر ڈاکٹر انور سدید کو مثال کے طور پر پیش کرنا ہو گا اور کہنا پڑے گا "ہاں! ڈاکٹر انور سدید کے لیے ممکن ہے" اور یقیناً ادب کہانی ۱۹۹۷ء اردو ادب میں وسعت مطالعہ کی ایک تحریری مثال ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ اردو ادب کے وڈیرے جائزہ نگاری کو تسلیم کرنے کے لیے کس حد تک تیار ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جائزہ نگاری کا فن ترقی کر رہا ہے۔ گزشتہ دس پندرہ برس سے اس کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا ہے اور اب اس کی اہمیت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اسے دستاویز کا روپ دے دیا ہے۔

مستقبل کے مورخ گارساں دتاسی کی طرح ڈاکٹر انور سدید کے بھی ممنون ہوں گے اور وہ ان سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ ہر چند کہ اپنا عہد کبھی کسی صاحب علم کے لیے سازگار نہیں ہوتا۔

مجلّہ صوفی .... مسلم صحافت کے آئینے میں

منصور سہیل

محترمہ صبغہ فاروق کا تحقیقی کارنامہ "مجلّہ صوفی ...... مسلم صحافت کے آئینے میں" انتہائی علمی اور فکر انگیز کتاب ہے کہ اس میں تحریک پاکستان کے ابتدائی سالوں کے ایک ایسے مجلّے کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے جس نے اس ضمن میں مرکزی کردار ادا کیا۔ میرے خیال میں کسی محقق اور اہل علم کا یہ کردار قابل ستائش ہے کہ وہ تاریخ کے اوراق سے ایسے گہر پاروں کو منصۂ شہود پر لاتا ہے جو تاریخی ارتقا میں نہایت اہمیت کی حامل ہوں۔ ایک صدی قبل زیور طباعت سے آراستہ ہونے والے اس مجلّے کے ذریعے آج بھی ان مظلوم مسلمانوں کی آواز سنی جا سکتی ہے، جو بحیثیت قوم اپنے تشخص اور وجود کو منوا کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ایسے اہم موضوع پر تحقیق کر کے محقق نے لوگوں کو پاکستان میں صحافت کے پس منظر سے روشناس کرایا ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ مصنفہ کی سچی لگن اور پرخلوص نصب العین کی آئینہ دار ہے، جس میں کوئی منفعت کارفرما نہیں۔

میں اردو اکیڈمی لاہور کو ایک اہم موضوع پر تحقیق کرنے اور اسے عام لوگوں کے ساتھ ساتھ محققین، مورخین اور صاحب علم حضرات کے لیے کتابی صورت میں شائع کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔

اکادمی ادبیات کی اردو کتابیں اور رسائل

ڈاکٹر وحید قریشی

اکادمی ادبیات بنیادی طور پر ادیبوں کی فلاح و بہبود کا ایک ادارہ ہے۔ فرانس کی اکادمی ادبیات کو نمونہ بنا کر اس کا آغاز کرنا تھا لیکن ابتدا ہی سے ادارے کو وزارت تعلیم کا ایک ذیلی ادارہ بنا دیا گیا ہے اور اس کی شکل محض ایک ادبی انجمن کی ہو کر رہ گئی۔ ادارے کے پہلے ڈائریکٹر کچھ عرصے کے لیے احمد فراز تھے پھر وزارت تعلیم کے ایک جائنٹ سیکرٹری مسیح الدین صدیقی اس کے سربراہ بنے۔ چند برس وہ اس ادارے کے کرتا دھرتا رہے۔ پھر ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، ان کے بعد پروفیسر پریشان خٹک، پھر فخر الزماں اور ان کے بعد نذیر ناجی اور خالد اقبال یاسر یکے بعد دیگرے اس ادارے کے سربراہ رہے۔ آج کل افتخار عارف اس کے صدر نشین ہیں۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ادارے کی پالیسی میں تسلسل کا فقدان رہا۔ ہر چیئرمین کی اپنی ترجیحات تھیں۔ مطبوعات کے سلسلے میں بھی مسیح الدین صدیقی کے زمانے میں اہل قلم کانفرنس کی روداد یں شائع ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کے دور میں بھی یہی سلسلہ قائم رہا۔ پروفیسر پریشان خٹک صوبائی زبانوں کے اردو تراجم کے سلسلے میں سرگرم تھے چنانچہ ان کے زمانے میں پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی کی بعض اہم تصانیف کا ترجمہ ہوا۔ فخر زماں مزاحمتی ادب کے علم بردار تھے ان کے دور میں مزاحمتی ادب اور تراجم کا زور شور رہا۔ نذیر ناجی صاحب نے اس کا مزاج بدل کر زندہ مصنفین کی شخصیت اور ان کے فن پر کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جو افتخار عارف صاحب کے زمانے میں بند ہو گیا اس کی بجائے دوسرے رسائل میں شائع ہونے والی نگارشات کا انتخاب ''پاکستانی ادب'' کے نام سے چھاپنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ دوسرا سلسلہ جو کچھ عرصہ منقطع رہا تھا ''کتابیات پاکستانی ادب'' کے نام سے دوبارہ شروع کیا گیا۔ ۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۱ تک آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ۷ اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان میں ہر جلد میں پہلا حصہ اردو مطبوعات کے لیے وقف ہے۔ اس کے بعد دوسری صوبائی زبانوں کی کتابیات کو شریک کیا گیا ہے۔ کتاب کا ہر حصہ الگ الگ محقق کے سپرد کیا گیا۔ اردو کے حوالے سے ایک تسلسل ہے کہ اردو کتابیات ہر جلد میں ناصر زیدی صاحب نے تیار کی ہے۔

کتابیات پاکستانی ادب

ناصر زیدی نے بڑی کوشش سے اردو کتابوں کا سراغ لگایا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۵ء کی کتابیات میں ۷۶۲ کتابیں درج ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ان کی تحقیق کے مطابق اردو کی ۸۴۴ کتابیں چھپیں۔ جبکہ ۱۹۹۷ء میں ۶۰۳، ۱۹۹۸ء میں ۶۷۴، ۱۹۹۹ء میں ۸۲۶، ۲۰۰۰ء میں ۷۲۴ اور ۲۰۰۱ء میں ۸۶۱ کتب زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

تحقیقی اعتبار سے یہ کتابیات اردو مطبوعات کی رفتار کا صحیح اندازہ پیش کرتی ہیں جس میں ناصر زیدی کی محنت کی داد دیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ سائنٹفک نقطہ نظر سے تھوڑا سا تجزیہ کریں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کہیں فہرست سازی کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا گیا ہے۔ مثلاً کتابوں کی موضوع وار درجہ بندی کو لائبریری سائنس کے مطابق سائنٹیفک طریقہ سے درج نہیں کیا

گیا۔ ۱۹۹۸ء کی کتابیات کے ص ۵۲ پر کتاب ''علامہ اقبال بحیثیت نقاد'' تحقیقی تنقیدی مضامین کے تحت درج ہے حالانکہ اقبال کے لیے اقبالیات کا الگ عنوان موجود ہے۔ اسی طرح بعض کتابیں ثانوی ماخذ پر بھروسہ کر کے شامل متن کی گئی ہیں جس سے بعض اندراجات غلط درج ہو گئے ہیں۔ مثلاً پاکستانی ادب ۱۹۹۸ء میں صفحہ ۸۷ پر دیا گیا اندراج نمبر ۶۱۹ عبدالمجید سالک مصنف محمد حمزہ فاروقی درج ہے۔ حالانکہ حمزہ فاروقی نے عبدالمجید سالک کے افکار و حوادث کا دو جلدوں میں انتخاب کیا تھا۔ کتاب کا نام ''افکار و حوادث'' ہے مصنف عبدالمجید سالک ہیں اور مرتب حمزہ فاروقی۔ اسی کتاب کا اندراج صفحہ ۶۳ پر شگفتہ ادب کے تحت کیا گیا ہے لیکن یہاں ناشر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی بجائے انجمن ترقی اردو پاکستان درج ہے۔ یہی کتاب کتابیات ۱۹۹۹ء میں تحقیق اور تنقید مضامین کے تحت ''معرکہ زمیندار و انقلاب'' کے طور پر درج ہے حالانکہ یہی کتاب ''افکار و حوادث'' کی دوسری جلد ہے جس کا ذیلی عنوان ''معرکہ زمیندار و انقلاب'' تھا۔ نیز کتابیات پاکستانی ادب ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بعض کتابیں ایک سال کے بعد دوسرے سال میں بھی درج ہوتی چلی گئی ہیں۔ مثلاً کتابیات ۱۹۹۹ء میں اندراج نمبر ۳۱۳ پر کلیات مصطفیٰ زیدی اور اندراج نمبر ۳۰۹ پر کلیات صوفی تبسم کے اندراجات کتابیات ۲۰۰۰ء میں نمبر ۳۰۳ اور ۳۰۲ پر بھی موجود ہیں۔

کتابیات ایک اہم علمی خدمت ہے جسے جاری رہنا چاہیے۔ ایسے کام عام طور پر محققین کی پوری ٹیم کیا کرتی ہے۔ فرد واحد نے اسے انجام دے کر ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی کتابیات پر چھپنے سے پہلے نظر ثانی کرالی جائے تاکہ اس طرح کی غلطیاں درست ہو جائیں۔

مجلہ ادبیات شمارہ ۵۷ اور ۵۸

مجلہ ادبیات پہلے خالد اقبال یاسر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد افتخار عارف صاحب نے مدیروں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ شمارہ ۵۷ اور ۵۸ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ شمارہ ۵۷ کو آفتاب اقبال شمیم اور منشایاد نے ترتیب دیا ہے۔ شمارہ ۵۸ کے مدیر ظفر اقبال، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر ابرار احمد ہیں۔ رسالے کی ادارت کا یہ پنچائتی انداز شمارے کو تو خوبصورت بناتا ہے لیکن اس سے پرچے کا اپنا کوئی مزاج نہیں بن سکتا۔ یہ کام تو مستقل مدیر ہی انجام دے سکتا ہے۔ بہرحال موجودہ شکل میں ادبیات کے ان پرچوں کو الگ الگ کتابیں شمار کرنا ہوگا کیونکہ ان میں وہ تسلسل موجود نہیں جو کسی ادبی پرچے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

پاکستانی ادب نثر و شاعری ۲۰۰۰ اور پاکستانی ادب نثر و شاعری ۲۰۰۱ء

افتخار عارف صاحب نے جو سب سے اہم کارنامہ انجام دیا ہے وہ پاکستانی ادب کی اشاعت ہے۔ پاکستانی رسائل میں شائع ہونے والی بہترین نگارشات کو ہر سال دو دو جلدوں میں شائع کیا ہے یعنی نثر کا حصہ الگ اور شاعری حصہ الگ۔ یہ ایک معرکہ کا کام ہے اور قاری کو بہترین ادبی نمونے یک جا مل جاتے ہیں۔ خدا کرے کہ پاکستانی کتابیات اور پاکستانی ادب کے یہ سلسلے تواتر کے ساتھ جاری رہ سکیں۔ اس سے اکادمی ادبیات کی پہچان بھی بنے گی اور قاری کو بہترین ادبی نمونے یک جا طور پر بھی مل جائیں گے۔

افتخار عارف ایک متحرک ادیب ہیں اور سوچ کے نئے نئے زاویے پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے یہ دو کارنامے اکادمی ادبیات کے لیے نیک نامی کا باعث ہیں۔ کاش ایسے منصوبے چیئرمینوں کے بدلنے پر بھی قائم رہ سکیں اور ہر چیئرمین نئی پالیسی وضع کرنے کی بجائے ادارے کی پالیسیوں میں تسلسل کو اہمیت دے سکے تو یہ ادب کی خدمت بھی ہوگی اور ادیبوں کی بھی۔

میں ریڈیو کے لیے کس طرح لکھتا ہوں؟

کنہیالال کپور

میں ریڈیو کے لیے کس طرح لکھتا ہوں؟ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح آپ لکھتے ہیں، لیکن ممکن ہے کہ آپ ریڈیو کے لیے نہ لکھتے ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ہی بتانا پڑے، تو لیجیے۔ میں ریڈیو کے لیے بالکل اسی طرح لکھتا ہوں جس طرح مجھے ریڈیو والے لکھنے کے لیے کہتے ہیں۔ نکتہ اس انکشاف میں یہ ہے کہ جب تک ریڈیو والے آپ سے لکھنے کے لیے نہ کہیں آپ ریڈیو کے لیے لکھ ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ محض ادیب ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ ریڈیو کے لیے کبھی نہیں لکھ سکتے، یعنی آپ کی ادبی حیثیت ریڈیو والوں کی نگاہ میں صفر تسلیم کی جائے گی۔ ہاں اگر اس قسم کی غزلیں کہتے ہیں جن میں بت کم سن اور رقیب روسیاہ کا ذکر رہتا ہے یا ایسے افسانے لکھتے ہیں جو محبت کی واردات سے شروع ہو کر خودکشی کی واردات پر ختم ہوتے ہیں تو بلاشبہ آپ سے ریڈیو کے لیے لکھنے کی درخواست کی جائے گی۔

ایک اور بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ ریڈیو اسٹیشن تک آپ کی رسائی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب آپ ریڈیو اسٹیشن کے افسروں سے رسم و راہ پیدا کر لیں۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنے احباب کو ریڈیو کے محکمے میں ملازمت کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر آپ کا ایک دوست بھی اس محکمے میں ملازم ہو گیا تو جب تک اس کی ملازمت سلامت ہے آپ ریڈیو کے لیے لکھتے رہیں گے۔ بالفرض آپ کا کوئی دوست ریڈیو کی ملازمت کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تو پھر بہرحال آپ کو ان لوگوں کی باریابی ضرور حاصل کرنا ہوگی جو ریڈیو اسٹیشن پر خدایانا خدا کی حیثیت سے قابض ہیں۔ یعنی ڈائریکٹر، اسسٹنٹ ڈائریکٹر، پروگرام ایگزیکٹو وغیرہ۔ ڈائریکٹر سے ملاقات کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ کیونکہ خدا کا یہ برگزیدہ انسان عموماً ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ اس کے پاس ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو دو چار ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر عموماً دین و دنیا سے اس قدر بیزار رہتا ہے کہ اس سے ملاقات کرنے کے بعد ملاقاتی کچھ لکھنے کی بجائے خودکشی کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ اس لیے اگر آپ پروگرام ایگزیکٹو سے ملنے کی کوشش کریں تو بہتر ہوگا۔ پہلے ٹیلیفون پر اس سے ملاقات کا مناسب دن اور وقت دریافت کریں اور پھر دو چار انگریزی یا فرانسیسی ناول بغل میں داب کر اس کے دفتر میں جا دھمکیں۔ گفتگو اس قسم کی ہونی چاہیے۔

''آداب عرض ہے''۔

''مدت سے خواہش تھی کہ آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جائے''۔

''آپ تو اردو، ہندی، بنگالی اور گجراتی کے مانے ہوئے ادیب ہیں''۔

''یہ ناول جو آپ پچھلے پندرہ برس سے لکھ رہے تھے۔ اس کا پہلا باب آپ نے لکھ لیا یا ابھی اس کا پلان بنا رہے ہیں''۔

''جب سے آپ یہاں تشریف لائے ہیں پروگرام یقیناً بہتر ہو گئے ہیں اب تو کبھی کبھی تقریریں سننے کو بھی جی چاہنے لگا ہے''۔

''یہ پریم کور تو آپ کی دریافت معلوم ہوتی ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے اسے کوئی منہ نہیں لگاتا تھا''۔

''آپ نے یہ فرانسیسی ناول پڑھا۔ اگر آپ اسے گجراتی میں منتقل کریں تو کیسا رہے گا''؟

ان باتوں کے جواب میں اگر پروگرام ایگزیکٹو سمجھ دار ہے تو برابر مسکراتا رہے گا۔ اگر نہیں ہے تو شیخی بگھارنے لگے گا۔ آپ اس کی باتوں سے ذرہ بھر بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جایئے۔ اگر وہ کہے کہ فرصت ہی کتنی ملتی ہے کہ کوئی اپنے ناول کا پہلا باب مکمل کر سکے تو آپ کو فوراً کہنا چاہیے ''بجا ارشاد ہوا۔ یقیناً اگر آپ کسی اور محکمے میں ہوتے تو اس وقت تک دو درجن ناولوں کے مصنف ہوتے''۔ اگر وہ کسی جرمن یا جاپانی مصنف کا حوالہ دے جس کا تازہ ناول وہ پڑھ رہا ہے تو آپ دس بارہ فرضی ڈچ یا چینی مصنفوں کے نام گنوا دیجئے جن کے تمام ناول آپ پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس ملاقات سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آئندہ آپ پروگرام ایگزیکٹو کی نگاہ میں رہیں گے۔ اور وہ جب بھی نیا سلسلہ (Series) شروع کرے گا ایک آدھ تقریر آپ کو مل جائے گی۔

دوسری بات جو آپ کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے یہ ہے کہ ریڈیو والے ہمیشہ تقاریر کے سلسلے تجویز کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلہ ہوگا'' کیسے چلتی ہے'' اور اس میں تقاریر کے عنوانات ہوں گے:۔

۱۔ کھوٹی اٹھنی

۲۔ زنگ خوردہ بندوق

۳۔ بات سے بات

۴۔ پنڈت جی کی بہلی

۵۔ بدمزاج بیوی کی زبان

اب آپ اس پر نہ جایئے کہ یہ ''سلسلہ'' کتنا مضحکہ خیز ہے یا اس میں تقاریر کے عنوانات کتنے عجیب وغریب ہیں۔ بلکہ

ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

کے مصداق اسے نظر انداز کر دیجیے اور چپکے سے تقریر لکھ ڈالیے۔ اس ضمن میں ایک انکشاف آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ یہ کہ قریب قریب ہر ریڈیو اسٹیشن ایک ہی قسم کے سلسلے نشر کرتا ہے۔ اس لیے آپ غور سے ہر اسٹیشن کا پروگرام سنیے۔ کوئی نہ کوئی وہی تقریر نشر کر رہا ہوگا کہ جو آپ کو کرنا ہے۔ اس لیے آپ وہ ساری کی ساری تقریر نوٹ کر لیجیے اور پھر تاریخ مقررہ پر نشر فرما دیجیے۔

بعض اوقات تقاریر کے نئے سلسلے پر کسی مشہور شاعر کا کوئی چلتا ہوا مصرع چسپاں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

ے یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ۔

۱۔ ہم خاکروب ہوتے!

۲۔ ہم چڑی مار ہوتے!

۳۔ ہم سمجھ دار ہوتے!

..... یا ..... تنگدستی گر نہ ہو غالب

۱۔ بے حیائی ہزار نعمت ہے!

۲۔ روسیاہی ہزار نعمت ہے!

۳۔ بد دماغی ہزار نعمت ہے!

جب صورت حال یہ ہو تو آپ غالب کی روح سے معذرت کیے بغیر تقریر کا آغاز کر دیں۔ کیونکہ اگر آپ یہ سوچنے لگے کہ غالب مرحوم پر جنت میں کیا گزرے گی تو آپ تقریر نہیں کر سکیں گے۔

تقاریر کے علاوہ ریڈیو والے آپ سے فیچر اور ڈرامے بھی لکھواتے ہیں۔ فیچر ریڈیو کی خاص ایجاد ہے۔ اس کو عام طور پر وہ لوگ لکھتے ہیں جو فیچر سے بہتر چیز لکھنے کے اہل نہیں۔ چونکہ معاوضہ کافی ملتا ہے، اس لیے فیچر نویسی ہرگز خسارے کا سودا نہیں۔ فیچر موسموں، شہروں، کھیلوں اور گلہریوں پر لکھے جاتے ہیں۔ کسی خاص موسم پر فیچر لکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس موسم سے متعلق جتنے گیت، نظمیں اور غزلیں ملیں انہیں اکٹھا کر لیجیے اور پھر پانچ دس سطور خود لکھیے اور ایک سطر کے بعد دو تین بلکہ چار گیت نقل کرتے جائیے۔ مثلاً آپ کو ''بسنت'' پر فیچر لکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ آپ کو مندرجہ ذیل طبع زاد فقرے لکھنا ہوں گے۔

''بسنت! آہا بسنت! یعنی واہ واہ۔ بسنت کا موسم ہے۔ جدھر دیکھو ادھر بسنت۔ دائیں بائیں آگے پیچھے بسنت! ساتویں آسمان کے علاوہ ہر جگہ بسنت۔ ریڈیو اسٹیشن پر بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کو شاید یرقان ہو گیا ہے۔ اسی لیے انہیں ہر چیز پیلی پیلی نظر آ رہی ہے۔ وہ دیکھیے ارے وہ بسنتی کپڑوں میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں بسنت کے گیت گا رہی ہیں اور ادھر بدصورت لڑکے ان کا منہ چڑا رہے ہیں۔ آیئے یہاں سے کہیں دور بھاگ چلیں ورنہ ہمیں یہ گیت سننا پڑیں گے۔

اگر آپ کو کسی شہر پر فیچر لکھنا مقصود ہے تو یوں لکھیے:۔

''دلی ہندوستان کا دل ہے۔ ہندوستان ایشیا کا دل ہے۔ اور ایشیا خدا جانے کس کا دل ہے۔ بہر حال کسی کا ہوگا۔ دلی کئی بار اجڑی اور کئی بار بسی اور اب اجڑنے کا نام نہیں لیتی۔ دلی بہر حال دلی ہے۔ یعنی لکھنو یا ٹمبکٹو نہیں۔ دلی میں بڑے بڑے باکمال لوگ رہتے ہیں۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ سبھی باکمال۔ دلی کی گلیوں میں خاص کشش ہے۔ کیونکہ یہاں بارہ مسالے کی چاٹ بکتی ہے۔ اسی لیے تو انہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جائے بھی تو کوئی کہاں جائے۔ چاروں طرف دلی ہی دلی ہے۔ یہاں کا ہر فاقہ مست اپنے کو میر یا غالب سمجھتا ہے۔ اللہ اللہ خود فریبی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دلی شہر نہیں، بھول بھلیاں ہے۔ نئی دلی میں راستہ بھول جاؤ تو پرانی دلی میں جا پہنچو اور پرانی دلی میں راستے سے بھٹک جاؤ تو نئی دلی پہنچ جاؤ۔ دلی کی اہمیت تبھی تک ہے جب تک مہا دہلی وجود میں نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ''۔

اب رہے ریڈیو ڈرامے! ریڈیو ڈرامہ لکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ کبھی طبع زاد ڈرامہ لکھنے کی غلطی نہ کی جائے۔ اول تو پلاٹ ہی مشکل سے ملتا ہے۔ پلاٹ مل جائے تو مناسب کلائمیکس نہیں سوجھتا۔ کلائمیکس بھی سوجھ جائے تو اختتام کا مسئلہ اچھی خاصی الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ ان مشکلوں سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ کسی انگریزی انتخاب کی طرف رجوع کیجیے۔ جس کا نام ہو ''۱۹۵۵ء کے بہترین ناٹک''۔ ''انیسویں صدی کے مشہور ایک ایکٹ کے ڈرامے''۔

اس کتاب سے پلاٹ، کردار، زبان اڑا کر انہیں ہندوستانیت کا رنگ دے دیجیے۔ اگر اصل ڈرامے کا نام ہے ''کھٹے

انگور'' تو اب اس کا نام رکھ دیجیے ''میٹھا آلو بخارا'' لیجیے ڈرامہ تیار ہے۔ معمولی ترمیمیں تو ہوں گی ہی۔ مثلاً ہیرو کا نام ''ولیم'' کی بجائے ''ولی علیم'' ہوگا اور ہیروئن للی کی بجائے لیلیٰ کے نام سے پکاری جائے گی۔ اگر آپ ایسا ڈرامہ لکھ دیں گے تو نہ صرف ریڈیو والے آپ کی ذہانت کی داد دیں گے بلکہ مبلغ تیس روپے کا چیک بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ایک آخری بات اور یاد رکھیے۔ جب کبھی آپ ریڈیو پر تقریر کریں یا آپ کا لکھا ہوا کوئی فیچر یا ڈرامہ نشر کیا جائے تو اس سے اگلے دن آپ اپنے احباب کو لکھیں کہ وہ آپ کی تقریر، ڈرامے یا فیچر کے بارے میں تعریفی خطوط ریڈیو اسٹیشن ڈائریکٹر کے نام بھجوائیں اگر ہو سکے تو چھ سات خطوط آپ خود لکھ کر فرضی ناموں کے تحت ڈائریکٹر صاحب کو بھجوا دیں۔ مضمون یہ ہونا چاہیے:

''محترمی!

بڑی مدت کے بعد آپ کے اسٹیشن سے ایک اچھا فیچر سننے کو ملا۔ میری مراد ''میرؔ معلوم ہے قلندر تھا'' سے ہے۔ ملنگ شمشانوی صاحب نے میرؔ کی قلندری کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے وہ بعینہ میرؔ کے اپنے الفاظ ہی ہیں۔ امید ہے آپ یہی فیچر دوبارہ بلکہ سہ بارہ سنوائیں گے۔ ہاں اگر مناسب سمجھیں تو ملنگ صاحب سے کہیں کہ ایک فیچر ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' پر آپ کو لکھ کر دیں۔

تو لیجیے یہ ہے ریڈیو کے لیے لکھنے کی تکنیک۔ اللہ توفیق دے تو آپ بھی ریڈیو کے لیے لکھا کیجیے، دلچسپ شغل ہے اور پھر جیسا کہ ملنگ صاحب نے کہا ہے۔ ''آم کے آم گٹھلیوں کے دام''۔

جنتری نئے سال کی

ابن انشا

ع آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج

یعنی بلبل بولتا تھا یا بولتی تھی تو لوگ جان لیتے تھے کہ بہار آئی ہے۔ ہم نئے سال کی آمد کی فال جنتریوں سے لیتے ہیں۔ ابھی سال کا آغاز دور ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مشہور عالم جنتریاں دوکانوں پر آن موجود ہوتی ہیں۔ بعض لوگ جنتری نہیں خریدتے۔ خدا جانے سال کیسے گزارتے ہیں؟ اپنی قسمت کا حال اپنے خوابوں کی تعبیر، اپنا ستارہ (چاند سورج وغیرہ بھی) کیسے معلوم کرتے ہیں؟ سچ یہ ہے کہ جنتری اپنی ذات سے ایک قاموس ہوتی ہے۔ ایک جنتری خرید لو اور دنیا بھر کی کتابوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ فہرست تعطیلات اس میں، نماز عید، اور نماز جنازہ پڑھنے کی تراکیب، جانوروں کی بولیاں، دائمی کیلنڈر، محبت کے تعویذ، انبیائے کرام کی عمریں، اولیائے کرام کی کرامتیں، لکڑی کی پیمائش کے طریقے، کون سا دن کس کام کے لیے موزوں ہے۔ فہرست عرس ہائے بزرگان دین، صابن سازی کے گر، شیخ سعدی کے اقوال، چینی کے برتن توڑنے اور شیشے کے برتن جوڑنے کے نسخے، اعضا پھڑکنے کے نتائج۔ کرۂ ارض کی آبادی، تاریخ وفات نکالنے کے طریقے۔ یہ محض چند مضامین کا حال ہے۔ کوزے میں دریا بند ہوتا ہے اور دریا میں کوزہ۔ یوں تو سبھی جنتریاں مفید مضامین کی پوٹ ہوتی ہیں، جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے لیکن روشن ضمیر جنتری (جیسی) کو خاص شہرت حاصل ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اسی کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔

ایک باب اس میں ہے ''کون سا دن کون سے کام کے لیے موزوں ہے''

ہفتہ: سفر کرنے، بچوں کو سکول میں داخل کرانے کے لیے۔

اتوار: شادی کرنے، افسروں سے ملاقات کرنے کے لیے۔

بدھ: نیا لباس پہننے، غسل صحت کے لیے

جمعرات: حجامت بنانے، دعوت احباب کے لیے

جمعہ: غسل اور شادی وغیرہ کرنے کے لیے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ لوگ اندھا دھند جس دن جو کام چاہیں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ جنتری سب کے پاس ہو تو زندگی میں انضباط آ جائے۔ ہفتے کا دن آیا اور سبھی لوگ سوٹ کیس اٹھا کر سفر پر نکل گئے۔ جو نہ جا سکے وہ بچوں کو اسکول میں داخل کرانے پہنچ گئے۔ اس سے غرض نہیں کہ اسکول کھلے ہیں یا نہیں یا کسی کے بچے ہیں بھی کہ نہیں۔ جدھر دیکھو بھیڑ لگی ہے۔ اتوار کو ہر گھر کے سامنے پھولداریاں تنی ہیں اور ڈھولک بج رہی ہے۔ لوگ سہرے باندھنے کے بعد جنتری ہاتھ میں لیے افسروں سے ملاقات کرنے چلے جا رہے ہیں۔ بدھ کو سبھی حماموں میں پہنچ گئے اور جمعرات کو لوگوں نے حجامت بنوائی اور دوستوں کے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں کہ ہمارے ہاں آ کر دعوت کھا جائیو۔ جمعہ کو نکاح ثانی کا نمبر ہے۔ جو لوگ اس منزل سے گزر چکے ہوں وہ دن بھر نل کے

نیچے بیٹھ کر نہائیں کہ ستاروں کا حکم یہی ہے۔

ہم جو خواب دیکھتے ہیں وہ بالعموم عام قسم کے ہوتے ہیں اور صبح تک یاد بھی نہیں رہتے۔ جنتری سے معلوم ہوا کہ خوابوں میں بھی بڑے تنوع کی گنجائش ہے۔ خواب میں پھانسی پانے کا مطلب ہے بلند رتبہ حاصل ہونا۔ افسوس کہ ہم نے خواب تو کیا اصل زندگی میں بھی کبھی پھانسی نہ پائی۔ بلند مرتبہ نہ مل سکنے کی اصل وجہ اب معلوم ہوئی۔ من نہ کردم شما حذر بکنید۔ اسی طرح گھوڑا دیکھنے کا مطلب ہے دولت حاصل کرنا۔ قیاس کہتا ہے کہ مطلب وکٹوریہ کے گھوڑے سے نہیں ریس کے گھوڑے سے ہے۔ خچر دیکھنے سے مراد ہے سفر پیش آنا۔ جو لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں ان کو ہوائی جہاز دیکھنا چاہیے۔ بلی کا پنجہ مارنا بیماری کے آنے کی علامت ہے۔ سانپ کا گوشت کھانا دشمن کا مال حاصل ہونے کی۔ خواب میں کان میں چیونٹی گھس آئے تو سمجھیے موت قریب ہے۔ (خواب کے علاوہ گھس آئے تو چنداں حرج نہیں، سرسوں کا تیل ڈالیے نکل آئے گی) اپنے سر کو گدھے کا سر دیکھنے کا مطلب ہے عقل کا جاتا رہنا۔ یہ تعبیر ہم خود بھی سوچ سکتے تھے۔ کوئی آدمی اپنے سر کو گدھے کا سر (خواب میں بھی) دیکھے گا، اس کے متعلق اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ خواب میں مردے سے مصافحہ کرنے کی تعبیر ہے درازیٔ عمر، خدا جانے یہاں عمر فانی سے مراد ہے یا عمر جاودانی سے۔

ایک باب اس میں جسم کے اعضا کے پھڑکنے اور ان کے عواقب کے بارے میں بھی ہے۔ آنکھ پھڑکنا تو ایک عام بات ہے۔ رخسار، شانہ راست، گوش چپ انگشت چہارم، زبان، گلا، گردن،، بجانب چپ، ٹھوڑی، بغل راست وغیرہ ان پچاسی اعضا میں سے ہیں جن کے پھڑکنے پر نظر رکھنی چاہیے۔ ان میں سے بعض کے نتائج ایسے ہیں کہ ہم نقل کر دیں تو فحاشی کی زد میں آ جائیں۔ ایک دو امور البتہ فاضل مرتبین نظر انداز کر گئے۔ نگہ انتخاب کی پسلی پھڑک اٹھنا استادوں کے کلام میں آیا ہے۔ اس کا نتیجہ نہیں دیا گیا۔ ہماری رگ حمیت بھی کبھی کبھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے عواقب کی طرف بھی یہ جنتری رہنمائی نہیں کرتی۔ یہ نقائص رفع ہونے چاہئیں۔

یہ معلومات تو شاید کہیں اور بھی مل جائیں لیکن اس جنتری کا مغز محبت کے عملیات اور تعویزات ہیں جو حکیمی تاثیر رکھتے ہیں۔ قیس میاں کی نظر سے ایسی کوئی جنتری گزری ہوتی تو جنگلوں میں مارے مارے نہ پھرتے۔ ایک نسخہ حاضر ہے:

''محبت کے مارے کو چاہیے کہ ۱۲ مارچ کو بوقت ایک گھڑی بعد طلوع آفتاب مشرق کی طرف منہ کر کے نقش ذیل کو نام مطلوب بمع والدہ مطلوب الو کے خون سے لکھ کر اپنے دہنے بازو پر باندھے اور مطلوب کو ۲۰ مارچ بوقت صبح ایک گھڑی ۴۵ پل پر بعد طلوع آفتاب اپنا سایہ دے۔ مطلوب فوراً مشتاق ہو جائے گا۔

۹۱، ۱۱ م و م ۱۰ ع ۱۱ ع ۱۱

نام مطلوب مع والدہ مطلوب، اپنا نام مع نام والدہ

یہاں بعض باتیں جی میں آتی ہیں۔ اگر مطلوب یا محبوب بات نہیں کرتا تو اس کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں کے نام کیسے معلوم کیے جائیں؟ پھر الو کیسے پکڑا جائے اور ۲۰ مارچ کو بوقت صبح عین ایک گھڑی ۴۵ پل بعد طلوع آفتاب مطلوب کو کیسے مجبور کیا جائے کہ طالب کے سائے میں آئے۔ ان باتوں کا اس جنتری میں کوئی ذکر نہیں۔ ہاں جنتری کے پبلشر نے جنتر منتر مکمل نامی جو کتاب بقیمت چھ روپے شائع کی ہے اس میں ان کی تفصیل ملے گی۔

جو لوگ ہماری طرح تن آسان ہیں۔ محبت میں اتنا کشٹ نہیں اٹھا سکتے ان کے لیے مرتب جنتری نے کچھ آسان ترعمل بھی دیئے ہیں۔ جن کی بدولت محبوب قدموں پر تو آ کر خیر نہیں گرتا لیکن مائل ضرور ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تعویذ ہے جسے ہر

روز کاغذ کے چالیس ٹکڑوں پر لکھ کر اور نیچے طالب و مطلوب کے نام درج کر کے آٹے کی گولیوں میں لپیٹ کر دریا میں ڈالنا چاہیے اور چالیس دن تک یہی کرنا چاہیے۔ ہم نے حساب لگایا ہے از راہ کفایت آدھے تولے کی گولی بھی بنائی جائے تو ایک پاؤ روزانہ یعنی دس سیر آٹے میں محبوب کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرت اس میں بھی خست کریں اور اپنی محبت کو بالکل پاک رکھنا چاہیں وہ ایک اور عمل کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ ''جب بھی محبوب سامنے آئے آہستہ سے دل میں بسم اللہ الصمد، دس بار پڑھیں اور آخر میں محبوب کی طرف منہ کر کے پھونک ماریں۔ اس طرح کہ منہ کی ہوا اس کے کپڑوں کو چھو سکے۔ پندرہ بیس مرتبہ ایسا کرنے سے اس کے دل میں قرار واقعی محبت پیدا ہو جائے گی''۔

یہ عمل بظاہر تو آسان معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا آسان بھی نہیں۔ اول تو محبوب کو اتنی دیر سامنے کھڑا رہنے پر مجبور کرنا کہ آپ دس بار عمل پڑھ کر پھونکیں مار سکیں اور وہ بھاگے نہیں، اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ پھر آپ جو پھونکیں ماریں گے اس کی بنا پر محبوب کیا رائے قائم کرے گا، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ شوقین مزاج ان دونوں سے قطع نظر کر کے ''محبت کا سرمہ'' استعمال کر سکتے ہیں۔ جس کا بنانا تھوڑی محنت تو ضرور لے گا لیکن اس کا جادو بھی عالمگیر ہے۔ یعنی صرف محبوب ہی پر کاری اثر نہیں کرتا بلکہ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ یہ سرمہ ڈال کر ''جس کی طرف بھی صبح سویرے دیکھے وہی محبت میں مبتلا ہو جائے گا''۔

یہ سرمہ بنانے کے لیے حاجت مند کو ۱۹ فروری کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ''اس روز وہ بوقت طلوع آفتاب پرانی داتن کو جلا کر اس کی راکھ میں چمگادڑ کا خون ملائے اور اس سے یہ نقش بوقت صبح ایک گھڑی ۱۵ پل بعد طلوع آفتاب لکھے اور اس پر سورۃ فلق گیارہ سو بار پڑھے۔ پھر نئے چراغ میں روغن کنجد (تل کا تیل) ڈال کر جلائے اور اس کی سیاہی آنکھوں میں ڈالے'' حسب ہدایت ایک صاحب نے یہ سرمہ دنبالہ دار لگایا تھا۔ اتنا ہم نے بھی دیکھا کہ محبوب انہیں دیکھتے ہی ہنس دیا۔ آگے کا حال ہمیں معلوم نہیں۔

یہی نہیں، صابن اور تیل تیار کرنے، بوٹ پالش بنانے، کھٹمل اور مچھر مارنے اور مشہور عام ادویہ کی نقلیں تیار کرنے کی ترکیبیں بھی اس میں درج ہیں۔ لوگ اگر شکایت کرتے ہیں کہ اردو میں کوئی انسائیکلو پیڈیا نہیں، معلومات کی کتاب نہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کیا ہوتی ہے؟ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ ہم نے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا وغیرہ دیکھی ہیں الم غلم مضامین کا طومار ہے، اہل دل کے مطلب کی ایک بات بھی نہیں۔ نہ نسخے نہ تعویذ نہ عرسوں کی تاریخیں نہ محبت کے عملیات نہ خواب نہ خوابوں کی تعبیریں۔ ہمارا یہ دستور ہو گیا ہے کہ باہر کی چیز کو ہمیشہ اچھا جانیں گے، اپنے ہاں کے سونے کو بھی مٹی گردانیں گے۔

قائداعظم لائبریری کی عمارت
تہذیب وثقافت کا گہوارہ

عباس چغتائی

باغ جناح میں واقع قائداعظم لائبریری لارنس ہال اور منٹگمری ہال کی تاریخی عمارات میں قائم کی گئی ہے۔ لارنس اور منٹگمری ہال لاہور کی سماجی وثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے مراکز رہے ہیں۔ یہ عمارتیں برطانوی عہد میں تعمیر ہونے والی پنجاب کی اولین عمارتوں میں شمار ہوتی ہیں۔ لارنس ہال کا رخ مال روڈ کی جانب جبکہ منٹگمری ہال کا رخ باغ جناح کے وسطی حصے کی طرف ہے۔ منٹگمری ہال اس زمانے میں ہندوستان کا سب سے بڑا ہال تھا، جو ''منٹگمری ہال اینڈ پکچر گیلری'' کے نام سے مشہور تھا[1]۔ یہ دونوں ہال ابتدا میں دو الگ الگ اور مکمل یونٹ تھے، تاہم پھر ان دونوں عمارتوں کو ایک مرکزی برآمدے کے ذریعے ملا دیا گیا تھا۔

لارنس ہال ۱۸۶۳ء کے اختتام پر تعمیر ہوا[2]، تاہم لاہور کی تاریخ مرتب کرنے والے مقامی اور یورپی تاریخ نگاروں کپلنگ اینڈ تھارنٹن[3]، سید محمد لطیف[4] اور نذیر احمد چوہدری[5] نے لارنس ہال کا سن تعمیر ۶۲-۱۸۶۱ء جبکہ ہیرلڈ لی[6] اور کنہیا لال ہندی[7] نے محض ۱۸۶۲ء بیان کیا ہے، لیکن دستاویزی ریکارڈ سے اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ ۱۲ر اپریل ۱۸۶۳ء کو گورنر پنجاب نے ایک کمیٹی تشکیل دی جسے زیر تعمیر لارنس ہال کی دیکھ بھال اور دیگر انتظامی امور سونپے گئے[8]، نیز لارنس ہال کے ٹھیکیدار محمد سلطان نے سیکرٹری حکومت پنجاب کو ۱۵ر جولائی ۱۸۶۳ء کو ایک خط میں ہال کی تعمیر میں تاخیر کی وجوہات بیان کرتے ہوئے یقین دلایا کہ مذکورہ ہال گورنر پنجاب سر رابرٹ منٹگمری کے لاہور واپس آنے تک مکمل ہو جائے گا[9]۔ یہ ہال سرجان لارنس (۴ر مارچ ۱۸۱۱ء۔ ۲۷ر جون ۱۸۷۹ء) کی یاد میں بنایا گیا۔

سرجان لارنس جن سے لارنس ہال منسوب ہے، نے تقریباً ۱۳ سال پنجاب میں خدمات سرانجام دیں۔ جب ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تو انہوں نے حکومتی انتظام چلانے کے لیے ایک بورڈ آف ایڈمنسٹریشن قائم کیا[10]۔ سر ہنری لارنس جو جان لارنس کے بڑے بھائی تھے، اس بورڈ کے صدر اور سرجان لارنس ممبر بنے۔ یہ بورڈ ۱۸۵۳ء میں ختم کر دیا گیا تو نئے نظام کے تحت پنجاب کو چیف کمشنر صوبے کا درجہ ملا۔ لارڈ ڈلہوزی نے سرجان لارنس کو صوبہ پنجاب کا پہلا چیف کمشنر نامزد کیا[11]۔ وہ ۱۸۵۸ء تک پنجاب کے چیف کمشنر رہے۔ جب پنجاب کو یکم جنوری ۱۸۵۹ء سے لیفٹیننٹ گورنر صوبے کا درجہ ملا[12]، تو سرجان لارنس کو پنجاب کا پہلا لیفٹیننٹ گورنر ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا[13]، تاہم ناسازی طبع کے باعث ۲۵ر فروری ۱۸۵۹ء کو انہوں نے گورنر کے عہدے کو خیرباد کہا اور انگلستان لوٹ گئے۔ سرجان لارنس ۱۲ر جنوری ۱۸۶۴ء کو گورنر جنرل اور وائسرائے ہند کی حیثیت سے ایک مرتبہ پھر ہندوستان آئے اور ۱۲ر جنوری ۱۸۶۹ء تک بڑے انہماک سے فرائض منصبی ادا کرتے رہے[14]۔ بہرحال سرجان لارنس کا خاص کارنامہ لاہور کی بادشاہی مسجد، جسے سکھ دور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مسلمانوں سے چھین کر شاہی قلعے کے ساتھ

اپنے حرم کا حصہ بنالیا تھا، کو ۱۸۵۶ء میں مسلمانوں کی درخواست پر واگزار کرنا ہے۱۵۔ اس بات سے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ اٹھی تھی اور انہوں نے شکرانے کے نوافل ادا کر کے سرجان لارنس اور ان کی حکومت کے لیے اجتماعی دعائیں کی تھیں۔

سرجان لارنس کی خدمات کے اعتراف میں بنے لارنس ہال کے لیے رقم کا بندوبست ہندوستان میں مقیم یورپی افراد اور مقامی امراء نے ایک فنڈ قائم کر کے کیا۔ عمارت کا ڈیزائن آرکیٹیکٹ مسٹر جی سٹون نے تیار کیا۱۶۔ ۶۵×۳۲٫۵ فٹ کی اس عمارت پر کل ۳۴ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ ۱۵/اکتوبر ۱۸۶۴ء کو سرجان لارنس وائسرائے ہند کی حیثیت سے بذریعہ ٹرین ۱۸ لاہور پہنچے اور ۱۷/اکتوبر ۱۸۶۴ء کو پیر کے روز شام کے وقت ۱۹ لارنس ہال کی عمارت کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ اس موقع پر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر رابرٹ منٹگمری بھی ان کے ہمراہ تھے۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سرجان لارنس نے پنجاب میں اپنے دور حکمرانی کی یادوں کو تازہ کیا اور کہا کہ مجھے پنجاب میں آ کر بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے۲۱۔

ہال کے علاوہ سرجان لارنس کا مجسمہ بھی مال روڈ پر نصب رہا۔ سرجان لارنس کا مجسمہ جسے سر ایڈگر بوہم (Edgar Boehm) نے بنا کر لاہور کارپوریشن کے حوالے کیا تھا۲۲، کی رونمائی گورنر پنجاب سر چارلس ایچیسن نے مارچ ۱۸۸۷ء میں کی۔ اسے مال روڈ پر لاہور ہائی کورٹ کی عمارت کے آگے نصب کیا گیا۔ یہ مجسمہ ۲۵ سال تک اسی جگہ لگا رہا۔ بعد ازاں ۱۹۲۳ء میں اس مجسمے کو ہٹا کر ٹاؤن ہال منتقل کر دیا گیا۔

منٹگمری ہال کی عمارت ۱۸۶۷ء کے اختتام پر مکمل ہوئی۔ اس ہال کا سن تعمیر بھی لاہور کی تاریخ مرتب کرنے والے یورپی و مقامی تاریخ نگاروں نے ۱۸۶۶ء لکھا ہے جن میں کپلنگ اینڈ تھارنٹن، سید محمد لطیف، نذیر احمد چوہدری اور کنھیا لال ہندی شامل ہیں، مگر سرکاری ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہال ۱۸۶۷ء کے اختتام پر مکمل ہوا۲۳۔ اس عمارت کے لیے ایک لاکھ دس ہزار کی رقم ۲۴ پنجاب کے مقامی رؤسا، راجوں، مہاراجوں اور والیان ریاست نے بذریعہ چندہ فراہم کی ۲۵۔ چندہ دینے والوں کی ایک طویل فہرست عمارت کے اندر نصب پتھر کی تختی پر کندہ ہے۔ یہ ہال سر رابرٹ منٹگمری (۱۸۸۷ء۔۱۸۰۹ء) کی یاد میں بنایا گیا جو پنجاب کے دوسرے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ سرجان لارنس کے بعد انہوں نے ۲۵/فروری ۱۸۵۹ء کو گورنر کا عہدہ سنبھالا۔ انہی کے عہد حکومت میں قدیم لاہور کے گرد سرکلر باغ بنایا گیا اور باغ کو سیراب کرنے کے لیے نہر نکالی گئی ۲۶۔ لاہور میں پہلا ضلع سکول (۱۸۶۱ء) اور گورنمنٹ کالج لاہور (۱۸۶۴ء) بھی انہی کے عہد میں دھیان سنگھ کی حویلی (واقع ہیرا منڈی لاہور) میں قائم ہوئے۔ سر رابرٹ منٹگمری کو بھی خرابی صحت کے باعث ۱۰/جنوری ۱۸۶۵ء کو استعفیٰ دینا پڑا ۲۷، تاہم وہ ۱۸۶۸ء سے اپنی وفات ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء تک کونسل آف انڈیا کے رکن رہے ۲۸۔

منٹگمری ہال کی تعمیر کے بعد پنجاب کے امراء، رؤساء اور دیگر اہم شخصیات جن کی کل تعداد ۶۸ تھی نے گورنر پنجاب سر ڈونلڈ میکلوڈ کی وساطت سے یہ ہال لندن میں موجود سابق گورنر پنجاب سر رابرٹ منٹگمری کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے اپنی یاد میں بنے اس ہال کو قبول کرتے ہوئے ۷/جون ۱۸۷۰ء کے اپنے جوابی خط بنام ٹی۔ ایچ تھارنٹن، سیکرٹری حکومت پنجاب میں اس ہال کو سرکاری امور کے لیے وقف کیا اور گورنر پنجاب سے کہا کہ وہ اس ہال کو حکومت پنجاب کے زیر انتظام رکھنے کی اجازت دیں۔ انہوں نے پنجاب کے ۶۸ سرکردہ افراد کی جانب سے بھیجے گئے ''خطاب'' اور اپنے جواب کو سرکاری ریکارڈ پر لانے کی بھی خواہش ظاہر کی۔ جس پر سیکرٹری حکومت پنجاب نے ۱۱/اگست ۱۸۷۰ء کو مسٹر ڈبلیو۔ جی۔ ڈیویز، کمشنر لاہور کو لکھا کہ وہ لاہور کارپوریشن کو تجویز کریں کہ پنجاب کے امراء و رؤساء کا ''خطاب'' اور سر رابرٹ منٹگمری کا جواب پتھر کی تختی پر لکھوا کر منٹگمری

ہال میں نمایاں جگہ پر لگایا جائے۔ سر رابرٹ منٹگمری نے جواب کے ہمراہ ''خطاب'' پیش کرنے والوں کے لیے انفرادی طور پر بھی انگریزی اور اردو زبانوں میں شکریہ کے خطوط بھجوائے جو متعلقہ اشخاص تک پہنچا دیے گئے ۲۹۔

منٹگمری ہال کی ۱۰۶×۴۶ فٹ کی عمارت کا ڈیزائن آرکیٹیکٹ مسٹر گارڈن نے تیار کیا تھا ۳۰۔ اس عمارت کی تعمیر ٹھیکیدار لالہ میلہ رام کے ذریعے ہوئی، لیکن چھت میں عیب ظاہر ہونے پر ۱۸۷۵ء کے اختتام پر کنہیالال ہندی سے چھت دوبارہ تعمیر کرائی گئی۔ کنہیالال ہندی لکھتے ہیں کہ ''... منٹ گمری ہال کی چھت اول مسٹر گارڈن صاحب انجنیئر نے لالہ میلا رام کی ٹھیکیداری میں قالبوتی خشتی بنوائی تھی، وہ ناقص رہ گئی اور چھت میں دراڑ آ گئی۔ اس لیے سرکار سے مولف کتاب اس کی درستی پر مامور ہوا اور پہلی چھت اتار کر مولف نے نمونہ حال کی چھت سنہ ۱۸۷۵ء کے اخیر میں بنا کر تیار کر دی جس کو دیکھ کر حکام نے پسند فرمایا۔ اب بھی (۱۸۸۴ء) یہ مکان زیر نگرانی مولف کے ہے اور سالانہ ضروری مرمت اس کی معرفت میونسپل کمیٹی لاہور کے ہوتی ہے'' ۳۱۔ دوسری مرتبہ چھت تعمیر ہونے اور دیگر مرمتوں پر ۶۶ ہزار روپے خرچ اٹھا ۳۲۔ یوں منٹگمری ہال کی کل لاگت ایک لاکھ چھہتر ہزار روپے ہو جاتی ہے۔

لارنس اور منٹگمری دونوں ہالوں کے استعمال کے لیے حکومت پنجاب کی منظوری سے قواعد وضوابط بھی مرتب کیے گئے تھے جو یکم اکتوبر ۱۸۷۰ء سے نافذ العمل ہوئے۔ ان قواعد کی رو سے خیراتی اور سرکاری مقاصد کے لیے ان ہالوں کا استعمال بلا معاوضہ تھا جبکہ ڈانس پارٹی، محفل موسیقی، تھیٹر، طعام اور دیگر تفریحی تقریبات کے لیے طے شدہ معاوضہ وصول کیا جاتا تھا۔ لارنس ہال کے لیے ۲۵ روپے، منٹگمری ہال کے لیے ۳۵ روپے اور دونوں ہالوں کے استعمال پر رعایتی معاوضہ ۵۰ روپے مقرر تھا۔ فرنیچر کا کرایہ اس سے الگ تھا جو استعمال ہونے والے فرنیچر کی حالیہ قیمت کا تین فیصد ہوتا تھا۔ کرایے پر لینے والا اس کے ہر طرح کے نقصان کا بھی ذمہ دار تھا۔ عام شرائط پر ہالوں کے استعمال کی منظوری دینے کا اختیار مینجمنٹ کمیٹی کے سیکرٹری کو تھا جو تحریری درخواست پر منظوری دینے کا مجاز تھا تاہم معاوضے میں کمی یا معافی کا معاملہ اس کے اختیار سے باہر تھا۔ ایسے معاملات فرد واحد نہیں بلکہ پوری کمیٹی کے سامنے پیش کیے جاتے تھے ۳۳۔

یہ ہال باغ جناح جیسے صحت افزاء مقام کے بالکل ساتھ بنائے گئے۔ باغ جناح جس کا پرانا نام لارنس گارڈنز تھا، اسے ''لارنس ہال گارڈنز'' اور ''کنٹنگنٹ گارڈن'' بھی کہا جاتا رہا ۳۴۔ یہ منصوبہ ۱۸۶۰ء میں شروع کیا گیا۔ یہ شروع میں ۱۱۱۲ ایکڑ رقبے تک وسیع تھا۔ باغ سے قبل یہ جگہ بالکل ویران تھی۔ آغاز کار میں کل رقبے کا صرف ایک حصہ باغ کے طور پر تیار کیا گیا۔ ۱۸۷۸ء میں نیلے کی جانب والے حصے کو بھی باغ میں شامل کر لیا گیا۔ اس باغ کی زمین لاہور کے قدیم باغات یعنی بادامی باغ اور سولجر گارڈن کو فروخت کر کے خریدی گئی ۳۵۔ لارنس گارڈن پر اٹھنے والے اخراجات یورپین افراد اور لاہور کارپوریشن مل کر اٹھاتے تھے اور حکومت پنجاب دونوں کی کل رقم کے مساوی امداد فراہم کرتی تھی ۳۶۔ لارنس گارڈن میں فسٹ پنجاب والنٹیر (۱۸۶۱ء) کی پہلی فائرنگ رینج بھی قائم تھی، جسے بعد میں ملتان روڈ پر منتقل کر دیا گیا۔ اس رینج کے تین سیکشن تھے جو تین سو گز، چھ سو گز اور آٹھ سو گز پر مشتمل تھے۔ ۱۹۲۴ء میں یہاں مڈ ڈیز گن (Mid days gun) بجانے کا انتظام بھی کیا گیا، جو پہلے اس مقام پر بجائی جایا کرتی تھی جہاں آج کل اولڈ کیمپس میں کیمیکل لیبارٹری کی عمارت واقع ہے۔ اس کے بعد یہ مال روڈ پر ٹیلی گراف آفس میں منتقل ہوئی اور پھر اس کا سلسلہ اس باغ میں شروع رہا ۳۷۔ اس باغ کا ایک حصہ ایگری ہارٹیکلچر سوسائٹی کو بھی دیا گیا، جس نے یہاں بوٹینیکل گارڈن بنایا۔ بیسویں صدی کی ابتدا تک یہ باغ چیرنگ کراس تک پھیلا ہوا تھا ۳۸۔ مال روڈ پر

نیو موزیک لاج کی عمارت ۱۹۱۶ء میں لارنس گارڈنز کی زمین پر ہی بنائی گئی۔ اس باغ کو باری دوآب کی ایک شاخ سے سیراب کیا جاتا تھا۔ اس میں تقریباً ۸۰ ہزار درخت اور ۶۰۰ مختلف اقسام کے پودے لگائے گئے۔ آسٹریلین گم کے علاوہ شام اور شمالی یورپ سے درخت درآمد کر کے اس باغ کی زینت بنائے گئے۔۳۹

یہ دونوں ہال لاہور کی سب سے شاندار سڑک مال روڈ پر واقع ہیں۔ لاہور کا مال روڈ ۱۸۵۱ء میں بنایا گیا۔ اس وقت اسے انارکلی تا میاں میر ڈائریکٹ روڈ کا نام دیا گیا۴۰۔ ۱۲۵ سال قبل کا مال روڈ کچھ اس طرح تھا کہ کینٹ کی جانب سے انارکلی آتے ہوئے نہر کے بعد دونوں جانب کھلے میدان تھے۔ بائیں جانب راجہ پٹیالہ کا بنگلہ تھا۔ اسی جانب تھوڑا آگے کی طرف لارنس گارڈن اور لارنس و منٹگمری ہال واقع تھے۔ سڑک کی دوسری جانب گورنر ہاؤس تھا۔ گورنر ہاؤس سے آگے ایک بنگلہ جو اروندل (Arundal) کہلاتا تھا واقع تھا۔ اس بنگلے میں آر۔ برٹن کے علاوہ اور کئی سرکاری و غیر سرکاری شخصیات قیام پذیر رہیں۔ کشمیر روڈ اور اروندل کے درمیان ایک پلاٹ تھا جو برٹن گارڈن کے نام سے مشہور تھا۔ اس سے آگے اولڈ پنجاب کلب واقع تھا، جس کے عقب میں ریکٹ کورٹ تھا۔ ایجرٹن روڈ کا پرانا نام ریکٹ کورٹ روڈ تھا، اب یہاں واپڈا ہاؤس بنا ہوا ہے۔ اس سڑک کی دوسری جانب کوئی عمارت نہ تھی، جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ نیو موزیک لاج کی عمارت اس جگہ ۱۹۱۶ء میں بنائی گئی۔ چیرنگ کراس سے لے کر ہال روڈ تک کوئی قابل ذکر عمارت موجود نہ تھی۔ جی پی او چوک کے قریب چند بنگلے موجود تھے۔ مزار شاہ چراغ کے ساتھ اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کا دفتر تھا۔ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس کی دوسری جانب میسرز رچرڈسن اینڈ کمپنی کا دفتر تھا، جو میسرز پولیمر اینڈ کمپنی کا ابتدائی نام ہے۔ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس سے لے کر انارکلی چوک تک ماسوائے آئس فیکٹری کے جہاں اب جی پی او واقع ہے کوئی عمارت دونوں جانب موجود نہ تھی۴۱۔

موزیک ہال (یہ فری میسن تنظیم کا ہال تھا۔ اس عمارت میں اب وزیر اعلیٰ پنجاب کا دفتر قائم ہے)، شاہ دین بلڈنگز، سیلا رام بلڈنگز، جی پی او، ٹیلی گراف آفس، ہائی کورٹ اور فورمین کرسچین کالج (کالج کی پرانی عمارت) کی عمارتیں خالی جگہوں پر بنائی گئیں۔ نیڈوز اور سٹفل ہوٹل، سول اینڈ ملٹری گزٹ آفس، سلیم بلڈنگز، بیبے سائیکل اینڈ موٹر ایجنسی کی عمارتیں پرانی عمارتوں کو گرا کر تعمیر کی گئیں۔ انارکلی چوک تا گول باغ تک کا علاقہ ایگزیبیشن بلڈنگ (ٹولنٹن مارکیٹ ۱۸۶۴ء) کے حوالے سے ایگزیبیشن روڈ اور میوزیم روڈ بھی کہلاتا تھا۔ ٹاؤن ہال، لاہور میوزیم، میو سکول آف آرٹس اور پنجاب یونیورسٹی کی عمارتیں ۱۸۸۲ء کے بعد تعمیر ہوئیں۔

۱۸۷۸ء سے قبل لارنس ہال اور منٹگمری ہال دونوں کی عمارتوں کو ۶۳ × ۱۷ فٹ کے ایک درمیانی راستے سے باہم ملا دیا گیا تھا۔ اس درمیانی برآمدے کی آرائشی پینٹنگ کا کام ہندوستان میں ہونے والے عمومی انداز کے کام کی نسبت بے حد منفرد نوعیت کا تھا۔ اسے سلیقے سے انجام دینے کے لیے ڈیزائن اور ورکنگ ڈیزائن تیار کیے گئے۔ یہ کام میو سکول آف آرٹس (موجودہ نیشنل کالج آف آرٹس، لاہور) کے طالب علموں بگا رام، روپ لال، اللہ دین، محمد دین ii، جیوا رام، محمد دین iii اور ناتک چند وغیرہ نے سکول آف آرٹس کے پرنسپل جان لاک وڈ کپلنگ کی نگرانی میں مکمل کیا۔ کالج کے پرنسپل نے یکم اپریل ۱۸۷۷ء تا ۳۱ مارچ ۱۸۷۸ء کی رپورٹ میں اس کام کو اپنے طالب علموں کے لیے معیاری عملی تربیت کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس کام کی بدولت ہم قابل تقلید نمونہ پیش کریں گے۴۲۔ اس حصے میں تصویری گیلری قائم ہوئی اور ریڈنگ روم بنا۔ یہاں اہم شخصیات کے پورٹریٹ آویزاں کیے گئے تھے، جن میں سر ہنری لارنس، سر جان لارنس، رابرٹ منٹگمری، ڈونلڈ میکلوڈ، ہنری

میرین، ڈیورنڈ، ہنری ڈیوس، رابرٹ ایچیسن، ہربرٹ ایڈورڈ (کمشنر پشاور)، اے۔ اے۔ رابرٹ، ایف۔ کوپر (کمشنر لاہور)، جان نکلسن اور کرنل ولیم ڈیوس کے پورٹریٹ شامل تھے[۴۳]۔ یہ پورٹریٹ قیام پاکستان تک یہاں موجود تھے[۴۴]۔

لارنس ہال کی تعمیر سے قبل لاہور میں رہائش پذیر یورپی باشندوں کے لیے انارکلی بک کلب، لاہور میوزیم کے ساتھ واقع وزیر خاں کی بارہ دری ۴۵ کی عمارت میں قائم ہوا تھا۔ اس بک کلب کے قیام پر سیکرٹری انارکلی بک کلب نے ۲۶ر جولائی ۱۸۶۱ء کو سیکرٹری حکومت پنجاب کو لکھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے درخواست کی جائے کہ وہ تمام سرکاری مطبوعات و کاغذات کی کاپیاں انارکلی بک کلب کو فراہم کیا کرے۔ اس لیے یہاں کتب و رسائل کا ایک عمدہ ذخیرہ موجود تھا۔ اس لائبریری کو بھی لارنس ہال میں منتقل کر دیا گیا۔

ہال، گیلری، لائبریری اور ریڈنگ روم کی سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یکم مئی ۱۸۷۸ء کو لارنس اور منٹگمری دونوں ہالوں میں ''لاہور اینڈ میاں میر انسٹیٹیوٹ'' قائم کیا گیا اور انارکلی بک کلب کے تمام ذخیرہ کتب کو اس کا حصہ بنانے کے علاوہ اسٹیشن لائبریری جو پہلے ''سولجر گارڈن'' میں قائم ہوئی تھی کی کتب کو بھی اس انسٹیٹیوٹ کے لیے حاصل کر لیا گیا۔ اس انسٹیٹیوٹ میں انارکلی بک کلب کے ضم ہونے کے بعد اسے انسٹیٹیوٹ کے بجائے کلب کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ تمام سرکاری و غیر سرکاری افراد اس کی رکنیت حاصل کر سکتے تھے۔ ''لاہور اینڈ میاں میر انسٹیٹیوٹ یا کلب'' ہی بعد میں جم خانہ کلب کے نام سے مشہور ہوا، جب ۲۳ر جنوری ۱۹۰۶ء کو اس کا نام تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں جب دونوں ہالوں کی عمارتوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری میونسپل کمیٹی لاہور سے حکومت پنجاب کو منتقل ہونے کی بات زیر غور آئی تو گورنر پنجاب کی پیش کش پر جمخانہ کلب نے ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء سے دونوں ہالوں کو لیز پر حاصل کر لیا[۴۶]۔ یہ کلب حقیقتاً ان انگریز افسران کے زیر استعمال رہا، جن کے خاندان لاہور میں ان کے ہمراہ قیام پذیر نہیں تھے۔ اکثر حکومتی اعلیٰ افسران کی دعوتیں اور ملن پارٹیاں اسی کلب میں ہوتیں۔ دوپہر کو ''صاحب بہادر'' باغ میں چہل قدمی کرتے، ٹینس کھیلتے اور آب آتشیں نوش کرتے[۴۷]۔

جم خانہ لاہور میں بسنے والے یورپی افراد اور سرکاری افسران کے سماجی رابطے کی ایک اہم جگہ تھی۔ یہاں سماجی اور ثقافتی زندگی اپنی پوری آب و تاب پر نظر آتی۔ مقامی امراء، راجے، مہاراجے، نوابین اور رئیسان پنجاب انگریزوں کے ساتھ سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۶۸ء میں جم خانہ کلب کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے بارے میں سوچا گیا۔ خواص کی جگہ تبدیل کرنے کے خیال کو عام لوگوں کا بھاری تعداد میں باغ میں چہل قدمی کے لیے آنا یا عدم تحفظ یا پریس کی تنقید کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ دوسرے وقت کے ساتھ ساتھ یہاں اعلیٰ حکومتی افسران کی بجائے کاروباری طبقے کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا اور وہ اس کی چیئرمین شپ حاصل کرنے میں پیش پیش نظر آنے لگے۔ جم خانہ کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد کلب کے چیئرمین نواب مظفر علی قزلباش نے ۱۵ر مارچ ۱۹۶۸ء کو رکھا اور تین سال دس ماہ بعد ۱۶ر جنوری ۱۹۷۲ء کو جم خانہ کلب لارنس اور منٹگمری ہال سے نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔

انگریزوں کے دور حکومت میں پنجاب میں سماجی و ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کا آغاز، پنجاب پر قبضے کے بعد جنگ و جدل کے دور سے نکل کر امن کی فضا میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے **ریٹیگن** روڈ لاہور پر واقع ''روز لینڈ'' نامی ایک بنگلے سے ہوا۔ یہ بنگلہ **ریٹیگن** فیملی کا پرانا گھر تھا۔ یہ لاہور میں یورپین افراد کی سرگرمیوں کے لیے نجی طور پر قائم ہونے والا اولین مرکز تھا۔ یہاں ہر پندرھویں روز لیڈی **ریٹیگن** قریبی دوستوں کو دعوت پر مدعو کرتیں اور مسٹر **ریٹیگن** مہمانوں کے ہمراہ ٹینس اور

بیڈمنٹن سے دل بہلاتے، کیونکہ مسٹر **ریٹیگن** ان کھیلوں کے بہترین کھلاڑی تصور کیے جاتے تھے۔ جب انگریزوں کی یہ سماجی و ثقافتی اور تفریحی سرگرمیاں ''سولجر گارڈن'' منتقل ہوئیں تو حکومت نے ''روز لینڈ'' کو خرید کر سینٹرل ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی رہائش گاہ بنا دیا۴۸۔

''سولجر گارڈن'' لاہور میں حضرت داتا گنج بخش کے مزار اور میلہ رام ملز کے عقب میں واقع تھا۔ اسے **ریٹیگن** فیملی کے ایک فرد نے بنوایا تھا۔ اس میں ایک وسیع تالاب تھا، جو پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا اور قریب ہی ایک ریکٹ کورٹ بھی تھا۔ یہ باغ انارکلی کیٹونمنٹ کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ چیف کمشنر پنجاب سر جان لارنس نے ۱۸۵۶ء میں اس باغ کو لاہور کے انگریز رہائشیوں کی سماجی و ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کا مرکز قرار دے دیا۔ یہی مرکز اصل میں لاہور جم خانہ کلب کی تحریک کا نقطۂ آغاز ہے۴۹۔ یوں سمجھ لیجئے کہ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں لاہور کی سماجی و ثقافتی زندگی کی ابتداء یہیں سے ہوتی ہے۔ باغ میں یورپی خواتین و حضرات، مقامی امراء اور دیگر خواص رنگ برنگے لباس زیب تن کیے فیشن اور بیوٹی کی دنیا کے نمائندے بنے فوجی بینڈ کی مدھر دھنوں سے لطف اندوز ہوتے۔

اس زمانے کے لاہور کی سماجی زندگی میں لوئر مال کو بھی خاص مقام حاصل تھا۔ گول باغ ۵۰ (موجودہ ناصر باغ) جو اس وقت ''بینڈ اسٹینڈ گارڈن'' کہلاتا تھا، میں ہر ہفتے دو دن پولیس بینڈ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا۔ جس کا نظارہ کرنے کے لیے پورا شہر امڈ آتا۵۱۔

لارنس ہال بن جانے سے لاہور کی تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کا رخ یک دم اس طرف پھر گیا، کیونکہ یہ ہال لاہور میں واحد تفریح گاہ تھی، جو اس زمانے کی تمام تر جدید سہولیات سے آراستہ تھی۔ لہٰذا ''سولجر گارڈن'' اور دیگر مقامات کی رونقیں یہاں سمٹ آئی تھیں۔ یہاں عوامی، تفریحی، گیت سنگیت کے پروگرام اور دیگر تقریبات منعقد ہوتیں۔ پروفیسر وینک (Vaneck) یہاں میجک لالٹین شو اور دیگر شعبدہ بازیوں کا مظاہرہ کرتے۔ اس سے قبل وہ اکثر ٹولنٹن مارکیٹ جہاں ۱۸۶۴ء میں میوزیم منتقل ہوا تھا، کے ایک حصے میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، تاہم ہال کی سہولت میسر آنے پر انہوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

۱۸۶۴ء سے قبل لاہور میں گشتی تھیٹر کمپنیوں کا رواج بالکل نہ تھا، مگر ۱۸۶۴ء کے بعد ہر موسم سرما میں مسٹر کارسن (Carson) ''کرسٹی منسٹرل'' نامی اپنے طائفے کو باقاعدگی سے لاہور لاتے۔ لارنس ہال بن جانے پر وہ بھی یہیں ڈیرہ ڈالتے۔ یہاں لوگوں کا ایک ہجوم اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اسی طرح سرکس کمپنیاں بھی سردیوں کے موسم میں اپنے اپنے طائفے لے کر بڑی باقاعدگی سے لاہور وارد ہوتیں۔ ان میں ''گریٹ آسٹریلین سرکس'' سب سے زیادہ پسند کی جاتی تھی۔ مشہور زمانہ ''سٹار کمپنی'' نے تو انیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں لاہور میں اپنے ورائٹی پروگراموں کی بدولت دھوم مچا رکھی تھی۔ اس کمپنی کے مظاہرے بھی لارنس ہال کی رونقوں میں بے حد اضافے کا باعث بنتے، کیونکہ سٹار کمپنی کے فن کار اپنے خاص سنگیت اور سازوں کی بدولت اعلیٰ معیار کی موسیقی پیش کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ''ہڈسن سرپرائز پارٹی'' نے بھی یہاں جدید موسیقی کے پروگراموں کی بدولت خوب شہرت حاصل کی۔

لارنس ہال میں ہونے والا ایک قابل ذکر تفریحی پروگرام غیر پیشہ ور یعنی شوقین گانے والوں کا پروگرام ''سلیکشن فرام مسیحا'' تھا۔ ان کی تربیت مسٹر میلویل کرتے تھے، جو پنجاب کے فنانشل کمشنر تھے۔ انہی پروگراموں میں مسٹر میکورتھ ینگ کو بھی گانا گانے کا موقع ملا جو بعد ازاں ۶ مارچ ۱۸۹۷ء سے ۶ مارچ ۱۹۰۲ء تک پنجاب کے گورنر رہے۔

ایک طاقتور شخص جو ''گریٹ سپینش مشروم'' کہلاتا تھا، نے لارنس ہال میں ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ انتہائی ناقابل فراموش مظاہرہ کیا۔ وہ جمناسٹک کے جھولے میں بیٹھ کر پاؤں کے پنجے سے ایک چھوٹی توپ چلاتا، جب ایک زبردست دھماکہ ہوتا تو تمام روشنیاں بجھ جاتیں اور شیشے ٹوٹ کر بکھر جاتے۔ اس موقع پر جب ''مشروم'' نے ایک مزید زبردست دھماکہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو حاضرین میں موجود ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس نے دہشت زدہ ہو کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

لارنس ہال میں ۱۸۷۸ء میں کھیلا جانے والا نمائشی بلیئرڈ میچ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، جو جان رابرٹ اور انڈیا کے دورے پر آئے ہوئے مشہور کھلاڑی شارٹر کے درمیان کھیلا گیا۔ اس میچ کے لیے ٹیبل نواب آف بہاولپور نے فراہم کی تھی۔ یہ میچ شارٹر نے ۱۰۳ پوائنٹس کی حیران کن برتری سے جیتا تھا۔

بہرحال پروفیسر ولیم شیڈ، مسٹر کارسن اور سنار کمپنی کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ لارنس و منٹگمری ہال اعلیٰ پائے کی عوامی، تہذیبی وثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کا مرکز بنے جس کے نتیجے میں لاہور ''روشن لاہور'' کہلایا۔

لارنس ہال میں پادری بالڈون (Baldwin) کی ہر پندرہ روز بعد ہونے والی ''پینی ریڈنگز'' کو لوگ بہت پسند کرتے تھے اور بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ لاہور میں تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات کے علاوہ سوشل سرگرمیاں بھی بہت نمایاں تھیں۔ وہ مقامی لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے اکثر تفریحی پروگرام بھی یہاں منعقد کراتے تھے۔

لاہور یونیورسٹی کالج کی سینٹ کا پہلا اجلاس جس میں لاہور یونیورسٹی کے آغاز کا باقاعدہ اعلان کیا گیا، گورنر پنجاب سر ڈونلڈ میکلوڈ کی صدارت میں ۱۱ر جنوری ۱۸۷۰ء کو لارنس ہال میں منعقد ہوا[۵۱]۔ ۵ر مئی ۱۸۷۰ء کو سینٹ کا دوسرا اجلاس بھی یہیں ہوا۔ اس اجلاس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ حکومت ہند سے ''لاہور یونیورسٹی کالج'' کا نام بدل کر ''پنجاب یونیورسٹی کالج'' رکھنے کی استدعا کی جائے[۵۳] اور حکومت ہند نے اس استدعا کو پذیرائی بخشتے ہوئے ۲۷ر جون ۱۸۷۰ء کو ''لاہور یونیورسٹی کالج'' کا نام بدل کر ''پنجاب یونیورسٹی[۵۴] کالج'' رکھ دیا[۵۵]۔ نام کی تبدیلی سے قبل لاہور یونیورسٹی سینٹ کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں اجلاس بالترتیب ۷، ۱۰ اور ۳۰ر مئی ۱۸۷۰ء کو یہیں ہوئے۔ اسی طرح نام تبدیل ہونے کے بعد بھی سینٹ کا پہلا اجلاس ۴ر جولائی ۱۸۷۰ء کو لارنس ہال ہی میں ہوا۔

لارنس اور منٹگمری ہال دونوں کو پنجاب یونیورسٹی کے سالانہ کانووکیشن اور امتحانات کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کا چوتھا اور پانچواں کانووکیشن بالترتیب نومبر ۱۸۸۶ء اور مارچ ۱۸۸۷ء میں یہیں منعقد ہوئے۔ علاوہ ازیں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک منعقد ہونے والے چار کانووکیشن بھی منٹگمری ہال میں ہی ہوئے[۵۶]۔ پنجاب یونیورسٹی کالج کے قیام ۱۸۷۰ء سے ۱۹۰۴ء تک لارنس اور منٹگمری ہالوں کو امتحانی سنٹروں کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ جب ۱۹۰۴ء میں **ریٹیگن** روڈ پر بریڈلے ہال تعمیر ہوا تو پنجاب یونیورسٹی نے اسے امتحانی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا[۵۷]۔

وائسرائے ہند لارڈ میو کی وفات کے بعد پنجاب میں ان کی یادگار بنانے کے لیے ۳۰ر مارچ ۱۸۷۲ء کو لارنس ہال، لاہور میں ایک سرکاری اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں طے پایا کہ پنجاب میں ایک میو میموریل کمیٹی بنائی جائے گی جو اس یادگار کے لیے چندہ اکٹھا کرے گی اور یہ بھی طے کرے گی کہ اس یادگار کی نوعیت کیا ہونی چاہیے[۵۸]۔ اس کمیٹی نے پنجاب سے ۶۶ ہزار روپے کی رقم اکٹھی کی جسے آگرہ بنک میں جمع کرا دیا گیا۔ اس کمیٹی کی بھی ایک میٹنگ ۲۴ر مارچ ۱۸۷۳ء کو لارنس ہال میں منعقد ہوئی، جس میں قرار پایا کہ اس رقم سے لاہور میں سکول آف آرٹس اینڈ ڈیزائن بنایا جائے۔ نتیجۃً میو سکول آف آرٹس لاہور

(موجودہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور) جون ۱۸۷۵ء میں وجود میں آیا، جس کا تصور دو سال تین ماہ قبل لارنس ہال میں پیش کیا گیا تھا۔

چیف کالج پنجاب (موجودہ ایچیسن کالج، لاہور) کے قیام کا فیصلہ اور عمارت کے ڈیزائن کا انتخاب بھی لارنس ہال میں ہوا۔ چیف کالج کی وزیٹرز اینڈ مینجمنٹ کمیٹی کا ایک اجلاس ۲ر جنوری ۱۸۸۶ء کو گورنر پنجاب سر چارلس ایچیسن کی صدارت میں یہاں ہوا۔ اس اجلاس میں مہاراجہ جموں و کشمیر، مہاراجہ پٹیالہ، نواب آف بہاول پور، راجہ جیند، راجہ نابھہ اور راجہ کپورتھلہ نے شرکت کی جو وزیٹرز کہلاتے تھے۔ تمام اراکین نے یہ فیصلہ کیا کہ پنجاب کے رؤساء اور شرفا کے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ بنایا جائے گا۵۹، جس کا نام پنجاب چیف کالج ہوگا۔ یہ کالج لاہور میں ہوگا اور اس کی عمارت میاں میر روڈ (موجودہ مال روڈ) کے شمال میں گورنر ہاؤس اور لارنس گارڈن کے قرب و جوار میں ہوگی۔ لہٰذا مجوزہ زمین کے حصول اور عمارت کے ڈیزائن کی ذمہ داری مینجمنٹ کمیٹی کو سونپی گئی ۶۰۔ اس فیصلے کی روشنی میں مینجمنٹ کمیٹی کا بھی ایک اجلاس یکم مئی ۱۸۸۶ء کو گورنر پنجاب کی صدارت میں یہیں ہوا، جس میں چیف کالج کی عمارت کے لیے ڈیزائن کا انتخاب کیا گیا اور آئندہ اجلاس میں قواعد و ضوابط کو حتمی شکل دینے کا ارادہ کیا گیا ۶۱۔

لارنس ہال میں پنجاب **لیجسلیٹو** کونسل ۶۲ کے دو اجلاس بھی منعقد ہوئے۔ یہ اجلاس بالترتیب ۱۹ر نومبر اور ۱۵ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو ہوئے۔ اس زمانے میں **لیجسلیٹو** کونسل چیمبر تو گورنر ہاؤس میں تھا، مگر کونسل کے کچھ اجلاس لارنس ہال اور پنجاب یونیورسٹی سینٹ ہال میں بھی منعقد ہوئے ۶۳۔

ہندوستان کے دورے پر آنے والی خاص خاص ہستیوں کو بھی ان ہالوں میں مدعو کیا جاتا۔ ڈیوک آف ایڈنبرا جب ۹ر فروری ۱۸۷۰ء کو لاہور آئے تو ۱۰ر فروری کو گورنر ہاؤس میں ڈنر کے بعد منٹگمری ہال میں ان کے اعزاز میں رقص کی ایک محفل کا بندوبست کیا گیا۔ اگلے روز ڈیوک آف ایڈنبرا کے لیے ایک دوستانہ محفل منعقد ہوئی۔ اس موقع پر یہ ہال تقریباً آٹھ یا نو سو مہمانوں سے پُر تھا۔ اس تقریب میں مقامی اور یورپین افراد کے علاوہ مقامی ریاستوں کے رؤساء اور امراء نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی ۶۴۔

پرنس اینڈ پرنسیس آف ویلز نے جب ہندوستان کا دورہ کیا، تو ان کے دورہ پنجاب کو بے حد اہم گردانتے ہوئے حکومت پنجاب نے ۲۹ر نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۰۵ء تک تین یوم کے لیے سرکاری دفاتر بند رکھے اور ۲۸ر نومبر ۱۹۰۵ء کو عام تعطیل کی ۶۵۔ پرنس آف ویلز نے ۳۰ر نومبر ۱۹۰۵ء کو منٹگمری ہال پہنچنا تھا، لیکن گورنر پنجاب نے ۲۹ر جون ۱۹۰۵ء سے ہی اس ہال کو ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریبات کے شایان شان بنانے کے احکامات صادر کرنا شروع کر دیے، کیونکہ منٹگمری ہال کی حالت اس وقت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ اسے زلزلے کے باعث کافی نقصان پہنچا تھا۔ اس لیے یہاں مرمت، رنگ و روغن اور سجاوٹی پینٹنگ جیسے کاموں کی بہت گنجائش نکل آئی تھی۔ ہال کی سجاوٹی پینٹنگ کا کام میو سکول آف آرٹس کے پرنسپل مسٹر پرسی براؤن کی نگرانی میں کرایا گیا۔ اس کام کے عوض پرسی براؤن کو ۵۰۰ روپے اعزازیہ دیا گیا۔ قبل ازیں ہال کے بیشتر حصے میں عام سفیدی کی گئی تھی لیکن اس موقع پر پورے ہال میں آئل پینٹ کیا گیا۔ یہی وہ موقع ہے کہ جب ان ہالوں میں الیکٹرک لائٹ کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کی تنصیب کے انتظامات کیے گئے۔ منٹگمری ہال کی سپیشل مرمت وغیرہ کے لیے حکومت پنجاب نے ۶۵۰۰ روپے مختص کیے تھے لیکن اس کام پر کل سات ہزار پانچ سو روپے، چھ آنے اور تین پیسے خرچ اٹھا یعنی چھ سو سات روپے سے

اوپر کی رقم زائد خرچ ہوئی ۶۶۔

پرنس اینڈ پرنسیس آف ویلز ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء بروز جمعرات لارنس ہال پہنچے۔ یہاں انہیں گارڈ آف آنرز پیش کیا گیا۔ لارنس ہال کے باہر صوبہ پنجاب کے ۱۳۰ درباریوں نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور سونے کی مہر سے ان کی نظر اتاری۔ پھر مہمانوں کو قافلے کی صورت میں ہالوں کے درمیانی برآمدے سے گزار کر عالی شان طریقے سے سجائے گئے منٹگمری ہال میں لایا گیا۔ یہاں پنجاب کے امراء و رؤساء اور یورپین افسران کی ایک بھاری تعداد موجود تھی۔ خوبصورت ہال میں دلکش پھول پودوں کے درمیان، قیمتی قالینوں پر امراء و رؤساء پنجاب کے رنگ برنگے لباس اور مرصع جیولری نے سب کو بے حد متاثر کیا۔ اس پروقار تقریب کے بعد محفل رقص منعقد ہوئی۔ شہزادے نے لیڈی بلڈ کے ساتھ رقص کیا جبکہ شہزادی گورنر پنجاب سر چالس منٹگمری ریواز کے ساتھ محو رقص رہی۔ یہ محفل رات ساڑھے گیارہ بجے تک گرم رہی اور منٹگمری ہال کے ساتھ ساتھ لارنس ہال بھی رقص کی لپیٹ میں آیا رہا۔

لارنس و منٹگمری ہالوں سے جم خانہ کلب جب اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوا تو یہ عمارتیں مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہوتی رہیں۔ یہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۱ء تک مارشل لاء حکام کے زیر استعمال رہیں۔ اسی زمانے میں لاہور میں ایک ماڈل لائبریری کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا۔ ۱۷ مئی ۱۹۸۱ء میں چیف سیکرٹری پنجاب محمد صدیق چوہدری کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا مقصد لارنس و منٹگمری ہالوں کی عمارتوں میں ماڈل لائبریری قائم کرنا تھا۔ گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) غلام جیلانی خان نے ان عمارتوں میں لائبریری قائم کرنے میں ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق باغ جناح تشریف لائے اور یہاں لائبریری کے قیام کی منظوری دی۔ اس لائبریری کا نام بانی پاکستان کے نام نامی پر قائداعظم لائبریری رکھا گیا۔ اس وقت ان عمارتوں کو لائبریری کی صورت دینے کے کام کا آغاز کر دیا گیا۔ لائبریری بناتے وقت ان عظیم الشان عمارتوں کے اصل ڈیزائن کو برقرار اور محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی گئی۔ اس لائبریری کا افتتاح باضابطہ طور پر صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو کیا۔ لائبریری کا انتظام چلانے کے لیے ایک بورڈ آف گورنرز تشکیل دیا گیا ہے جس کے چیئرمین چیف سیکرٹری پنجاب ہوتے ہیں۔

لائبریری ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ قارئین کے بیٹھنے کے لیے کیبن اور سکالرز کے کمرے جدید سہولیات سے آراستہ ہیں۔ طلبا کے لیے درسی کتب کی سہولت میسر ہے۔ یہ ریسرچ اینڈ ریفرنس لائبریری ہے، اس لیے کوئی کتاب جاری نہیں کی جاتی تاکہ تمام کتب ہر وقت مطالعے کے لیے دستیاب رہیں۔ اس وقت اس لائبریری میں ایک لاکھ پانچ ہزار کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ پوسٹ گریجوایٹ طلبا کے علاوہ ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے طلبا و طالبات تک کی ضروریات پورا کرتی ہے۔ اس میں جدید الیکٹرانک مشینری نصب کی گئی ہے جس میں آڈیو ویژول ایڈ یعنی مائیکرو فلم، مائیکرو فش، پروجیکٹرز، آڈیو کیسٹ ریکارڈر اور فوٹو کاپی کرنے کی سہولیات شامل ہیں۔ لائبریری میں موجود تمام مواد کا کمپیوٹرائزڈ کیٹلاگ تیار کر دیا گیا ہے۔ اس وقت کل چودہ ہزار ممبر ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

قائداعظم لائبریری کو مختلف سیکشنوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں انگریزی، اسلامیات، اردو، عربی، نایاب کتب اور سپیشل کولیکشن شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ریفرنس سیکشن، اورینٹل سیکشن، نیوز پیپر و میگزین سیکشن اور ٹیکسٹ بک سیکشن بھی بنائے گئے ہیں۔ خواتین کے لیے الگ طور پر بھی ''لیڈیز سیکشن'' موجود ہے۔ لائبریری کا ریسرچ سیل قارئین کو معلومات کے علاوہ مواد کی

فراہمی کا بھی بندوبست کرتا ہے۔ نیز مختلف موضوعات پر سیمیناروں کا انعقاد بھی اسی سیل کی ذمہ داری ہے۔

الغرض لارنس و منٹگمری ہال میں قائد اعظم لائبریری اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے طلبا و طالبات اور ریسرچ سکالرز کو بہترین خدمات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی تقریبات کا انعقاد کر کے اسی روایت کے صحت مند پہلوؤں کو آگے بڑھا رہی ہے جو ماضی میں لارنس و منٹگمری ہال کا طرۂ امتیاز تھی۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ پنجاب گورنمنٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۱۲۔۱۱، مورخہ ۲۶/اکتوبر ۱۸۶۷ء

۲۔ ایضاً، پروسیڈنگ نمبر ۱۷، مورخہ ۱۱/اپریل ۱۸۶۳ء

۳۔ J.L Kipling & Thornton, Lahore, Lahore, Government Civil secretariat press, 1876,p.81

۴۔ Syad Muhammad Latif, Lahore:its History, Architectural Remains and Antiquities, Lahore, Merchantile Guardian Press, Lahore, 1956-57, p.309

۵۔ Nazir Ahmad Chaudhry, Lahore Glimpses of a Glorious Heritage, Lahore, Sang-e-Meel publications ,2000, p.429

۶۔ Dr. Harold Lee, Brothers in the Raj, Karachi, Oxford University Press, 2002,p.393

۷۔ کنھیا لال ھندی، تاریخ لاہور، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۴۰۸

۸۔ پنجاب گورنمنٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۱۰، مورخہ ۲۵/جولائی ۱۸۶۳ء

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً، پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۶۱۲، مورخہ ۱۴/اپریل ۱۸۴۹ء

۱۱۔ ایضاً، ہوم جنرل ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۹۔۸، مورخہ ۱۹/فروری ۱۸۵۳ء

۱۲۔ نئے نظام کے تحت چیف کمشنر کے پاس گورنر کی طرح صوبے کے کل اختیارات ہوتے تھے۔ اس سے بلند درجے پر لیفٹیننٹ گورنر صوبہ اور اس سے اوپر گورنر صوبہ کا مقام آتا تھا۔ یہ نظام پورے ہندوستان میں رائج تھا بعد ازاں پنجاب کو یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو لیفٹیننٹ گورنر صوبہ کا رتبہ دیا گیا اور ۳/جنوری ۱۹۲۱ء سے گورنر صوبہ کا درجہ عطا کر دیا گیا۔

۱۳۔ پنجاب گورنمنٹ، ہوم جنرل ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۵۷، مورخہ ۱۵/جنوری ۱۸۵۹ء

۱۴۔ M.Afzal Khan (Editor), Governors of the Punjab, Lahore, Governor's House,1971, p.6

۱۵۔ پنجاب گورنمنٹ، ہوم جنرل ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۶۱۔۶۰، مورخہ ۱۶/فروری ۱۸۵۶ء

۱۶۔ J.L. Kipling and Thornton, Lahore, p.81

۱۷۔ گزٹ آف انڈیا، مورخہ ۲۹/اکتوبر ۱۸۶۴ء، ص ۸۱۵

۱۸۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کا سنگ بنیاد ۱۸۵۹ء میں سر جان لارنس ہی نے رکھا تھا، جو اس وقت پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔

۱۹ گزٹ آف انڈیا، مورخہ ۲۹/اکتوبر ۱۸۶۴ء، ص ۸۱۶

۲۰ Dr. Harold Lee, Brothers in the Raj, p.393

۲۱ ایضاً

۲۲ H.R. Goulding, Old Lahore, p.55

۲۳ پنجاب گورنمنٹ، ہوم جنرل ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۱۲۔۱۱، مورخہ ۲۶/اکتوبر ۱۸۶۷ء

۲۴ سید محمد لطیف نے یہ رقم ایک لاکھ آٹھ ہزار بیان کی ہے جبکہ سرکاری ریکارڈ کے مطابق ایک لاکھ دس ہزار ہے۔

۲۵ پنجاب گورنمنٹ، ہوم جنرل ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۱۲۔۱۱، مورخہ ۲۶/اکتوبر ۱۸۶۷ء

۲۶ ایضاً، پروسیڈنگ نمبر ۵۹۔۵۸، مورخہ ۱۶/فروری ۱۸۶۴ء

۲۷ M.Afzal Khan (Editor), Governors of the Punjab, p.6

۲۸ ایضاً

۲۹ پنجاب گورنمنٹ، بورڈ اینڈ کمیٹی ڈیپارٹمنٹ (کمیٹی برانچ)، بی۔ پروسیڈنگ، فائل نمبر ۳۷، فروری/اپریل ۱۹۰۶ء

۳۰ J.L. Kipling and Thornton, Lahore, p.82

۳۱ کنھیا لال ہندی، تاریخ لاہور، ص ۴۰۸

۳۲ Syad Muhammad Latif, Lahore: its History, Architectural Remains and Antiquities, p.310

۳۳ پنجاب گورنمنٹ، بورڈ اینڈ کمیٹی ڈیپارٹمنٹ (کمیٹی برانچ)، بی۔ پروسیڈنگ، فائل نمبر ۳۷، فروری/اپریل ۱۹۰۶ء

۳۴ J.L. Kipling & Thornton, Lahore, p.80

۳۵ ایضاً، ص ۸۱

۳۶ پنجاب گورنمنٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۱۲۔۱۱، مورخہ ۲۶/اکتوبر ۱۸۶۷ء

۳۷ H.R. Goulding, Old Lahore, p.25

۳۸ Sketch Map of the City and Environs of Lahore,Lahore, S.G.P.P.,1880.

۳۹ J.L.Kipling & Thornton, Lahore, p.81

۴۰ H.R. Goulding, Old Lahore, p.47

۴۱ ایضاً، ص ۴۹

۴۲ پنجاب گورنمنٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۱۶، جولائی ۱۸۷۸ء

۴۳ J.L. Kipling & Thornton, Lahore, p.82

۴۴ Nazir Ahmad Chaudhry, Lahore Glimpses of a Glorious Heritage, p.429

۴۵ لاہور میوزیم کے ساتھ واقع وزیر خاں کی بارہ دری، جسے شاہجہان کے عہد میں بنایا گیا تھا کو پنجاب پر انگریزوں کے قبضے ۱۸۴۹ء کے بعد مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ سب سے پہلے اسے فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا پھر یہاں سیکلمینٹ آفس بنا دیا گیا۔ لاہور کا پہلا ٹیلی گراف آفس بھی اسی عمارت میں بنا۔ بعد ازاں یہ آفس یہاں سے سیکرٹریٹ منتقل ہوا اور آخر کار اپنی نئی عمارت مال روڈ پر آ گیا۔ ۱۸۵۶ء میں لاہور کا پہلا میوزیم بھی اسی عمارت میں بنا تھا، جو ۱۸۶۴ء میں ٹولنٹن مارکیٹ منتقل ہوا اور پھر ۱۸۹۳ء میں اپنی موجودہ عمارت میں آ گیا۔

۴۶ (i) پنجاب گورنمنٹ، بورڈ اینڈ کمیٹی ڈیپارٹمنٹ (کمیٹی برانچ)، بی پروسیڈنگ نمبر ۱۰۶، فائل نمبر ۱۸۰، جولائی ۱۹۰۶ء

(ii) ایضاً، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۶۔۶۵، فائل نمبر ۱۸۰، نومبر ۱۹۰۶ء

(iii) ایضاً، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۲۹۔۲۸، فائل نمبر ۴۴، مارچ ۱۹۰۷ء

۴۷ Nazir Ahmad Chaudhry, Lahore Glimpses of a Glorious Heritage, p.429

۴۸ H.R. Goulding, Old Lahore, p.10

۴۹ ایضاً

۵۰ گول باغ کا اصل نام انارکلی گارڈن تھا، جس کی تصدیق پرانے نقشوں سے ہوتی ہے۔ یہ باغ گورنمنٹ کالج سے شروع ہو کر سیکرٹریٹ جہاں انارکلی کا مقبرہ واقع ہے، کے سامنے تک پھیلا ہوا تھا۔

۵۱ H.R. Goulding, Old Lahore, p.48

۵۲ Proceedings of the first meeting of the Senate of the Lahore University College, 11th January,1870, Lahore, Indian Public opinion press, (No. Nil), p.1

۵۳ ایضاً، سیکنڈ میٹنگ، ۵ مئی ۱۸۷۰ء

۵۴ بعد ازاں ۱۸۸۱ء میں "پنجاب یونیورسٹی کالج" کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دے کر اس کا نام "پنجاب یونیورسٹی" رکھ دیا گیا۔

۵۵ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، ۱۸ اگست ۱۸۷۰ء، ص ۸۵۳

۵۶ Guard File containing convocations programme of the punjab university, 1882- up till now, kept in the office of the Punjab University.

۵۷ پنجاب گورنمنٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۲۷۶، فائل نمبر ۱۰۱، مارچ ۱۹۰۱ء

۵۸ پنجاب گورنمنٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ، اے۔ پروسیڈنگ نمبر ۲، جون ۱۸۷۵ء

۵۹ چیف کالج کے قیام سے قبل پنجاب کے روساء و شرفاء کے بچوں کے لیے وارڈ سکول انبالہ موجود تھا۔ اسے انبالہ سے لاہور منتقل کر کے چیف کالج میں ضم کر دیا گیا۔

۶۰ پنجاب گورنمنٹ، ہوم جنرل ڈیپارٹمنٹ، پروسیڈنگ نمبر ۲۰، جنوری ۱۸۸۶ء

۶۱ ایضاً، پروسیڈنگ نمبر ۸، مئی ۱۸۸۶ء

۶۲ جب پنجاب **لیجسلیٹو** کونسل کے ممبران کی تعداد میں اضافہ ہوا تو کونسل کی نئی عمارت سیکرٹریٹ کے اندر ۱۹۲۰ء میں بنائی گئی، جو دربار ہال کے نام سے مشہور ہے۔ دربار ہال کو اسمبلی چیمبر کے طور پر ۱۹۳۷ء تک استعمال کیا گیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت اسمبلی کے ممبران کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا تو ۱۹۳۵ء میں چیمبر گنگ کراس مال روڈ پر پنجاب اسمبلی کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس عمارت میں پہلا اجلاس ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو منعقد ہوا۔

۶۳ (i) S.M. Robinson (Editor), Legislative Council Punjab Proceedings, Lahore, Punjab Government Press, 1904, p.23

(ii) H.A.B. Rattigan (Editor), Legislative Council Punjab Proceedings, Lahore, Punjab Government Press, 1904, p.29

۶۴ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، ۲۰ فروری ۱۸۷۰ء، ص ۱۱۲

۶۵ ایضاً، ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء، ص ۷۳۶

۶۶ (i) پنجاب گورنمنٹ، بورڈ اینڈ کمیٹی ڈیپارٹمنٹ (کمیٹی برانچ)، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۴۵۔۴۰، فائل نمبر ۳۷، فروری ۱۹۰۶ء

(ii) ایضاً، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۶۔۵۵، فائل نمبر ۳۸، فروری ۱۹۰۶ء

قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی تقاریب

شہناز مزمل

۱۔ ۲۳ اپریل ۲۰۰۱ء

مذاکرہ: فکر اقبال صدارت: فتح محمد ملک

شرکاء: انتظار حسین، جاوید اقبال، حنیف رامے، کے ایم اعظم، ڈاکٹر وحید قریشی، عنایت اللہ

۲۔ ۲۸ اپریل ۲۰۰۱ء

اعجاز رحیم کے ساتھ ادبی نشست

شرکاء: عنایت اللہ، نوید شہزاد، خالد احمد، اعجاز الحسن، مسز فریدہ حسن، شمیم خاں

۳۔ ۲۲ جون ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر امجد ثاقب کے سفرنامے ''گوتم کے دیس میں'' کی تعارفی تقریب

صدارت: عنایت اللہ شرکاء: توفیق بٹ، ڈاکٹر اجمل نیازی، پروین عاطف، نیلم بشیر، قاضی جاوید

۴۔ ۲۸ جون ۲۰۰۱ء

لیکچر ڈاکٹر ممتاز انور۔ لائبریری بلڈنگ

شرکاء: قائداعظم لائبریری کا پیشہ ورانہ عملہ اور لاہور کے معروف کتب خانوں کے لائبریرینز

۵۔ ۲۰ جولائی ۲۰۰۱ء

لاہور کی افسانہ نگار خواتین کے ساتھ شام

شرکاء: بشریٰ رحمٰن، سائرہ ہاشمی، افضل توصیف، عطیہ سید، سلمیٰ رعنا، عقیلہ کاظمی، سیما پیروز، پروین سجل، رضیہ اسماعیل، روبیعہ جیلانی

۶۔ ۲۳ اگست ۲۰۰۱ء

مذاکرہ: نئی صدی ایک چیلنج صدارت: عارف نظامی

شرکاء: بشریٰ رحمٰن، افضل توصیف، قاضی جاوید، اشفاق نقوی، عطیہ سید، ڈاکٹر نسیم حسن شاہ، رضیہ اسماعیل، روبیعہ جیلانی، ڈاکٹر ایم اے صوفی، عنایت اللہ

۷۔ ۱۴ ستمبر ۲۰۰۱ء

مخزن کی تقریب رونمائی صدارت: احمد ندیم قاسمی

شرکاء: ڈاکٹر وحید قریشی، عنایت اللہ، عبدالسلام، محمد تاج، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر، انتظار حسین، امجد اسلام امجد

۸۔ ۱۷ ستمبر ۲۰۰۱ء

یوم خواندگی

تعاون: PACADE شرکاء: عنایت اللہ اور پاکیڈ کے ارکان

۹۔ ۱۲۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء

محمد رمضان چیف لائبریرین لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے ساتھ نشست

شرکاء: لاہور کے لائبریرینز

۱۰۔ ۲۳ جنوری ۲۰۰۲ء

لاہور کی شاعرات کے ساتھ شام

شرکاء گفتگو: شہناز مزمل، عبیدہ سید، منصورہ احمد، شائستہ حبیب، درانجم عارف، نیلما سرور، عفت علوی، عقیلہ کاظمی، پروین سجل، بشریٰ حزیں، روبیعہ جیلانی، تسنیم کوثر، شبہ طراز، فرح عدیل۔

مبصر: احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، عنایت اللہ

۱۱۔ ۶ مارچ ۲۰۰۲ء

لاہور کے کالم نگاروں کے ساتھ شام

شرکاء: اجمل نیازی، قاضی جاوید، ارشاد عارف، سرفراز سید، اعزاز احمد آذر، اشفاق نقوی، اختر شمار، گل نوخیز اختر، عنایت اللہ

۱۲۔ ۷ ستمبر ۲۰۰۲ء

یوم خواندگی

تعاون: PACADE لاہور

۱۳۔ ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۲ء

ادبی نشست: اردو ادب اور اکیسویں صدی صدارت: شہزاد احمد

شرکاء: عنایت اللہ، شہناز مزمل، محمد تاج، روبیعہ جیلانی، افضل توصیف، محمد ہارون عثمانی

۱۴۔ ۵ نومبر ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر سہیل احمد خان کے ساتھ ادبی نشست

شرکاء: عنایت اللہ، انتظار حسین، افضل توصیف، سرفراز سید، پروفیسر عبدالجبار شاکر، محمد ہارون عثمانی

۱۵۔ ۱۲ نومبر ۲۰۰۲ء

تبصرہ کتب صدارت: اسلم سکھیرا

تبصرہ نگار: محمد ہارون عثمانی، خلیل احمد چیمہ، شہناز مزمل، محمد احسن تہامی، محمد تاج، پروفیسر عبدالجبار شاکر

قائداعظم لائبریری میں موصول ہونے والے اردو رسائل

خلیل احمد چیمہ

۱۔ آئندہ (ماہنامہ) ر محمود واجد
ڈی ۱۰۶۔ اسماء گارڈن بلاک J
میٹرو ول III متصل اصفہانی روڈ کراچی 75330

۲۔ ادب دوست (ماہنامہ) اے جی جوش
۳۹ کمرشل زون لبرٹی مارکیٹ گلبرگ تھرڈ لاہور

۳۔ ادب لطیف (ماہنامہ) ر صدیقہ بیگم
۲۵۔ پی آر سی فلیٹس برج کالونی لاہور کینٹ

۴۔ ادبیات (سہ ماہی) ر افتخار عارف
اکادمی ادبیات پاکستان سیکٹر ایچ 1/8۔ اسلام آباد

۵۔ اخبار اردو (ماہنامہ) ر ڈاکٹر عطش درانی
مقتدرہ قومی زبان پطرس روڈ ایچ ۸ ر ۱۶ اسلام آباد

۶۔ اخبار جہاں ہفت روزہ ر میر جاوید رحمٰن
آئی آئی چندریگر روڈ کراچی پی او بکس 32

۷۔ اردو ڈائجسٹ (ماہنامہ) ر الطاف حسن قریشی
19-21 ایکڑ سکیم سمن آباد لاہور

۸۔ اردو نامہ (سہ ماہی) ر تیمور عظمت عثمان
معتمد مجلس زبان دفتر حکومت پنجاب، لاہور

۹۔ اشراق (ماہنامہ) ر جاوید احمد غامدی
دارالاشراق ۵۱ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

۱۰۔ افکار (ماہنامہ) ر ڈاکٹر حنیف فوق
۱۰۵ آرسی مینشل آٹو پلازہ مارسٹن روڈ کراچی

۱۱۔ اقبالیات ر محمد سہیل عمر
اقبال اکادمی، ایوان اقبال، ایجرٹن روڈ لاہور

۱۲۔ الاخوۃ ر حافظ ابتسام الٰہی ظہیر
۵۰۔ لوئر مال نزد ایم اے او کالج لاہور

۱۳۔ الاعتصام (ہفت روزہ) ر حافظ عبدالوحید
۳۱۔ شیش محل روڈ لاہور

۱۴۔ الاقرباء (سہ ماہی) ر ناصر الدین
الاقرباء فاؤنڈیشن مکان نمبر 464 سٹریٹ نمبر 58
آئی 8/3۔ اسلام آباد

۱۵۔ البلاغ (ماہنامہ) ر جسٹس تقی عثمانی
دارالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ 25180

۱۶۔ الجامعہ (ماہنامہ) ر ثاقب خوشنود احمد قریشی
دفتر الجامعہ محمدی شریف، جھنگ

۱۷۔ الحق (ماہنامہ) ر مولانا سمیع الحق
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ (سرحد)

۱۸۔ الحمراء (ماہنامہ) ر شاہد علی خان
۱۲۶۔ ایف لبرٹی پلازہ گلبرگ تھرڈ لاہور

۱۹۔ العلم (سہ ماہی) ر سید مصطفٰی علی بریلوی
1۔ بی 10/45 ناظم آباد کراچی 74600

۲۰۔ الغدیر (ماہنامہ) ر ایچ آر غدیری
الفرید اکیڈمی پوسٹ بکس نمبر 8002 لاہور

۲۱۔ الیکٹرو ہومیوپیتھی (ماہنامہ) ر ڈاکٹر عطا محمد کھوکھر
کھوکھر پبلشرز مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

۲۲۔ اوراق (ماہنامہ) ر وزیر آغا
115/3 سرور روڈ لاہور چھاؤنی

۲۳۔ ایشیا (ہفت روزہ) / مرزا محمد الیاس
فرسٹ فلور A-9/1 رائل پارک لاہور

۲۴۔ بلاغ القرآن (ماہنامہ) / پروفیسر عبدالرزاق
ادارہ بلاغ القرآن 110/N سمن آباد لاہور

۲۵۔ بیاض (ماہنامہ) / خالد احمد
۱۹۔اے ایبٹ روڈ لاہور

۲۶۔ بینات (ماہنامہ) / مولانا سعید احمد جلال پوری
جامعہ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

۲۷۔ پاک جمہوریت (ہفت روزہ) / پروین ملک
ادارہ مطبوعات پاکستان A-32
حبیب اللہ روڈ لاہور

۲۸۔ پیام عمل (ماہنامہ) / سید اعجاز ثقلین بخاری
۸ بی شمع پلازہ ۴۷ فروز پور روڈ لاہور

۲۹۔ پیغام آشنا / ڈاکٹر رضا مصطفوی سبزواری
مکان نمبر 25 گلی نمبر F-6/2-27 اسلام آباد

۳۰۔ تاج (ماہنامہ)
جامعہ تاجیہ سیکٹر 14 بی فیروز شاہ مان ٹاؤن کراچی

۳۱۔ تدبر (سہ ماہی) / خالد مسعود
ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمن سٹریٹ مسلم کالونی
سمن آباد لاہور

۳۲۔ تذکیر (ماہنامہ) / مقبول الرحیم مفتی
دارالتذکیر رحمن مارکیٹ غزنی سٹریٹ
اردو بازار لاہور

۳۳۔ تعلیمی زاویے / پروفیسر محمد ابراہیم خالد
12/8 آصف بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

۳۴۔ تکبیر (ہفت روزہ) / مقصود یوسفی
1/A تیسری منزل ناظم کمپلیکس سٹریٹ کراچی

۳۵۔ تقاضے (ہفت روزہ) / پیام شاہجہان پوری
۲۱۔این عوامی فلیٹس ریواز گارڈن لاہور

۳۶۔ جہان طب (ماہنامہ) / حکیم لطف اللہ
شارع بابا فرید پاکپتن

۳۷۔ جہد حق / ندیم فاضل
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق ایوان جمہور
107۔ ٹیپو بلاک نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

۳۸۔ حمایت اسلام (ماہنامہ) / خالد شفیق
۱۸۔ نشتر روڈ لاہور

۳۹۔ خواتین ڈائجسٹ (ماہنامہ) / زنمود ریاض
37۔ اردو بازار کراچی

۴۰۔ دعوۃ (ماہنامہ) / ڈاکٹر خالد علوی
دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی
اسلام آباد

۴۱۔ رابطہ (ماہنامہ) / محمد عیاض غزنوی
لوئیا بلڈنگ کلب روڈ کراچی 75530

۴۲۔ سپوٹنک (ماہنامہ) / آغا امیر حسین
سپوٹنک چوک ریگل، دی مال لاہور

۴۳۔ سفید چھڑی (ماہنامہ) / پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
۱۳۱ رحمت پارک سرگودھا

۴۴۔ سیارہ (ماہنامہ) / حفیظ الرحمن احسن
ایوان ادب چوک اردو بازار لاہور

۴۵۔ سیارہ ڈائجسٹ (ماہنامہ) / امجد رؤف خان
244۔ مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور

۴۶۔ شام وسحر (ماہنامہ) / ڈاکٹر سید شبیہ الحسن
کوہ نور پرنٹنگ پریس ۱۴، اردو بازار لاہور

۴۷۔ صحیفہ (سہ ماہی) / احمد ندیم قاسمی
مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور

۴۸۔ صراط مستقیم (ماہنامہ) / محمد حفیظ اللہ خان مدنی
20 Greclane small Heath, Birminghum
B9-5DB.U.K

۴۹۔ صدائے آدم (ماہنامہ) / حنا جیلانی
131-E/1 گلبرگ تھرڈ لاہور

۵۰۔ ضیائے حرم (ماہنامہ) / حافظ احمد بخش
دفتر ضیائے حرم بھیرہ، ضلع سرگودھا

۵۱۔ طبقاتی جدوجہد (پندرہ روزہ) / منظور احمد
۱۰۵ منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک
لکشمی چوک لاہور

۵۲۔ طلوع اسلام (ماہنامہ) / محمد سلیم اختر
۲۵ بی گلبرگ II لاہور

۵۳۔ طبیب حاذق (ماہنامہ) / حکیم ندیم اختر ضیاء
ادارہ طبیب حاذق شاہدولہ روڈ گجرات

۵۴۔ عرفات (ماہنامہ) / ڈاکٹر سرفراز نعیمی
جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور

۵۵۔ فقہ اسلامی / حافظ رفیع اللہ
گلشن اقبال پوسٹ بکس 17777
کراچی 75300

۵۶۔ فنون (سہ ماہی) / احمد ندیم قاسمی
میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ لاہور

۵۷۔ فیملی میگزین (ہفت روزہ) / علی سفیان آفاقی
فیملی میگزین ۴۔ شارع فاطمہ جناح لاہور

۵۸۔ قومی ڈائجسٹ (ماہنامہ) / مجیب الرحمٰن شامی
زندگی پبلی کیشنز پرائیوٹ لمیٹڈ ۱۴ جیل روڈ لاہور

۵۹۔ قومی زبان (ماہنامہ) / ادیب سہیل
انجمن ترقی اردو، ڈی ۱۵۹ بلاک ۷
گلشن اقبال کراچی

۶۰۔ قومی صحت (ماہنامہ) / اقبال احمد قریشی
ماہنامہ قومی صحت نیو شالیمار ملتان روڈ لاہور

۶۱۔ کتاب (ماہنامہ) / محمد اسلم راؤ
نیشنل بک فاؤنڈیشن جی 8/6
تعلیمی چوک اسلام آباد

۶۲۔ کرکٹر (ماہنامہ) / ریاض احمد منصوری
C-4۔ ۱۴ کمرشل اسٹریٹ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
فیز III ایکسٹنشن کراچی جی پی او بکس 3721

۶۳۔ ماہ نو (ماہنامہ) / پروین ملک
A-32 حبیب اللہ روڈ لاہور

۶۴۔ نعت (ماہنامہ) / راجا رشید محمود
اظہر منزل گلی نمبر 5/10 نیو شالامار کالونی ملتان روڈ لاہور

۶۵۔ مزدور جدوجہد (ہفت روزہ) / شعیب بھٹی
۴۰۔ ایبٹ روڈ لاہور

۶۶۔ مجلۃ الدعوۃ (ماہنامہ) / نوید قمر
کمرہ نمبر 6، ۵ چیمبرلین روڈ لاہور

۶۷۔ مجلۂ سخن / ڈاکٹر تحسین فراقی
شعبہ اردو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور

۶۸۔ محدث / عبدالرحمٰن مدنی
مجلس التحقیق الاسلامی ۹۹۔ جے ماڈل ٹاؤن لاہور

۶۹۔ معاصر انٹرنیشنل (سہ ماہی) / عطاء الحق قاسمی
۵۔ اے کپورتھلہ ہاؤس لیک روڈ لاہور

۷۰۔ معالج (ماہنامہ) / منصور یوسف
۱۰۔ برکت لاج آرام باغ روڈ کراچی

۷۱۔ منہاج (سہ ماہی) / حافظ محمد سعد اللہ
دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور

۷۲۔ منہاج القرآن (ماہنامہ) / محمد ندیم چوہدری
365۔ ایم ماڈل ٹاؤن لاہور

۷۳۔ میثاق (ماہنامہ) / ڈاکٹر اسرار احمد
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

۷۴۔ ندائے خلافت (ہفت روزہ) / حافظ عاکف سعید
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور

۷۵۔ نفحات (ماہنامہ) / کامران کریمیان
سٹریٹ 8 شاہین ٹاؤن تھکال بالا پشاور

۷۶۔ ہراول / میجر (ر) نذیر احمد ظفر چیمہ
۲۴۔ زمان پارک لاہور

۷۷۔ ہلال (ہفت روزہ) / میجر معین الرحمٰن
انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ہلال روڈ راولپنڈی

۷۸۔ ہومیو پیتھک میگزین (ماہنامہ) / خالد مسعود قریشی
۳۰۔ علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور